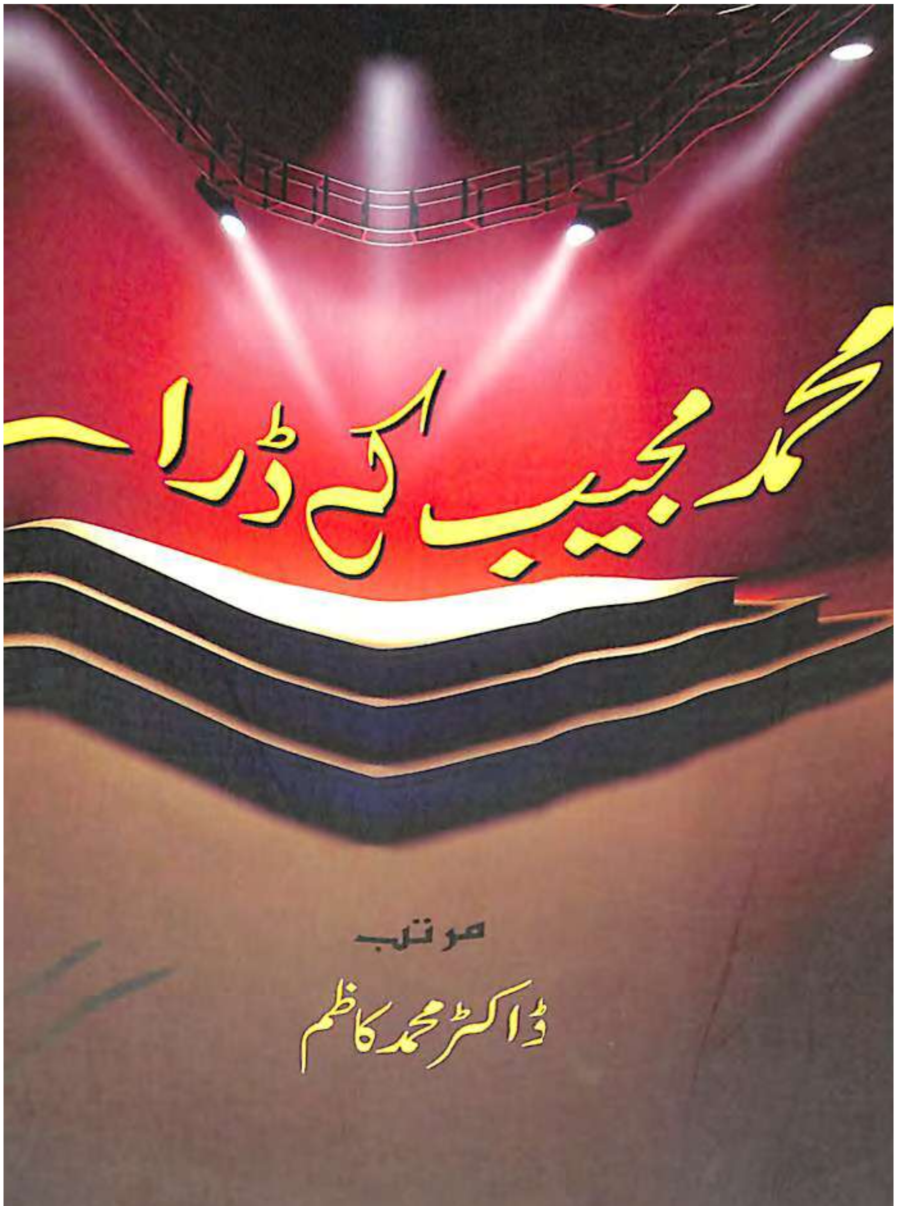
محمد مجیب کے ڈرامے
مرتب
ڈاکٹر محمد کاظم

محمد مجیب کے ڈرامے

مرتب

ڈاکٹر محمد کاظم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی ۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2015
تعداد : 550
قیمت : -/197 روپئے
سلسلۂ مطبوعات : 1857

MOHAMMAD MUJIB KE DRAMAY
Compiled by: Dr. Mohammad Kazim

ISBN :978-93-5160-089-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی۔ 110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

مقدمہ	VII
آؤ ڈراما کریں	1
کھیتی	25
انجام	83
خانہ جنگی	145
حبہ خاتون	203
ہیروئن کی تلاش	259
دوسری شام	301
آزمائش	339

مقدمہ

پروفیسر مجیب اس شخصیت کا نام ہے جس نے ڈاکٹر ذاکر حسین اور سید عابد حسین کے ساتھ مل کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی نہ صرف خدمت کی بلکہ اسے سنوارا۔ جامعہ کی تاریخ میں محمد مجیب جیسے معلم، ادیب، منتظم اور مورخ کم ہی نظر آتے ہیں۔ وہ تاریخ کے استاد کی حیثیت سے جامعہ سے منسلک ہوئے پھر خازن اور آخر میں 25 سال (1973-1948) جامعہ کے وائس چانسلر رہے۔ پروفیسر مجیب نے ان تمام خدمات کے ساتھ ساتھ گراں قدر علمی وادبی خدمات انجام دیے۔ خصوصاً اردو ڈراما نگاری کی روایت کو استحکام عطا کیا۔ انھوں نے اپنے ڈراموں کے ذریعے نہ صرف ڈراما نگاری کے فن کو جلا بخشی بلکہ ڈرامے کی تنقید کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

محمد مجیب کی پہچان ایک ممتاز ادیب ڈراما نگار، مورخ، معلم، دانشور ا نظم کی حیثیت سے ہے۔ وہ استاد تو تاریخ کے تھے لیکن ان کا خاص میدان اردو ادب تھا۔ انھوں نے قومیت، تہذیب، سیاست، فلسفہ، مذہب اور ادب جیسے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے اور افسانے بھی تحریر کیے لیکن اردو ادب میں انھیں ایک اہم ڈراما نگار کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ محمد مجیب نے 30 اکتوبر 1902 کو لکھنؤ میں ایک ممتاز خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد محمد نسیم پیشے سے وکیل تھے۔

ان کا اصل وطن بہلول گڑھی ضلع بارہ بنکی تھا جہاں ان کے خاندان کی زمینداری تھی۔ تعلیم کی ابتدا روایتی طور پر ہوئی۔ اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی ذریعہ تعلیم سے آگے کی تعلیم لکھنؤ کے لوریٹو کانونٹ اسکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد دہرہ دون کے ایک پرائیویٹ اسکول میں داخل کیے گئے جہاں انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی۔ 1922 میں جب انھوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال کی تھی اس لیے آکسفرڈ یونیورسٹی کے قوانین کے مطابق دوسرے کسی امتحان میں شریک ہونے کی اجازت نہیں ملی۔ چنانچہ پریس کا کام جاننے کی غرض سے جرمنی چلے گئے اور وہیں انھوں نے جرمن اور روسی زبانیں سیکھیں۔ برلن میں ان کی ملاقات ڈاکٹر ذاکر حسین اور سید عابد حسین سے ہوئی۔ 1926 میں ذاکر حسین کے ساتھ دہلی اس عہد کے ساتھ لوٹے کہ وہ لوگ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت کے لیے خود کو وقف کردیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں نے یہ عہد بھی کیا کہ تاحیات وہ ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ تنخواہ نہیں لیں گے۔ مگر جامعہ کی مالی حالت کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی تنخواہیں اور کم کردیں۔ مجیب صاحب نے مزید یہ بھی کہا تھا کہ "تعطیلات گرما کی پوری تنخواہ کتابیں خریدنے کے لیے کتب خانے کو دے دی جائے"۔ اس عہد پر وہ اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ جامعہ کے نئے قوانین کے مطابق الگ ہونے پر مجبور نہ ہوگئے۔ 1932 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس خزانے کے خازن مقرر ہوئے جو ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ 1948 میں ذاکر صاحب کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر بنائے گئے اور اس عہدے پر 1973 تک فائز رہے۔ دسمبر 1972 میں جریان خون کے شکار ہوگئے۔ دماغ کے آپریشن کے بعد وہ ٹھیک تو ہوگئے لیکن ان کی یادداشت پر بہت برا اثر پڑا ابتدا میں تو کچھ بھی پڑھنے لکھنے سے قاصر رہے۔ بعد میں بہت کوششوں کے بعد اس پر قابو پایا۔ 20 جنوری 1985 کو نئی دہلی میں انتقال ہوا۔

محمد مجیب طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے بالکل صوفی تھے۔ مادی قدریں ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی شخصیت میں نفاست اور سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تصنع بناوٹ اور ریاکاری کا شائبہ تک نہیں تھا۔ روپے پیسے سے کبھی الفت نہیں رہی۔ ان کی تنخواہ کا ایک

بڑا حصہ طالب علموں اور دوسرے ضرورت مندوں پر خرچ ہوتا تھا۔ان کا اخلاص ، بے ریا زندگی، ایثار وقربانی کا جذبہ،شرافت وتہذیب اور علم ومطالعے کی وسعت یہی وہ صفات اور خصوصیات ہیں جو ان کی شخصیت وسیرت کا لازمی جز تھیں۔محمد مجیب زندگی کے ہر معاملے میں افقی (Horizontal) کے بجائے عمودی (Perpendicular) نقطۂ نظر کے قائل تھے۔انھوں نے جو بھی کام کیا معیاری کیا۔ وہ تمام عمر لکھتے پڑھتے رہے لیکن ان کے شائع شدہ اوراق کی تعداد دوسرے مصنفین کے مقابلے میں کم ہے لیکن معیار کے مقابلے میں زیادہ تر مصنفوں سے بہتر ہے۔ ان کی زیادہ تر تصانیف اپنے موضوع کی اولین کتابیں قرار پائیں۔ 1962 سے انھوں نے افسانے لکھے جو شائع بھی ہوئے۔ 1931 سے 1957 کے درمیان سات ڈرامے، بچوں کو ڈرامے کی تربیت دینے کی غرض سے 'آؤ ڈراما کریں' نام کا ایک کتابچہ اور بہت سے مضامین کے دو مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے علمی کاموں میں تاریخ نگاری کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں فن تعمیر، مصوری اور باغبانی سے بھی خاص شغف تھا۔انگریزی زبان میں لکھی گئی دو کتابیں 'انڈین مسلمس' (Indian Muslims) اور 'ورلڈ ہسٹری اینڈ ہیری ٹیج' (World History And Heritage) بہت مقبول ہوئیں۔

مجیب صاحب نہ صرف مصنف ومورخ تھے بلکہ مصلح اور نظریہ ساز کی حیثیت سے بھی مقبول رہے۔انھوں نے خواتین کو نظر انداز کیے جانے کے خلاف آواز بلند کی اور اس کا عملی ثبوت اپنے ڈراموں میں انھیں اہم کرداروں کے طور پر شامل کر کے دیا۔ان کا خیال تھا کہ "صدیوں سے مردوں نے خصوصاً مسلمان مردوں نے عورتوں کو زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے سے باز رکھا ہے۔اس لیے ان کی مدد کی جانی چاہیے"۔

انھوں نے تراجم کے ساتھ ساتھ اصطلاحات سازی کی جانب بھی خاص توجہ دی، ہمیں یہ معلوم ہے کہ ترقی اردو بورڈ کے قیام میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا تھا اور ایک عرصے تک اس کے سربراہ بھی رہے۔ اصطلاحات سازی کے پینل کے صدر کی حیثیت سے اس کے اصول وضع کرنے میں اہم رول ادا کیا۔1956 میں حکومت ہند کے ماہنامہ ادبی رسالہ 'آجکل' اردو کے 'Editorial

Board میں شامل کیے گئے۔ جب 1955 کے شروع میں دہلی میں مرکزی دینی تعلیمی بورڈ قائم ہوا تو مجیب صاحب اس کے جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ 1965 میں انھیں ان کی خدمات پر پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔ پروفیسر مجیب کی خدمات کا اعتراف کیے بغیر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ ادھوری رہے گی۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت پر بیش بہا تحریریں سپرد قلم کیں جس میں تو ہندوستان کی تاریخ اور اس کی بدلتی ہوئی فکری، سیاسی و اخلاقی صورت حال کو خاص جگہ دی۔ اردو ادب خصوصاً اردو ڈرامے کی تاریخ بھی ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

ڈراما نگاری:

ہندوستان میں فلم کی آمد کے بعد پارسی تھیٹر کی بساط سمٹی ہوئی نظر آئی، ریڈیو اور بولتی فلموں نے تو تھیٹر کی کمر ہی توڑ دی۔ ایسے میں مرزا ہادی رسوا (امراؤ جان ادا کے مصنف) نے ڈراما 'لیلیٰ مجنوں' کے ذریعے اسے سنبھالنے کی کوشش کی جسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ آخر کار دوسرے ڈراما نگاروں کے ساتھ یہ ذمہ داری جامعہ ملیہ اسلامیہ میں موجود سید عابد حسین، محمد مجیب اور ذاکر حسین نے سنبھالی۔ ان لوگوں نے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ انھیں اسٹیج پر پیش بھی کیا۔ سید عابد حسین 1925 میں جرمنی کے قیام کے دوران ہی ڈراما ''پردۂ غفلت'' لکھ چکے تھے جو وہیں سے شائع بھی ہو چکا تھا۔ ذاکر حسین کو ڈرامے سے خاص لگاؤ تھا جس کی نشان دہی بچوں کے لیے لکھے گئے ڈراموں سے بخوبی ہوتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب بچوں کے ڈراموں کو خاص اہمیت دی گئی۔ اس سلسلے میں عبدالغفار مدھولی کا 'قوم پرست طالب علم' (1927) سید عابد حسین کا 'شریر لڑکا' (1931) اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا 'دیانت' (1932) جیسے ڈراموں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری پروفیسر مجیب کو سونپی گئی۔ پروفیسر مجیب ڈرامے کے فن سے بخوبی واقف تھے اور روس کے جدید اور اہم ڈراما نگار استروفسکی اور چیخوف سے بہت متاثر تھے۔ ان ڈراما نگاروں سے متاثر ہونے کے دو خاص اسباب تھے۔ اول تو یہ کہ ان کے ڈرامے نہ صرف معیاری اور ڈرامے کے فن پر پورے اترتے تھے بلکہ ان ڈراموں میں سماجی مسائل کو خاطر خواہ جگہ دی گئی تھی۔ دوم ان ڈراما نگاروں نے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ ڈرامے سے متعلق گراں قدر نظریات بھی پیش کیے جن

سے آج تک ڈرامے سے دلچسپی رکھنے والے فن کار فیض حاصل کر رہے ہیں۔ مجیب صاحب نے اس سے فیض اٹھاتے ہوئے پہلے تو پروفیسر وہاج الدین (حیدر آباد) کے ڈرامے 'نکاح بالجبر' میں جامعہ کی ضرورت اور مزاج کے مطابق تبدیلیاں کیں پھر اپنی ہدایت میں اسٹیج کیا جس میں خود بھی اداکاری کی۔ اس ڈرامے نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سرگرمیوں میں جان ڈال دی اور پھر اس کے بعد مجیب صاحب کی نگرانی میں یہ سفر تیزی سے آگے بڑھا اور انھوں نے اردو اور ہندوستانی ڈراموں کو کئی نئے ڈرامانگار، ہدایت کار اور اداکار دیے۔ اس طرح انھوں نے جدید ڈرامے کی ابتدا و ارتقا میں اہم رول ادا کیا۔

پروفیسر مجیب کی ڈرامانگاری پر تفصیلی نگاہ ڈالنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فن ڈراما سے متعلق ان کی فکر اور شعور پر مختصراً گفتگو کی جائے۔ دوران تعلیم محمد مجیب نے انگریزی اور اردو کے ساتھ ساتھ روسی فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھیں اور ان زبانوں کے دوسرے اصناف ادب کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی پڑھے اور ان زبانوں میں لکھنے والے ڈرامانگاروں کے خیالات سے بھی واقفیت حاصل کی۔ ان میں جن باتوں سے متفق ہوئے انھیں گرہ باندھ لیا اور دوران تحقیق و تخلیق ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ بلکہ اپنی تحریروں میں ان پر اظہار خیال بھی کیا۔ مثلاً فن ڈراما کا ایک اہم جز کشمکش سے متعلق ان کا خیال ہے:

> فنی نقطۂ نظر سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈرامے میں جو کشمکش دکھائی جائے وہ زندگی میں موجود ہو، ڈرامے کی خاطر پیدا نہ کی جائے لیکن یہ کشمکش ہمیں بہت کم اتنی صاف نظر آتی ہے کہ ہم اس کی تصویر اتار سکیں۔ ڈرامانویس اس پر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ادراک اور بصیرت سے دھندلے نقوش پر روشنی ڈالے اور ان کہی باتوں کو کہہ دے۔

(روسی ادب: حصہ اول، دہلی 1940۔ ص 324)

پروفیسر مجیب نے ڈرامے سے متعلق اپنے مضامین کے ذریعے نہ صرف بنیادی سوالات اٹھائے بلکہ ڈراما کیسے کھیلیں اس کی بھی تربیت کی۔ اس سلسلے میں بچوں کے لیے ایک مختصر کتاب 'آؤ ڈراما کریں' لکھی۔ اس کتابچہ میں نہ صرف ڈرامے کے فن اور پیش کش سے متعلق

خیالات نہایت آسان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں بلکہ ناظرین کی ذمہ داری سے متعلق پہلی بار بحث کی گئی ہے۔ ڈرامے پر اظہار خیال کے لیے نہ صرف انھوں نے مضامین قلم بند کیے ہیں بلکہ اپنے ڈراموں کے مکالموں کے ذریعے بھی ڈرامے کے فن، اس کی اہمیت اور اس کے بارے میں عام لوگوں کے ذہنی رویے سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا صرف ایک ڈراما 'ہیروئن کی تلاش' کے چند مکالمے دیکھیں:

> آج جو ڈرامے لکھے جاتے ہیں وہ فلم دیکھ کر لکھے جاتے ہیں یا Short Stories ہوتی ہیں جن میں قصہ بات چیت کے ذریعے بیان ہوتا ہے اور یہ بھی لازمی ہوتا ہے کہ کوئی کسی پر عاشق ضرور ہو جائے۔

> فلم والوں کو اچھا ڈراما دینا اس کی مٹی پلید کرنا ہے۔ فلم ایکٹنگ ایک بیماری ہے کہ جس کو لگ جائے وہ پھر ٹھیک ایکٹنگ کے لائق نہیں رہتا۔

> میں مجسٹریٹ ہوں اور یہ بالکل مناسب نہ ہوگا کہ تم ایک ڈرامے میں حصہ لو۔ ڈراما دیکھنے کے لیے ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ سرکاری ملازموں کو اپنی عزت کا بہت خیال رکھنا ہوتا ہے۔

> صاحب فلم تو میں دیکھتا رہتا ہوں، ان میں سے کچھ پسند بھی آتے ہیں۔ لیکن ڈراما کیوں دکھایا جاتا ہے۔ جب اس میں ناچ ہوتا ہے نہ گانا، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کالج میں تھا تو یار دوست کبھی کبھی پکڑ لے جاتے تھے کہتے تھے کہ ڈراما اچھا نہ ہوا تو دو چار لڑکیوں کو دیکھ لیں گے۔

> لڑکی چار پانچ برس کی ہوتی ہے تو ماں باپ چاہتے ہیں کہ ناچنا گانا سیکھے اور اس میں کامیاب ہوتی ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ لڑکی کی شادی ہوگئی تو یہ سب چیزیں بند کر دی جاتی ہیں اور ردی فلم دیکھنے کے سوا اسے اور کسی تسکین کا موقع نہیں ملتا۔

ان مکالموں سے پروفیسر مجیب کے خیالات کا بخوبی علم ہوتا ہے اور ایسی فکر رکھنے والا ڈراما نگار جب ڈراما تخلیق کرے گا تو ان میں یہ عیوب نہیں ملیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر محمد مجیب کے کم وبیش تمام ڈراموں میں یہ خوبیاں نظر آتی ہیں۔ پروفیسر مجیب تاریخ کے استاد تھے لیکن سیاسی مسائل پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ سماج کی اصلاح بھی کرنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے ان کے تمام ڈرامے سماجی وسیاسی مسائل پر مبنی ہیں۔ انھوں نے 27 سال کے عرصے میں (1931 سے 1957 کے درمیان) کل سات ڈرامے تحریر کیے:

(1)	کھیتی	1931
(2)	انجام	1931
(3)	خانہ جنگی	1946
(4)	حبہ خاتون	اپریل 1952
(5)	ہیروئن کی تلاش	اکتوبر 1953
(6)	دوسری شام	اکتوبر 1956
(7)	آزمائش	جولائی 1957

ان میں سے 'کھیتی' اور 'دوسری شام' کو سماجی اور اصلاحی زمرے میں 'حبہ خاتون'، 'خانہ جنگی' اور 'آزمائش' کو تاریخی زمرے میں اور 'ہیروئن کی تلاش' کو ڈرامے کی پیش کش کے مسائل کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ مجیب کے ان ڈراموں کے علاوہ ڈرامے کے فن پر ایک چھوٹی سی کتاب 'آؤ ڈراما کریں' کے عنوان سے موجود ہے۔ اس کتاب میں ڈراما کھیلنے سے متعلق نظریات اور کھیلنے کے دوران پیش آنے والے مسائل کو پیش کیا گیا ہے جو اس زمانے کے لحاظ سے ڈراما کھیلنے والوں کے لیے معاون ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرلی جائے۔

آؤڈراما کریں:

پروفیسر محمد مجیب ڈرامے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔اس کا اندازہ دسمبر 1982 میں شائع شدہ ان کی مختصر لیکن اہم کتاب 'آؤڈراما کریں' سے بخوبی ہوتا ہے۔ دیکھنے میں یہ کتاب بچوں کے لیے لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی اہمیت سے بڑے بھی انکار نہیں کر سکتے۔کھیل کھیل میں پروفیسر مجیب نے ڈرامے کے فن اور اس کی باریکیوں کو اس انداز میں پیش کر دیا ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد ڈراما کھیلنا نہایت آسان معلوم ہونے لگتا ہے۔انھوں نے 'ڈراما کیا ہے؟، ڈرامے کا قصہ، ڈرامے کا خاکہ اور ڈرامے کی تیاری' کے عنوان سے مختصر مگر اہم نکات بیان کیے ہیں۔

اس کتابچے کے مطالعہ سے ڈراما اور قصہ کا فرق آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ایک جملے میں پروفیسر مجیب نے اسے بیان کر دیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ قصہ بیان کیا جاتا ہے اور ڈراما کھیلا جاتا ہے۔اور بچوں کی مدد سے اسے عمل کے ذریعے بتانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ڈرامے کے لیے Imagination, Observation and Execution کو بنیاد مانا جاتا ہے۔ پروفیسر مجیب نے اس کتاب میں یہ دکھایا ہے کہ بچوں کے اندر یہ تینوں چیزیں موجود ہوتی ہیں اور اس کا عملی نمونہ بھی ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے کہ کس طرح بچے کردار کے بارے میں سوچتے ہیں، اس کا خاکہ تیار کرتے ہیں اور پھر اسے کیسے پیش کرتے ہیں۔اس کا ایک نمونہ دیکھیں:

> تماشائی سب بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں اسٹیج کی بائیں طرف سے اسکول کے دولڑکے باتیں کرتے ہوئے آئے اور ان کے داخل ہوتے ہی ایک ہانک سنائی دی: ''کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ! کرارے ہیں بسکٹ۔''
>
> ایک لڑکے نے دوسرے کی طرف آنکھ ماری اور کہا: ''ارے یہی ہے وہ بسکٹ والا۔''
>
> یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کو وہیں روک دیا اور خود ذرا آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔اتنے میں بسکٹ والا داخل ہوا اور اس نے ایک اور ہانک لگائی۔پہلے نے جو اسٹیج کے بیچ میں کھڑا تھا کہا: ''ارے بسکٹ والے ذرا دکھاؤ تو کیسے بسکٹ ہیں۔''

بسکٹ والے نے سر پر سے ٹوکری اتارتے ہوئے کہا: ''لو، ایسے بسکٹ ہیں کہ شہر میں کہیں نہ ملیں گے۔ خالص گھی کے ہیں۔ ایسے خستہ کہ کھاتے ہی منہ میں گھل جائیں۔ یہ دس دس پیسے کے ہیں، یہ دس پیسے کے دو۔ یہ بڑے بیس بیس پیسے کے۔''

بسکٹ والا لنگڑا کر چلتا تھا۔ کمر ٹیڑھی تھی، ٹوپی ٹیڑھی، اب بسکٹ کے دام بتاتے ہوئے اس نے تماشائیوں کی طرف منہ پھیرا تو معلوم ہوا کہ وہ کانا بھی ہے اور بات کہنے کے بعد ایک طرف کو زبان بھی نکال دیتا ہے۔ تماشائیوں کو یہ سب دیکھ کر خوب مزہ آیا اور سب کے جی میں یہ بات آئی کہ اگر لڑکے اس کے ساتھ شرارت کریں تو بڑا اچھا ہو۔

پہلے لڑکے نے جس نے دام پوچھے تھے، اب کہا: ''اچھا یہ دس پیسے والے چار دے دو۔''

اس نے اپنی جیب میں ایک ہاتھ ڈالا۔ جیسے کوئی پیسے نکالنے کے لیے ڈالتا ہے۔ بسکٹ والے نے اس کے دوسرے ہاتھ میں بسکٹ دے دیے اور پیسے لینے کے لیے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ لڑکے نے اس کے ہاتھ میں انگوٹھا چھلایا اور اسٹیج کے دوسرے دروازے سے بھاگ کر نکل گیا۔ بسکٹ والا اٹھا اور لنگڑاتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا، جب وہ دروازے سے نکل گیا تو دوسرے لڑکے نے جو چپ چاپ کھڑا تھا، لپک کر ٹوکری سے بہت سے بسکٹ نکالے۔ کچھ جیبوں میں بھرے کچھ گود میں اور پہلے دروازے سے نکل کر غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد بسکٹ والا ہانپتا کانپتا پھر داخل ہوا۔ اس کی صورت شکل اور چال پر ویسے بھی ہنسی آتی تھی۔ ٹوکری خالی دیکھ کر اس نے جو کھسیانی صورت بنائی، وہ تو بس غضب کی تھی۔ سارے تماشائی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ وہ تھوڑی آنکھیں بلکہ اپنی ایک آنکھ مچکاتا رہا پھر ٹوکری اٹھائی اور دوسرے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پھر ایک ہانک لگائی: ''کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ! کرارے ہیں بسکٹ۔''

یہ ہانک بھی بڑی سبق آموز تھی کیونکہ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ بسکٹ والے کی عقل حیران اور ٹوکری خالی ہے۔

ماجد صاحب، محمود، خالد اور راشد کو لے کر اسٹیج پر آئے۔ لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔

اس حصے کو دیکھنے سے ڈراما، ڈرامے کے کردار، اداکاری، اسٹیج کا تصور اور آواز کے زیر و بم کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ تماشائی ڈرامے کے کھیلے جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اداکار اسٹیج کے بائیں جانب سے داخل ہوتا ہے۔ لڑکا انگوٹھا دکھا کر اسٹیج کے دائیں جانب کے دروازے سے بھاگتا ہے۔ دوسرا لڑکا بسکٹ لے کر بائیں جانب بھاگتا ہے۔ بسکٹ والا ہانپتا ہوا پھر دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ وہ ہانک لگاتا ہوا داخل ہوتا ہے ہانک لگاتا ہوا باہر جاتا ہے۔ دونوں ہانک میں فرق دکھایا گیا ہے۔ پہلے وہ تیز آواز میں ہانک لگاتا ہے بعد میں وہ حیران اور مایوس ہے۔ ماجد صاحب خالد اور راشد کو لے کر اسٹیج پر آئے اور خوب تالیاں بجیں۔ ڈرامے کی زبان میں دائیں اور بائیں دروازے کو 'ونگس' کا نام دیا گیا ہے تو بعد میں اسٹیج پر اداکار کے تعارف کو Curtain call کہا جاتا ہے۔ یہاں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اداکار کردار کی مناسبت سے مختلف حرکات و سکنات سے کام لیتے ہیں۔ لڑکا بسکٹ والے کی ہانک سن کر دوسرے لڑکے کو آنکھ مارتا ہے تو بسکٹ والا اپنی کمر ٹیڑھی کر کے لنگڑا کر چلتا ہے اور بات ختم کرنے کے بعد اپنی زبان باہر نکال لیتا ہے۔ اسے ڈرامے کی زبان میں Characterisation کہا جاتا ہے۔ کردار میں جو کچھ دکھتا ہے وہ کیفیت ہوتی ہے اور اس کیفیت کو موقع کی مناسبت سے ایسے ظاہر کرنا کہ وہ حقیقت لگنے لگے کامیاب اداکاری ہے۔ پروفیسر مجیب کہتے ہیں:

> میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ آدمیوں کی شکل وصورت، بول چال وغیرہ کی نقل ہم اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی کیفیت دکھا سکیں۔ یہ کیفیت کسی خاص وجہ سے کسی خاص موقع پر پیدا ہوتی ہے۔ کوئی لڑکا شرارت کرتا ہے اور مار کھاتا ہے تو وہ روتا ہے، یہ رونا ایک 'کیفیت' ہے۔

'ڈراما کا قصہ کیسا ہو؟' کے بارے میں مجیب صاحب بیان کرتے ہیں کہ قصہ یعنی ڈراما کا پلاٹ تیار کرتے وقت یہ خیال رہے کہ اس میں واقعہ کے پیش آنے کی وجہ ضرور ہو۔ اس سلسلے میں ان کے ہی الفاظ دیکھیں:

> قصے میں تو اور خوبیاں بھی ہونی چاہییں جن سے آدمی اثر لے سکتا ہو۔ ایسے قصے کو اچھا ڈراما بنانے کے لیے جنگل کے منظر کو بھیانک بنانے کی خاص کوشش کرنی چاہیے۔ مسافروں کے خوف کو اس طرح دکھانا چاہیے کہ وہ بناوٹی نہ معلوم ہو اور اس واقعے کا کہ ڈاکوؤں نے مسافروں کو لوٹ لیا، کوئی مطلب کوئی مقصد ہونا چاہیے، جس سے معلوم ہو کہ یہ واقعہ کیوں بیان کیا گیا۔

پلاٹ کے تیار کرنے کے بعد ڈراما تیار کرنے کے لیے اس کا خاکہ تیار کیا جاتا ہے اور اس خاکہ کے تیار کرنے والے کو ہم ہدایت کار کہتے ہیں۔ ہدایت کار ہی یہ طے کرتا ہے کہ ہم ڈرامے کو کیسے پیش کریں کہ اس کا پیغام پر اثر طریقے سے ناظرین تک پہنچ جائے۔ اس کا منظر اور پس منظر کیا ہو کہ اس کی پیش کش کے دوران دشواری نہ ہو اور ایک منظر سے دوسرے منظر کے درمیان وقفہ نہ ہو۔ اس تیاری کی جانب بھی پروفیسر مجیب نے کامیاب نشان دہی کی ہے۔ پردے کا استعمال، منظر کی تبدیلی اور دوسرے مراحل کی جانب اشارہ کیا ہے۔

ڈرامے کو پیش کرنے کے لیے اس کی تیاری ایک اہم اور مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ مختلف کردار کے لیے مختلف اداکار کا انتخاب، اس کی مشق، کردار کی مناسبت سے اس کا لباس اور اس کا میک اپ ضروری ہوتا ہے۔ لباس اور میک اپ ڈرامے کا اہم جز ہے جس سے اداکار کو کردار ادا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پروفیسر مجیب نے اس جانب بھی کامیاب اشارے کیے ہیں۔ یہاں تک کہ داڑھی اور مونچھ لگانے کے طریقے اور اس کے لیے استعمال ہونے والی چیزوں کے بارے میں بھی بیان کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجیب صاحب کو اس کا نہ صرف علم تھا بلکہ اس کا عملی تجربہ تھا۔ آج بہت سے ایسے ڈراما نگار ہیں جو کاغذ تو سیاہ کر سکتے ہیں لیکن انھیں ان عملی ضرورتوں اور پہلو کا نہ تو علم ہے اور نہ ہی اسے جاننے کی جستجو۔

اس کتابچے کے مطالعے سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پروفیسر مجیب اس دور میں جب ڈرامے کا فن جدید تکنیک سے نابلد تھا۔ اس وقت انھوں نے اسے اپنایا اور اس کی آبیاری اور بچوں کی تربیت کے لیے یہ کتاب لکھی۔ انھیں معلوم تھا کہ کسی بھی فن پارے کو اگر ترقی دینا ہو اور اس کا مستقبل روشن دیکھنا ہو تو بچوں میں اس کا شوق پیدا کر دو۔ دوسری اہم بات یہ کہ پروفیسر مجیب نے اس زمانے میں بچوں کے لیے یہ کتاب اور ڈرامے لکھے جب بچوں کے ڈرامے تو کیا خود ڈرامے پر زوال کا سایہ لہرانے لگا تھا۔ حالانکہ ابراہیم یوسف (؟) میں اپٹا اور پرتھوی تھیٹر نے نہ صرف اسے سنبھالا دیا بلکہ اسے بام عروج پر پہنچایا۔ اس طرح بچوں کے لیے ڈرامے اور ان کی تربیت کے ضمن میں پروفیسر مجیب کی یہ کوشش سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ پروفیسر محمد مجیب نے کل آٹھ ڈرامے تحریر کیے۔ ان تمام ڈراموں کی نہ صرف ادبی اہمیت ہے بلکہ اردو کے کامیاب اور اسٹیج شدہ ڈراموں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ ان ڈراموں پر تفصیلی گفتگو نامناسب نہ ہوگا۔

کھیتی:

1931 میں لکھا گیا ڈراما 'کھیتی' گیارہ اہم کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا۔ یہ ڈراما چار ایکٹ اور گیارہ سین پر مشتمل ہے۔ اکتوبر 1956 میں پروفیسر مجیب کا شائع ہونے والا ڈراما 'دوسری شام' کے پشت پر شائع شدہ اشتہار یوں ہے:

> اس ڈرامے میں نام نہاد قومی رہنماؤں کے ہتھکنڈوں کا پردہ نہایت ہی دلچسپ انداز میں چاک کیا گیا ہے۔ آج کے مخصوص حالات میں اس کتاب کا مطالعہ ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔

پروفیسر محمد مجیب کی نظر ہندوستانی سماج اور اس کے بدلتے سیاسی حالات پر گہری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ڈرامے میں اس دور کے ہی نہیں بلکہ موجودہ زمانے کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور مفاد پرست لوگوں کی شناخت کرنے میں ہمیں مدد مل سکتی ہے۔ ڈرامے کا خلاصہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے:

حسام الدین ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ وہ قوم کی اصلاح کا جذبہ رکھتا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ شہر میں اپنے پیر جمانے کی کوشش کرتا ہے پھر گاؤں لوٹ آتا ہے۔ گاؤں میں کھیتی کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا اسکول بھی کھول لیتا ہے۔ شہر میں ایک مل کا مالک بھگوان داس مل کے سامنے والی زمین پر عمارت تعمیر کرانا چاہتا ہے جس پر مل کے مسلمان ملازم کبھی کبھی نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ عبدالغفور نامی ایک خود ساختہ قومی رہنما فوراً بھگوان داس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور یہ کہہ کر کہ مسلمانوں کی عبادت گاہ پر قبضہ کیا جا رہا ہے، مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ حشمت اللہ نامی میونسپل بورڈ کا ملازم عبدالغفور کو بورڈ میں ہونے والی کارروائیوں کی اطلاع دیتا رہتا ہے، اور اس کے موقف کے لیے لوگوں سے تائید بھی حاصل کرتا ہے۔ اسی کے ذریعے عبدالغفور حسام الدین کو گاؤں سے شہر بلا کر اس کی تائید و مدد چاہتا ہے لیکن حسام الدین انکار کر دیتا ہے۔ بھگوان داس کی طرف سے زمین پر پولیس کا پہرہ بٹھا دیا جاتا ہے اور عبدالغفور جہاد کے فرضی فتوے کو اخبارات اور دستی پمفلٹ کے ذریعے مشتہر کرا دیتا ہے۔ جہاد کا اعلان سن کر دیہاتوں کے کچھ مسلمان شہادت حاصل کرنے کے خیال سے جہاد کے لیے تیار ہو کر عبدالغفور کے مکان پر آتے ہیں۔ عبدالغفور گھبرا جاتا ہے اور ان لوگوں کو سمجھا بجھا کر واپس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وہ سیدھے سادے لوگ بہت ناراض ہوتے ہیں کہ اس نے ان کے جذبات کے ساتھ کھیل کیا ہے۔ اس موقع پر حسام الدین مولا بخش لوہار اور اس کے جہادی ساتھیوں کو لعنت ملامت کرتے ہوئے سمجھاتا ہے کہ صحیح ڈھنگ سے محنت و مشقت و ایمان داری کے ساتھ زندگی گزارنا اور اچھے ڈھنگ سے اپنے خاندان کی پرورش کرنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے۔ حسام الدین کے بہت سمجھانے بجھانے کے بعد بات جہادیوں کی سمجھ میں آ جاتی ہے اور وہ واپس جا کر اپنی کاہلی کو چھوڑ کر محنت و مشقت کی زندگی شروع کرتے ہیں۔ حسام الدین عبدالغفور کو بھی بتاتا ہے کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تو اس کے خلاف عدالتی کارروائی ہوگی تب اسے اپنی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یوں تو ڈرامے کا پلاٹ ہندوستانی مسلمانوں کے نچلے اور متوسط طبقے کی ذہنی کیفیت اور خیالات پر مشتمل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ تعصب، قدامت پرستی اور جہالت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس ڈراما کے ذریعے محمد مجیب یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ قوم کے نوجوانوں کو انگریزوں کی غلامی کرنے

کے بجائے زراعت کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور دیہی گھریلوں صنعتوں میں دلچسپی لینی چاہیے۔ فرقہ پرستی کو بڑھاوا دینے والوں کی حوصلہ افزائی کے بجائے اس کا منہ توڑ جواب دینا چاہیے۔

حالانکہ یہ ڈراما آج سے تقریباً 75 برس قبل لکھا گیا ہے لیکن اس میں پیش کیے گئے مسائل آج کے لگتے ہیں، خواہ وہ دیہات پر شہر کو ترجیح دینا ہو یا فرقہ پرستی کا مسئلہ ہو، سیاسی رہنماؤں کی بازی گری ہو یا سرمایہ داروں کا ذاتی مفاد، تعلیمی نظام کا فقدان ہو یا سرمایہ داروں کے ذریعے مزدوروں یا کاریگروں کا استحصال۔ مولا بخش، لوہار کرم علی سے کام کروانے کے بعد اس کی مزدوری دینے سے کس طرح انکار کرتا ہے اور کام کے ٹھیک سے نہ ہونے کا بہانہ بناتا ہے، آپ بھی دیکھیں:

کرم علی: ہاں بھائی تو کیا کیا بنا کر لائے تھے؟

مولا بخش: جناب ایک تو وہ بکس جو پچک گیا تھا ٹھیک کیا ہے، چھے چھریاں تیز کی ہیں۔ دو قینچیوں پر دھار لگائی ہے، اور ایک وہ موٹی سلاخ سیدھی کی ہے۔ اس کام کی اجرت اور چیزیں لے جانے کی مزدوری سب پانچ روپے ہوتی ہے۔ میں چیزیں سب کل شام کو دے گیا تھا، اور مجھ سے کہا گیا تھا دس بجے سویرے آنا تو دام مل جائیں گے۔ اگر آپ جلدی سے دے دیں تو بڑی عنایت ہوگی، مجھے بہت سخت ضرورت ہے۔

کرم علی: یہ میں کب کہتا ہوں کہ تمھیں روپے کی ضرورت نہیں مگر تمھیں جو کچھ بنانے کو دیا گیا تھا وہ تم اور خراب کرلائے ہو۔ منشی جی ذرا وہ بکس اور چھریاں اور قینچی جو یہ کل دے گئے تھے اٹھا تو لاؤ۔ (منشی اٹھ کر اندر سے بکس لے آتا ہے جس میں اور چیزیں رکھی ہیں۔ کرم علی بکس کھول کر سب چیزیں مولا بخش کے سامنے رکھ دیتا ہے) یہ چھریاں تیز کرنے کو دی گئی تھیں۔ تم نے سان پر دھر کر ایسا رگڑا ہے کہ سب کا پھل آدھے سے زیادہ گھس گیا ہے اور اس پر دھار کا حال یہ ہے کہ برسوں رگڑو تب بھی کچھ کاٹے نہ کٹے۔ پھر قینچی کو ذرا دیکھو، یہ بھلا کپڑا کاٹنے کے کام کی رہ گئی ہے؟ اور بکس تو ماشاء اللہ،

ہتھوڑے کا نشان دور سے معلوم ہوتا ہے، اور لطف پر لطف یہ کہ جوں کا توں
پچکار ہا۔ سلاخ اندر رکھی ہے، پہلے ایک طرف کو مڑی تھی، اب دوسری طرف
جھک گئی ہے سارا سامان اکارت گیا۔ اوپر سے پانچ روپے ڈنڈ دیجیے۔

مولا بخش: اچھا صاحب کچھ نہ دیجیے۔ معلوم ہوتا کہ آپ ایسے معاملے کے خراب ہیں تو
بے کار کی محنت بچتی۔

کرم علی: ایسی محنت کی جس سے چیز اور خراب ہو جائے، جو اجرت ہے وہ لے لو۔

مولا بخش: تو آخر آپ کیا دینا چاہتے ہیں؟

کرم علی: میں تو ایک کوڑی بھی نہیں دینا چاہتا۔ تم سے چیزوں کی قیمت نہیں مانگتا۔ یہی
تم پر احسان ہے۔

اس طرح کے مکالے اور مفاد پرست کردار اس ڈرامے میں بخوبی نظر آتے ہیں۔ ڈراما 'کھیتی' میں کردار نگاری کا بہترین نمونہ نہ ملنے کے باوجود چند متحرک کردار ضرور مل جاتے ہیں جن میں حشمت اللہ، دلاور حسین، مولا بخش لوہار کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس ڈرامے میں کردار نگاری کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں سماج کے مختلف طبقوں کے نمائندے نظر آتے ہیں خواہ وہ عالم دین ہوں یا قومی رہنما، تاجر ہوں یا زمیندار، ملازم ہوں یا طالب علم، لوہار ہوں یا خادم، سب کو ڈرامے میں جگہ دی گئی ہے جس سے ایک مکمل سماج دکھائی دیتا ہے۔ ایسے کردار بھی دکھائی دیتے ہیں جو اپنے مفاد کے لیے سماج اور قوم کا خیال کیے بغیر انسان کو مذہب کے نام پر بھڑکاتے ہیں اور اپنی اشتعال انگیز باتوں سے اسے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے مفاد اور سیاست کے لیے سچے رہبر اور قوم وملت کا درد رکھنے والوں پر طنز کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر عبدالغفور کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کا ایک مکالمہ دیکھیں کہ وہ حسام الدین سے کن الفاظ میں مخاطب ہے:

عبدالغفور: بھائی بس چھوڑو، چھوڑو۔ ایک بات ہو تو کوئی سمجھائے بھی۔ یہاں تو سرے
سے مقدمہ پیش کرنا ہے اور پھر جج صاحب بھی کچھ مخالف۔ میں تو اس امید
میں تھا کہ تم سے کچھ تقویت حاصل کروں گا۔ تم الٹے میری کمر توڑنے کی فکر

میں ہو۔ بس جاؤ اپنے گاؤں میں چین سے رہو۔ مگر خبردار، میرے سامنے
کبھی اپنے آپ کو مسلمان مت کہنا یا اگر یہ منظور نہیں تو پھر ذرا دل میں گرمی
پیدا کرو، حیادار بنو، آبرو سے رہنے کا ڈھنگ سیکھو، اس طرح ادھر سے اُدھر
ہنکا دیا جانا مسلمانوں کی شان کے خلاف ہے۔ کسی غیر مذہب والے کے حکم
سے مسجد کا مقام بدل دینے سے اسلام کی صریحی تو ہین ہوتی ہے۔
اور ہمارے حق میں بہر صورت یہی بہتر ہے کہ ہمارے دشمن ہم سے خائف
رہیں نہ یہ کہ ہمارے عجز وانکسار سے ڈھیٹ ہو جائیں.........

اس ڈرامے میں ایسے کردار بھی موجود ہیں جو قوم وملت کا درد سمجھتے ہیں اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے خود کو وقف کر دیتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر نہ صرف ان کو سمجھاتے ہیں بلکہ سماج اور قوم کے مخالف عناصر کا مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ مفاد پرست لوگوں کے جھانسے میں آنے والے عوام کی تربیت کے ساتھ ساتھ اسے راہ راست پر لانے کی ترکیب بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسام الدین کے کردار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب جہاد کرنے والے مولا بخش کے ساتھ ان سے ملنے آتے ہیں تو ان الفاظ میں حسام الدین ان کی تلقین کرتا ہے:

حسام الدین: سناؤں.....تم کاہل ہو، اور چاہتے ہو سب تمہاری عزت کریں۔ تم سے کام وام کچھ ہوتا نہیں۔ اِتنی محنت کرنا نہیں چاہتے کہ روٹی کما سکو، اور اب موقع ملا تو کھڑے ہو گئے جہاد کرنے۔ بھلا تم جیسوں کی قسمت میں جہاد ہو سکتا ہے؟ تم نے دنیا میں چھوڑا کیا ہے کہ عاقبت میں اس کا بدلہ ملے؟

مولا بخش: (کچھ حیران ہو کر) صاحب ہم کیسے بھی ہوں، آپ ہم کو برا بھلا کہنے والے کون ہوتے ہیں؟

حسام الدین: ہوتے کیوں نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے اتنے آدمیوں کو لا کر کھڑے ہوتے ہو اور کہتے ہو، اسلام کے لیے جان دینے آئے ہیں۔ ہم کو دھوکے باز اور جھوٹا بناتے ہو، اور چاہتے ہو، ہم منہ سے کچھ کہیں بھی نہیں تم سے۔ آخر کس نے جہاد کرنے کو کہا تھا؟

مستری: ہم کیا جانیں صاحب، ہم نے تو بس اعلان پڑھا تھا۔

حسام الدین: اور ایک اعلان پڑھ کر تم نے طے کرلیا کہ بس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ بھائی ہم اتنے بھی بے وقوف نہیں ہیں کہ ایسے چکموں میں آجائیں۔ تم اگر کسی کام میں مصروف ہوتے، گھر بار کا ذمہ ہوتا، بیوی بچوں کی پرورش کا خیال ہوتا تو ہرگز اتنی جلدی جہاد کے لیے تیار نہ ہوتے، جہاد کو بھی تم نے کوئی ہنسی ٹھٹھا سمجھ لیا ہے؟ اپنا چوتی کا کام سلیقے سے ہوتا نہیں، خدا کا کام کرنے کو جھٹ تیار ہو گئے۔ تم کو بھی تو آخر خدا نے سمجھ دی ہے، حیا دی ہے۔ دنیا میں کسی مصرف کے نہیں تو خدا کے کس کام آسکتے ہو، اور ہمارے پاس آئے ہو تو ہم تم سے کرائیں کیا۔ تم نے اب تک کیا کر دکھایا ہے جو تمہارے اوپر کوئی بھروسا کرے؟ (مولا بخش خاموشی سے زمین کی طرف تکتا رہتا ہے اور کچھ نہیں کہتا) کیوں میاں...... خدائی فوج دار، اب بولتے کیوں نہیں؟ کہو تو کرم علی صاحب کو بلاؤں اور سارا قصہ پھر سے سنوادوں۔ تمہارے جیسے بہیتروں سے نپٹ چکا ہوں۔

پہلا مزدور: صاحب ہم تو غریب آدمی ہیں......

حسام الدین: بس رہنے دو جی، ہم بھی جانتے ہیں کیسے غریب ہو (کچھ دیر خاموشی کے بعد) بس جاؤ اپنے گھر بیٹھو۔ جب دنیا میں کچھ آبرو حاصل کرلو، تب جہاد کی فکر کرنا۔ پھر ہم بھی جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے۔ (مجمع کی طرف مخاطب ہو کر) سن لیا آپ لوگوں نے، یہ کیسے لوگ ہیں جو جہاد کرنے چلے ہیں...... واقعی بڑی شرم کی بات ہے کہ آپ میں ایک بھی ایسا نہ نکلا جو ان لوگوں کو سمجھاتا، جو انھیں یاد دلاتا کہ ہمارے رسول نے بھی جہاد کیا تھا اور ہمیں بتا گئے ہیں کہ جہاد کب کرتے ہیں اور کیسے کرتے ہیں۔ آپ یہاں پر دکھانے کے لیے آئے ہیں کہ سب مسلمان ہیں اور مذہب کے لیے لڑنے پر تیار ہیں۔ بھلا آپ میں سے کسی کو یہ بھی یاد ہے کہ جہاد کرنے سے پہلے

ہمارے رسول نے اپنے جانی دشمنوں کو دوست بنانے کی کتنی کوششیں کیں۔
لڑائی سے بچنے کے لیے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں، کیا کیا قربانیاں دیں
اور اس پر بھی جب لڑے تو ان کو کتنا رنج ہوا؟...... آپ لوگ بھی لڑنے کو
آئے ہیں، بھلا بتایئے آپ نے ان مصیبتوں کا آدھا، چوتھائی حصہ بھی جھیلا
ہے جو رسول اللہ اور ان کے ساتھیوں پر گزریں، آپ میں سے کس نے
نقصان اٹھایا ہے، کس نے قربانیاں دی ہیں...... آپ سمجھتے ہیں کہ آپ
غریب ہیں، آپ کو دنیا میں کچھ نہیں ملا تو عاقبت کے لیے شہادت پا کر نجات
کا سامان کر لیں، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی اتنا غریب
نہیں جتنے ہمارے رسول تھے۔ کسی نے اتنے فاقے نہیں کیے ہیں جتنے
ہمارے رسول نے کیے، کسی نے سوکھی روٹی کے ٹکڑے کے لیے اتنی محنت
نہیں کی ہے جتنی ہمارے رسول نے کی۔ دنیا کی کون سی نعمت ہے جو انھیں
نہیں مل سکتی تھی، لیکن انھوں نے ہر نعمت سے اپنے آپ کو محروم رکھا،
اور کیوں؟ صرف اس لیے کہ خدا کے غریب بندوں کے لیے مثال بن
سکیں۔ جایئے اپنی غریبی کی شان نہ کھویئے، اپنے رسول کی لاج رکھ لیجیے!

ان مکالموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر مجیب اپنے دور سے کتنے آگے تھے۔ ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا یہ آج کی بات کی جا رہی ہے کیونکہ آج بھی یہ مسائل موجود ہیں اور ایسے کرداروں سے ہمارا سامنا روز ہوتا ہے یا اخباروں اور ٹیلی ویژن پر ان کے بارے میں اکثر پڑھتے، سنتے اور دیکھتے ہیں۔ اس ڈراما میں کچھ کردار ایسے ہیں جن میں کوئی ارتقا نظر نہیں آتا۔ وہ ڈراما کے شروع میں جیسے ہیں ویسے ہی آخر تک رہتے ہیں یا جو اچھا ہے اس میں اچھائی ہی نظر آتی ہے اور جو برا ہے وہ برا ہی رہتا ہے۔ ایسے کرداروں میں حسام الدین اور عبدالغفور کو رکھا جا سکتا ہے۔ پورے ڈرامے میں طویل مکالمے بھرے پڑے ہیں جس سے بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے۔

انجام:

قدامت پرستی، دنیاداری، ریاکاری اور بے ایمانی اگر کسی سماج میں بہت زیادہ پھیل جاتی ہے اور مذہب کے نام پر ذاتی مفاد اور قوم وملت کی آڑ میں تعصب وفرقہ پرستی کو فروغ دیا جانے لگتا ہے تو وہ سماج ملک وقوم کی تباہی کا سبب ہوتا ہے۔ اسی نظریہ وخیال کو ڈراما 'انجام' میں پیش کیا گیا ہے۔ تین ایکٹ اور سات مناظر کے اس نفسیاتی ڈراما میں آٹھ اہم کرداروں کے ساتھ ساتھ مجاور، فقیر، برقع پوش عورتیں اور سیاہ فام آدمی ہیں۔ 1934 میں لکھے گئے اس ڈراما کے پلاٹ کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

شیخ نجم الدین (ایک سابق حاکم عدالت) نے اپنے ملازمت کے دوران بہت سے لوگوں کا حق مارا اور ناجائز طریقے سے بہت سی دولت جمع کی ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد یہ سیاہ کارنامے اس کے ضمیر پر بوجھ بن جاتے ہیں اور وہ ایک نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اکثر رات میں بھیانک خواب دیکھتا ہے کہ ایک قوی ہیکل سیاہ فام، ہاتھوں میں رسی لیے اس کا گلا گھونٹنے آ رہا ہے۔ لیکن وہ بجائے اس کے کہ اپنی غلطیوں اور بے ایمانیوں سے صدق دل سے توبہ کرے، اپنی نجات اور سکون قلب کے لیے مولانا عبداللہ کی دعا اور تعویذ کا سہارا لیتا ہے۔ شروع میں نفسیاتی طور پر وہ افاقہ بھی محسوس کرتا ہے لیکن مولانا اس سے خاصی رقم وصول کرنے کے بعد اپنا رشتہ اس کی کم عمر بیٹی سے شادی کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ تب حقیقت سامنے آتی ہے اور شیخ نجم الدین اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے مولانا سے پیچھا چھڑاتا ہے۔ مولانا سے پیچھا چھڑانے کے بعد ہی ایک مصاحب قسم کا آدمی مختار علی مل جاتا ہے جو شیخ نجم الدین کو ایک درگاہ کے مجاور شاہ نور محمد کے پاس لے جاتا ہے۔ شاہ نور محمد بھی دعا تعویذ کے بہانے شیخ صاحب سے کافی روپیہ وصول کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر شکر اللہ شیخ نجم الدین کا بے روزگار بھانجا جو اس وقت ان کے ساتھ رہتا ہے۔ پہلے ملا اور بعد میں شاہ نور محمد کی اصلیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ان لوگوں کا سحر اس قدر حاوی رہتا ہے کہ شیخ نجم الدین ان کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتا ہے۔ شکر اللہ نوکری کے سلسلے میں باہر چلا جاتا ہے۔ شیخ نجم الدین درگاہ اور مجاور کے جال میں مزید پھنستا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا نفسیاتی مرض

بھی شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اب اسے بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ اس نے جن لوگوں کا دامن پکڑا ہے وہ اس کا بیڑا پار نہیں لگائیں گے۔ جنھیں وہ اللہ والا اور صوفی سمجھتا ہے وہ تو شیطان سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ اس انکشاف پر شیخ نجم الدین کا اضطراب اتنا بڑھتا ہے کہ ایک صبح وہ اپنے بستر پر مردہ حالت میں پایا جاتا ہے اور اس کے اپنے ہاتھوں کی گرفت خود اس کے گلے پر اتنی شدید ہو چکی ہوتی ہے کہ انگلیاں اندر دھنسی ہوتی ہیں۔

ڈراما 'انجام' کے ذریعے پروفیسر محمد مجیب نے نہ صرف انسان کو اپنے کرموں کا محاسبہ کرنے کی تلقین کی ہے بلکہ وہ صاف لفظوں میں یہ بتاتے ہیں کہ دنیا کے پیچھے نہ بھاگو۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ دنیا کو تج کر جنگل میں جا بیٹھو۔ بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اپنی ضرورت سے زیادہ کی ہوس نہ کرو ورنہ شیخ نجم الدین کی مانند پچھتانا پڑے گا۔ اکثر لوگ اپنا کام کرنے کے بجائے دوسروں سے امید وابستہ کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ مندروں، درگاہوں اور دوسرے مذہبی مقامات پر چندہ دے کر یا ان سے وابستہ شخصیات کو خوش کر کے اپنی نجات کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ اس جانب پروفیسر مجیب نے ایک فقیر کی زبانی کیا خوب کہا ہے:

فقیر: ہے، ہے خدا نہ کرے میں بددعا کیوں دینے لگا۔ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ سودا نہ کرو، میری طرح سے بھیک مانگو۔ خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ، گڑگڑا کر دعا مانگو، شاید کچھ ہو جائے۔ کسی بندے کے ہاتھ میں روپیہ رکھ کر یہ چاہو گے کہ خدا کو رشوت دے کر خوش کر دیں تو پچھتاؤ گے۔ خدا کے یہاں پہنچ ہو سکتی ہے تو تمھارے رونے کی، تمھاری دعاؤں کی اور نیک اعمال کی۔ کوئی تمھارا وکیل بن کر نہیں جا سکتا۔ کوئی جانے کو کہے بھی تو سمجھو جھوٹا ہے۔ ہائے کیا عدل ہے، کیا انصاف ہے!

شیخ نجم الدین: میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو میں کسی کو وکیل بنانے کی کیوں فکر کرتا؟

فقیر: ہائے وہی حجت، وہی ہٹ۔ میں کہہ رہا ہوں۔ بھیک مانگو، بھیک۔ دنیا پر لات مارو، روپیہ پیسہ اس کی راہ میں دے ڈالو۔ بھیک مانگو اور خدمت

کرو۔ دعا کوئی حکیم تھوڑی ہی ہے کہ اجابت ہاتھ باندھے کھڑی رہے۔ تم
نے بندوں کا حق مارا ہے، تمھیں بہت بھگتنا ہوگا اور جتنا مصیبت سے بھاگو
گے وہ پیچھا کرے گی۔ ایک دن تم دیکھ لوگے کہ تم کیا ہو، اور تمھارے وکیل،
تمھارے دلال کیا ہیں...... اپنا دل ہے اور اپنا خدا ہے۔ اور اس کے سوا جو
کچھ ہے وہ سب دھوکا ہے۔

ان مکالموں سے ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈراما نگار کیا چاہتے ہیں۔ ڈراما نگار نے اس فقیر کے کردار میں خود کو پیش کیا ہے۔ اگر ہم ڈراما نگار پروفیسر محمد مجیب کی زندگی کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ وہ خود کتنے قناعت پسند تھے بلکہ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ ضرورت مندوں کو دے دیا کرتے تھے۔

ڈراما 'انجام' کے ذریعے محمد مجیب نے ایسے مریض ذہنوں کو جو اوہام پرستی کے شکار ہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ان خرابیوں اور کمزوریوں کا صحیح علاج اپنی غلطیوں اور گناہوں سے صدق دل سے توبہ کرنا اور سماج کی بھلائی اور ترقی کے لیے کام کرنا ہے نہ کہ ملاؤں اور مجاوروں کے فریب میں پھنس کر نہ صرف اپنی بلکہ اپنی آنے والی نسل کی زندگی تباہ کرنا۔

ڈراما کے دوسرے ایکٹ کا آخری دو منظر یعنی تیسرا اور چوتھا منظر نجم الدین کے خواب پر مشتمل ہے۔ ان دو مناظر میں باری باری سے مجاور نور شاہ اور ان کے مریدین اور ملاؤں کی حقیقت کو دکھایا گیا ہے۔ ان کے پورے نظام کا پردہ فاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تمام لوگ بھی اس سے واقف ہیں کہ وہ انھیں ان کی پریشانیوں سے نجات نہیں دلا سکتے لیکن اگر ان کے پاس وہ آئیں گے تو اس کی قیمت تو چکانی ہی پڑے گی۔ انھیں بھی اس کا احساس ہے کہ کوئی ایماندار شخص ان کے پاس نہیں آتا، بے ایمان اور رشوت خور ہی ان کے در پر آتے ہیں۔ شاہ نور کے ساتھ خواب میں نجم الدین کی گفتگو دیکھیں:

شیخ نجم الدین: (آبدیدہ ہو کر) شاہ صاحب میرے پاس جو کچھ ہے وہ لے لیجیے، بس
میرے حال پر رحم کھایئے۔

شاہ نور محمد: خوب، یہ مفت کا احسان اچھا...... آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ تو مل ہی

جائے گا، آپ دینا چاہیں یا نہ چاہیں، رشوت کا روپیہ، بے گناہوں کے خون کی قیمت، یہ تو میرا خاص حق ہے۔ اس سے نہ آپ مجھے محروم کر سکتے ہیں، نہ میں دست بردار ہو سکتا ہوں۔ یہ تو ایک قانون ہے، جس پر ہمیشہ سے عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ لوگ رشوت لیتے ہیں، دیانت، انصاف کو ہر خریدار کے ہاتھ بیچتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ خدا، عدالت کے چپراسی، منشی، جج بھی اسی طرح رشوت لے کر ان کے جرموں کو کسی بے گناہ کے سر منڈھ دیں گے۔
کیوں شیخ صاحب، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں؟

شیخ نجم الدین: حضور، میرا قصور معاف کر دیجیے۔ حضور، خدا کے لیے میرے اوپر رحم کیجیے۔

شاہ نور محمد: جی، میرا کام قصور معاف کرنا اور رحم کھانا نہیں ہے۔ میں تو معاملے کی بات کرتا ہوں۔ میں تو عدالت کے چپراسی کی طرح رشوت لوں گا اور جھوٹ سچ بول کر آپ کو راضی رکھوں گا، کہ رشوت ملتی رہے۔ لیکن آپ تو ایسے رشوت دینے والے ہیں کہ رشوت دے کر بھی اعتبار نہیں کرتے۔ آپ سے مختار علی نے لاکھ کہا کہ اعتبار اور عقیدے کے بغیر کام نہیں چلتا، مگر آپ نے ایک نہ سنی۔ آپ نے دل میں بہت دنوں سے مجھے بدمعاش اور دھوکے باز سمجھ رکھا ہے، آج آپ نے زبان سے بھی کہہ دیا، اور پھر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ میرے حال پر رحم کیجیے۔ اب تو بس آپ جانیے اور آپ کا سیہ فام جلاد۔

اسی طرح مولانا عبداللہ کے ساتھ خواب میں ملاقات کے بعد شیخ نجم الدین کو احساس ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے گزرے ہوئے دن کو یاد کر کے آئندہ ایسا نہ کرنے سے توبہ اور انسان کے بجائے خدا کی ذات سے امید کر کے اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا چاہیے نہ کہ ملاؤں اور مجاوروں کے ذریعے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ خدا جب ہر جگہ موجود ہے تو اس کی تلاش میں کسی دوسرے انسان کا سہارا کیوں لیا جائے۔

پروفیسر مجیب ان مقاصد کو پیش کرنے میں کامیاب ہیں لیکن دن رات عوام کا خون نچوڑنے والے شاہ نور اور ان کے مریدوں کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ انھیں کسی انجام تک پہنچائے بغیر ہی ڈراما ختم ہو جاتا ہے۔ شیخ نجم الدین کی شخصیت میں فطرت کا عنصر کم ہے۔ شکر اللہ جیسے تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوان کے کردار کو اور بھی بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا تھا۔ مولانا عبداللہ اور شاہ نور محمد کے کردار میں عملی صلاحیت نظر آجاتی ہے اور ان دونوں کرداروں میں حرکت و عمل موجود ہے۔ کہیں کہیں فلسفیانہ مکالموں سے بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پروفیسر مجیب نے جن حالات کو پیش کیا ہے وہ نہ صرف اس زمانے میں Relevant تھے بلکہ آج بھی لوگ اس جال میں پھنسے ہوئے ہیں ہمارے سماج میں شاہ نور محمد جیسے لوگ عوام کا خون چوس رہے ہیں۔

خانہ جنگی:

پروفیسر مجیب تاریخ کے استاد تھے اور اپنے دور کے سماج پر گہری نظر رکھتے تھے اکثر اپنے ڈراموں کے لیے ایسے موضوع کا انتخاب کرتے تھے جو انھیں سماج میں کہیں کہیں کسی نہ کسی صورت میں نظر آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھیں ہر تہذیبی اور سیاسی زوال کی تہہ میں خانہ جنگی نظر آئی تب انھوں نے اسے اپنے ڈرامے 'خانہ جنگی' کا موضوع بنایا۔ ڈراما 'خانہ جنگی' 1946 کے ہندوستان میں برپا خانہ جنگی نفرت اور فساد پر ایک بصیرت آمیز تبصرہ ہے۔ 1956 میں شائع ہونے والا ڈراما 'دوسری شام' کے پشت پر ڈراما 'خانہ جنگی' سے متعلق ان الفاظ میں اشتہار دیا گیا ہے:

> شاہ جہاں کی آخری دور حکومت میں اس کے بیٹوں کے باہمی اختلافات سے ایوان حکومت کو زبردست دھچکا لگا۔ سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس ڈرامے میں اس اختلاف اور مسلمانوں کے انتشار کی عکاسی ہے۔

پانچ ایکٹ پر مشتمل ڈراما 'خانہ جنگی' کا تانا بانا کچھ اس طرح بنا گیا ہے:

شاہ جہاں بوڑھا ہو گیا ہے اورنگ زیب نے بغاوت کی آواز بلند کردی ہے۔ وہ پوری

سلطنت کا مالک بننا چاہتا ہے۔ داراشکوہ کو جب علم ہوتا ہے تو وہ اورنگ زیب سے جنگ کرنے کی اجازت لینے کے لیے شاہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ شاہ جہاں دارا کو جنگ سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ آخر کار دارا کو جنگ کی اجازت ملتی ہے جسے اسٹیج پر نہیں دکھایا گیا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ بتایا گیا ہے۔

دوسرے ایکٹ میں داراشکوہ شیخ سرمد سے ملنے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جاتا ہے۔ اس وقت کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ داراشکوہ کو شکست ہوئی ہے۔ تیسرے ایکٹ میں سرمد کو گرفتار کرلیا جاتا ہے اور ان پر مذہب کی بے حرمتی کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ چوتھے ایکٹ میں سلطنت کے تمام مفتیوں کی موجودگی میں سرمد کو پیش کر کے ان پر لگائے گئے الزامات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ تمام علما شیخ سرمد کے خلاف دلائل پیش کرتے ہیں صرف ملا ابوالقاسم اپنے دلائل سے شیخ سرمد کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ملا ابوالقاسم کے دلائل کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور اورنگ زیب کے منشا کی حمایت کی جاتی ہے۔ اس طرح مذہب کے نام پر بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے شیخ سرمد کے لیے سزائے موت تجویز کردی جاتی ہے۔

پانچویں اور آخری ایکٹ میں شیخ سرمد کے قتل کا منظر بیان کیا گیا ہے۔ اسے دکھایا نہیں گیا ہے۔ ملا ابوالقاسم اپنے مدرسے میں شاگردوں سے شیخ سرمد کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں، ان کی خوبیاں بیان کر رہے ہیں، اسی دوران ایک شخص اطلاع دیتا ہے کہ شیخ سرمد کو مقتل کی جانب لے جایا جارہا ہے۔ ملا ابوالقاسم قتل کا منظر اس خوبی سے بیان کرتے جاتے ہیں جیسے وہ اپنی چشم تصور سے سب کچھ صاف صاف دیکھ رہے ہوں اور آخر میں اپنے شاگردوں کو لے کر شیخ سرمد کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے یہ کہہ کر نکلتے ہیں:

> چلو چلو شیخ سرمد کے جنازے کی نماز ادا ہونے والی ہے، اس میں
> شریک ہونا چاہئے...... آج یہی اصل نماز ہے......

ڈراما 'خانہ جنگی' کے پلاٹ پر نظر ڈالنے سے بظاہر تو دو مختلف نظریے رکھنے والوں کے درمیان کش مکش کا اظہار ہوتا ہے۔ دارا، ملا ابوالقاسم اور شیخ سرمد کے حامیوں کا خیال ہے کہ مذہب مل

جل کر رہنے کا نام ہے اور تمام مذاہب ایک ہی منزل کی طرف لے جاتے ہیں جبکہ اورنگ زیب اور اس کے حامیوں کا نظریہ یہ تھا کہ اسلام ایک خاص دین ہے اس کے ارکان کی پابندی لازمی ہے، اس میں کسی دوسرے مذہب کی آمیزش بھی مذہب پرستی سے دور کر دیتی ہے۔ لیکن اگر ذرا غور کریں تو مذہبی اختلاف تو ایک بہانا تھا اصل اختلاف تو سیاسی تھا۔ درحقیقت شیخ سرمد اور ملا ابوالقاسم کے معتقدین کی تعداد خاصی تھی لہذا اورنگ زیب کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں دارا ان لوگوں کی حمایت کے ذریعے فوج جمع کر کے پھر سے اس کے مقابلے کے لیے نہ آ جائے، اس لیے اس نے شیخ سرمد کو قتل کروا دیا۔ اب اگر 1946 کے حالات پر نظر ڈالیں تو صاف نظر آئے گا کہ محمد مجیب نے اس وقت کے دانشوروں کی سیاسی کشمکش کی عکاسی واضح طور پر اس ڈرامے کے ذریعے کی ہے۔ اس سلسلے میں سید احتشام حسین کا کہنا ہے:

> خانہ جنگی میں اورنگ زیب کا دارا پر فتح پانا یا سرمد کا شہید ہو جانا ڈرامے کا اصل موضوع نہیں ہے۔ بلکہ اصل موضوع ان اقدار کی کشمکش ہے جن کی نمائندگی ایک طرف سرمد اور دارا کر رہے ہیں اور دوسری طرف اورنگ زیب اور اس کے درباری علما جو شریعت کے ظاہری استحکام کے نام پر ملک کی پوری تہذیبی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں۔

(جدید اردو ڈراما اور اس کے بعض مسائل، آجکل ڈراما نمبر، جنوری 1959 ص 10)

اس ڈراما کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کردار نگاری اس سے پہلے کے ڈراموں کے مقابلے بہت بہتر اور فنکاری سے کی گئی ہے۔ کردار جس طبقہ اور ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں اسے پیش کرنے میں دلائل اور لب و لہجہ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ بیشتر کردار اپنے عقائد اور عزائم کے ساتھ ایک دوسرے سے پوری قوت سے ٹکراتے ہیں۔ مکالمے کرداروں کی مناسبت سے لکھے گئے ہیں جس سے ان کی زبان کا بھی اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ کہیں کہیں کرداروں کی گفتگو طویل ہے جو بلا ضرورت نہیں لگتی کیونکہ اس ڈراما کا ڈھانچہ ہی ایسا تیار کیا گیا ہے جہاں علمی مباحث کی گنجائش اور جواز دونوں موجود ہیں۔ بعض مقامات پر عمل کی رفتار سست پڑتی نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود ڈراما

'خانہ جنگی' نہ صرف سترھویں صدی (59 - 1645) میں ہونے والی خانہ جنگی کو پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ بلکہ بیسویں صدی (46 - 1945) میں برپا خانہ جنگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ دو مختلف فکر اور ذہن رکھنے والے کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اس کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ ڈراما کا ایک حصہ دیکھیں:

ملا ابوالقاسم: آپ نے جو کچھ طے کرلیا ہے وہ تو آپ کریں گے لیکن مجھے میر قصور معلوم ہو جائے تو میں سمجھ لوں گا کہ مجھے سزا کیوں دی جارہی ہے۔ میرے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ میرا طریقہ بھی نہیں بدلا ہے۔ میں ہمیشہ سے بہت برا سمجھتا رہا ہوں کہ مسلمان ایک دوسرے سے لڑیں، چاہے وہ میرے شاگرد ہوں یا کسی سلطنت کے حکمراں۔

عبدالرحمن: چاہے ایک فریق بے دین ہو اور دوسرا دین دار، ایک کافر نواز ہو اور دوسرا حق پرست؟

ملا ابوالقاسم: میں خانہ جنگی کو تباہی کی علامت سمجھتا ہوں اس لیے اسے برحق نہیں مان سکتا۔ اگر آپ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ میں دارا کا طرفدار ہوں اور اورنگ زیب عالمگیر کا مخالف تو یہ آپ کا استدلال ہے۔ میرے خیالات کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔

عبدالرحمن: تو پھر آپ اسے صاف صاف کیوں نہیں بیان کر دیتے؟

ملا ابوالقاسم: مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ میں بہت صاف کہتا ہوں۔ ملت اسلامی کے لیے سب سے زیادہ مہلک چیز خانہ جنگی ہے۔

عبدالرحمن: مگر اب تو جنگ کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اب آپ ایسی بات کیوں کہتے ہیں؟

ملا ابوالقاسم: خانہ جنگی ہر وقت اور ہر معاملہ پر ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کی ہر وقت ضرورت ہے۔

عبدالرحمن: اس وقت بھی۔

ملا ابوالقاسم: توبہ گناہ سے بچنے کے لیے کی جاتی ہے، آپ مجھے سمجھا رہے ہیں کہ جب گناہ کرلیا ہے تو پھر توبہ کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔

عبدالرحمن: آپ کا خیال ہے کہ اب جو لڑائی ختم ہوگئی ہے تو نعوذ باللہ عالمگیر بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنا چاہیے؟

ملا ابوالقاسم: میں خانہ جنگی کو بہت برا سمجھتا ہوں۔

عبدالرحمن: اس لیے آپ عالمگیر بادشاہ کو سلطنت کا حق دار نہیں مانتے۔

ملا ابوالقاسم: مجھے تاج و تخت کے حق سے کوئی بحث نہیں، وہ جس کو ملے اسے مبارک ہو۔

عبدالرحمن: لیکن اگر آپ سے رائے لی جائے۔

ملا ابوالقاسم: میں وہی کہوں گا جو آپ سے عرض کر چکا ہوں۔ آپ لوگ چاہیں تو مجھے اس کی سزا دلوا سکتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ میری باتوں سے ایسا نتیجہ نہ نکالیں کہ میں سزا کا مستحق ہو جاؤں۔ اب آپ کی جو مصلحت ہو وہ کیجئے۔ میں راضی بہ رضا ہوں۔

عبدالرحمن: مولانا صاحب، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے یا کسی اور کو ذرا بھی خواہش نہیں کہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچے، ہم سب آپ کی عزت اور قدر کرتے ہیں۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ آپ کے لیے کہاں تک مناسب ہے کہ مسلمانوں کے جذبات کا خیال نہ کریں اور انھیں مخالفت پر مجبور کریں۔ بس اب میں آپ کی اور سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے اجازت دیجئے۔ السلام علیکم۔

ان مکالموں سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اقتدار حاصل کرنے والے کس طرح مذہب کا سہارا لیتے ہیں، وہ کس طرح مذہبی رہنماؤں کو اپنے حق میں کر لیتے ہیں اور کس انداز سے حق گو کے گرد ایسا ہالہ تیار کر دیتے ہیں کہ وہ مجبور اور بے بس ہو جاتا ہے، ان کے ساتھ ساتھ ان کے حامی یا ان سے عقیدت رکھنے والوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ان کا ساتھ چھوڑ دے یا اس طرح کے بے شمار حربے

استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال آج بھی موجود ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے سیاست داں کس کس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں خواہ انھیں مذہب کا سہارا لینا پڑے یا مذہبی رہنماؤں کا۔ مذہب کے نام پر بے شمار انسانوں کی قربانیاں دینی پڑے یا انھیں کسی بھی صورت میں خاموش کروانا پڑے، وہ اپنے مفاد کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ ڈراما 'خانہ جنگی' میں بھی اس جانب اشارہ کیا گیا ہے جو آج کے حالات پر بھی صادق آتا ہے۔ ایک منظر میں ملا ابوالقاسم کے ایک ہونہار اور عزیز شاگرد حفظ الرحمٰن کے والد ملا ابوالقاسم کے پاس آکر اپنے بیٹے کو مدرسے سے نکالنے کی بات کرتے ہیں اور مولانا پر کئی سارے الزامات لگا دیتے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد حفظ الرحمٰن اپنے استاد سے مخاطب ہوتا ہے:

حفظ الرحمٰن: مولانا! آپ اس سے پریشان نہ ہوں۔ لوگ آآکر والد صاحب کو پریشان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لڑکے کو ایسے عالم کے پاس بھیجا ہے جو خانہ جنگی کو برا کہتا ہے اور محبت فی اللہ کی تلقین کرتا ہے۔ تو یقین جانو اس کی خبر بادشاہ عالم تک پہنچے گی اور پھر اسے کوئی ملازمت نہ ملے گی...... اصل بات یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو جاسوس سمجھنے لگے ہیں اور انھیں ڈر ہے کہ اگر کوئی بات کہی گئی جو بادشاہ عالم کے خلاف ہوئی تو وہ دربار تک پہنچ جائے گی اور پھر سختی سے باز پرس ہوگی۔

ملا ابوالقاسم: خانہ جنگی کی ایک آفت یہ بھی ہے کہ ہر شخص جاسوس بن جاتا ہے، اور اشتعال دینے والی خبریں پھیلانے لگتا ہے۔ اب ہمیں چاہیے کہ فائدے اور نقصان، آرام اور تکلیف کا خیال چھوڑ دیں اور شیخ سرمد کی نصیحت کو ہر وقت ذہن میں رکھیں۔ تمھیں یاد ہے انھوں نے فرمایا تھا کہ حقیقت کی ایک طلب وہ ہوتی ہے جو سوال بن کر نکلتی ہے، ایک طلب وہ ہوتی ہے جو خود سائل کو سوال کا جواب بنا دیتی ہے۔ اب ایسا آدمی بننے کی کوشش کرو کہ جس سے تمھیں اور اسے یقین ہو جائے کہ ملت اسلامی کی وحدت تمہاری مروت

اور شرافت میں قائم ہے، اور ہر صدمہ جو تمھارے دل کو پہنچے گا، اس وحدت میں اور استقلال پیدا کرے گا۔

ان مکالموں میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح کا اندیشہ حفظ الرحمٰن نے ظاہر کیا ہے۔ کیا یہ آج نہیں ہوتا اور ملا ابوالقاسم نے کس استقلال کا ذکر کیا ہے۔

ڈراما 'خانہ جنگی' کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مکالمے اس طرح تحریر کیے گئے ہیں جو نہ صرف کردار کی شخصیت اور ان کے ظاہر و باطن کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ دوسرے کردار کو سمجھنے میں بھی معاون ہوتے ہیں۔ پروفیسر مجیب نے کئی مقام پر اصل منظر پیش کرنے کے بجائے اسٹیج کی ضرورتوں اور اس کے حدود کو ذہن میں رکھتے ہوئے کسی کردار یا کرداروں کی زبانی واقعے کو اس فنکاری سے پیش کیا ہے کہ اصل واقعہ نظروں کے سامنے پیش آتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر شیخ سرمد کے قتل کے واقعے کو ملا ابولقاسم کی زبانی دیکھا جا سکتا ہے۔ ملا ابوالقاسم اپنے مدرسے میں شاگردوں کے ساتھ موجود ہیں تبھی ایک اجنبی داخل ہوتا ہے:

اجنبی: (ملا ابوالقاسم اور ان کے شاگردوں کو دیکھ کر) ابھی خبر آئی ہے کہ شیخ سرمد کو قتل گاہ کی طرف لیے جا رہے ہیں، آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب جانا چاہیں تو جلدی کریں۔

(اجنبی چلا جاتا ہے۔ خاموشی۔ ملا ابوالقاسم سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ گویا قتل گاہ کا نظارہ کر رہے ہیں)

ملا ابوالقاسم: شیخ سرمد کو کوئی لیے نہیں جا رہا ہے، وہ خود جا رہے ہیں۔ سپاہی زنجیروں کو کھینچ کھینچ کر انھیں روکتے ہیں، مگر ان کا شوق زنجیروں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ انھیں اس کا دکھ نہیں ہے کہ لوگ ان کے حال پر روتے ہیں، کوئی ان کی مدد نہیں کرتا، وہ کسی کی ہمدردی کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی نظر بس جلاد کی تلوار پر ہے اور اپنے قتل پر، اس سے زیادہ انھیں کوئی نہیں دے سکتا۔ اس سے کم وہ لیں گے نہیں...... دیکھو! جان کا سودا کر کے وہ کیسے خوش ہیں۔ جلاد

نے تلوار چمکائی ہے، وہ مسکراتے ہیں، اسے بلاتے ہیں، ہنس کر کہتے ہیں، فدائے تو شوم، بیابیا کہ بہر صورتے کہ می آئی ترا خوب می شناسم! لواَب جلاد کیا کر سکتا ہے، انھوں نے گردن جھکا دی ہے۔ اب سر جدا ہو گیا...... دیکھو، چہرے پر وہی خوشی کا رنگ وہی مسکراہٹ ہے۔ ہونٹ چپکے چپکے ہل رہے ہیں...... لا الٰہ الا اللہ...... ہاں ہاں، میں تو جانتا تھا کہ یہ جان دے کر ہی کلمہ پڑھیں گے، اس سے کم کرنا ان کی عاشقی کی شان کے خلاف تھا...... مگر۔ ہائے ہائے، یہ کیا، ان کا بدن تڑپ کر کھڑا ہو گیا، ایک ہاتھ نے سر کو اٹھا لیا...... (کانپتے ہوئے کھڑے ہو کر) آقا، مرشد، محبوب، یہ کیا؟ یہ کون سی ادا ہے؟...... (دبی اور بھرائی ہوئی آواز میں) ایک فقیر اچانک مجمع سے نکلا ہے۔ کہتا ہے، سرمد! بس...... اب سر الگ گر گیا ہے، دھڑ الگ۔ دونوں پر موت طاری...... إنا للہ و إنا الیہ راجعون......

پروفیسر محمد مجیب نے مکالمہ نگاری میں ایک تجربہ بھی کیا ہے اور وہ تجربہ یہ ہے کہ ایک سے زیادہ کرداروں کے مکالمے ان کرداروں کی موجودگی میں ایک ہی کردار سے ادا کروائے ہیں۔ اکثر ڈرامے میں یہ ہوتا ہے کہ جتنے کردار اسٹیج پر موجود ہوتے ہیں وہ آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی کبھی صرف یاددہانی کے لیے دوسرے کردار کے مکالمے کو دہرایا جاتا ہے لیکن ڈراما نگار نے خانہ جنگی میں ابراہیم بدخشانی سے اپنے ساتھی طالب علموں کے ساتھ ساتھ استاد ملا ابولقاسم کے مکالمے بھی نہایت پراثر انداز میں خود ادا کیے ہیں:

ابراہیم بدخشانی: ہم میں سے جو فارغ ہونے والے ہیں وہ اکثر ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے ہیں کہ انھیں خدمت کا کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے میں آپ سے موقع بے موقع پوچھتا رہتا ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، مگر آپ کے کسی جواب سے یہ معلوم نہ ہوا کہ آپ کی اپنی خواہش کیا ہے۔ کبھی آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنی الگ الگ طبیعتیں لے کر آئے ہو۔

میں یہ کیسے حکم دے دوں کہ تم سب فلاں کام کرو۔ کبھی آپ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں کو اپنی کسی رائے یا خواہش کا پابند کرنا نہیں چاہتا۔ کبھی آپ نے نصیحت فرمائی کہ حق پر اور صبر پر متفق رہو اور سمجھو کہ قرآن پاک کا وعدہ ہے کہ تم نقصان میں نہ رہو گے۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ ہم آٹھ دس نوجوان برسوں سے ساتھ پڑھ رہے ہیں، کیا اچھا ہو اگر ہماری جمعیت قائم رہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جمعیت کو قائم رکھنے کے لیے محبت فی اللہ سے بہتر کوئی رشتہ نہیں۔

ان مکالموں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تربیت کا بہتر طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ ملا ابوالقاسم نے صرف تعلیم نہیں دی بلکہ ان طالب علموں کی تربیت بھی کی کہ کب اور کن حالات میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ان کی اپنی فکر کیسے اجاگر ہو سکتی ہے جس کی اشد ضرورت آج کے زمانے میں ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ انسان بھیڑ میں تبدیل ہو گیا ہے ادھر کسی نے ہانک لگائی اور بھیڑ ایک جانب چل پڑی پھر دوسرے نے ہانک لگائی تو بھیڑ ادھر مڑ گئی۔

ڈراما خانہ جنگی کسی ایک خاص زمانے کے واقعے پر مبنی ضرور ہے لیکن یہ صرف اس زمانے کو ہی نہیں پیش کرتا ہے بلکہ ایسے حالات سے گزر رہے ہر زمانے کی عکاسی کرتا ہے۔ ہمیں بتاتا ہے کہ خانہ جنگی کن حالات میں اور کن صورتوں میں پیش آتی ہے۔ اس کے کیا کیا برے نتائج ہو سکتے ہیں اور ان سے ہم کیسے بچ سکتے ہیں۔ خانہ جنگی کی صورت صرف حکمرانوں کے مفاد پرست ہونے کی صورت میں ہی نہیں ہو سکتی ہے بلکہ کسی بھی طبقہ اور ذہنیت کے لوگوں کے ذریعے یا اس کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ گویا پروفیسر مجیب نے ایک ایسا ڈراما خلق کیا ہے جس کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہے گی۔

حبہ خاتون:

1952 میں جب کشمیر آگ اور خون کے خوفناک دریا سے گزر کر ایک نئی منزل کی جستجو میں مصروف تھا، محمد مجیب نے اپنا ڈراما 'حبہ خاتون' لکھا۔ ڈراما 'حبہ خاتون' نہ صرف خواتین کی طاقت اور ان کی قربانیوں کی عکاسی کرتا ہے بلکہ مستقبل کے رہنماؤں کے لیے مشعل راہ ہے۔ ڈراما 'دوسری شام' کے پشت پر شائع ہونے والا اشتہار دیکھیں:

> 'کشمیر کشمیریوں کا ہے'۔ یہ آواز سب سے پہلے اکبر اعظم کے عہد میں حبہ خاتون نے بلند کی تھی۔ یہی وہ آواز ہے جو آج بھی وہاں کے عوام کی رہنمائی کر رہی ہے۔ اس ڈرامے میں حبہ خاتون کی شخصیت اپنی تمام تر شعریت کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔

1956 میں شائع ہونے والے اس اشتہار سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈراما ملک و قوم کے لیے کتنی رہنمائی کا کام کرتا ہے۔ یہ ڈراما چار ایکٹ اور پانچ مناظر پر مشتمل ہے۔ اس ڈراما کا پلاٹ مغل دور کی ایک سچی جمہوریت پسند خاتون حبہ کی حیات اور کارناموں پر مبنی ہے۔

پہلے ایکٹ کے پہلے منظر میں بچی 'زون' چشمہ شمشاد اور پہاڑیوں سے باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ وہ بچی گیت گاتے ہوئے قدرتی نظاروں کا بھرپور لطف لیتی ہے۔ سید مبارک شاہ اس بچی کے بارے میں پیشن گوئی کرتے ہیں کہ یہ ایک دن تاریخ میں اپنا نام درج کرائے گی اور بچی کا نام 'حبہ' تجویز کرتے ہیں۔ دوسرے منظر میں حبہ کا گیت سن کر شہزادہ یوسف اس کا نام جاننا چاہتا ہے۔ حبہ کسی اجنبی کو اپنا نام بتانے سے صاف انکار کر دیتی ہے۔ حبہ کے حوصلہ کو دیکھ کر یوسف اس سے محبت کا اظہار کرتا ہے، حبہ کے انکار کرنے پر اسے محبت کے بدلے سلطنت دینے کا وعدہ کرتا ہے اور حبہ کے شوہر کو حبہ کو طلاق دینے کا حکم دیتا ہے۔ اس کے بعد یوسف حبہ کو محل میں لے آتا ہے۔

دوسرے ایکٹ میں قاضی ابومحمد کے ذریعے موسیقی اور محفل سمع کو حرام قرار دینے کا علم یوسف کو ہوتا ہے۔ وہ قاضی کو سزا دینا چاہتا ہے۔ حبہ یہ کہتے ہوئے منع کرتی ہے کہ قاضی خود شاعر ہیں،

وہ موسیقی اور راگ اس لیے نہیں سنتے کہ حرام ہے، اگر وہ ایک بار سن لیں گے تو سب بھول جائیں گے۔ قاضی کو خلوت میں ملنے کے لیے کہلواتی ہے۔ قاضی آتے ہیں انھیں عزت سے بٹھایا جاتا ہے۔ پھر انھیں یکے بعد دیگرے بہت سے اشعار پہلے تحت سے پھر ترنم سے اور پھر موسیقی کے ساتھ سنائے جاتے ہیں۔ قاضی رفتہ رفتہ اس موسیقی میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ وہ یہ تک بھول جاتے ہیں کہ وہ فیصلہ کرنے آئے تھے، وہ خود جھومنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ قوالی سن کر حال آجاتا ہے۔ حبہ اور یوسف یہ منظر دیکھ کر مسکراتے ہیں۔

تیسرے ایکٹ میں سید مبارک یوسف کو عوام کے درمیان جا کر ان کی پریشانیوں کو سننے اور انھیں دور کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ جس کی حمایت حبہ خاتون بھی کرتی ہے۔ اسی درمیان عوام میں بغاوت پھوٹ پڑتی ہے اور اس کا الزام سید مبارک پر لگاتے ہوئے اسے دبانے کا فوراً حکم دیا جاتا ہے۔ یوسف سے ذہنی مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے حبہ خاتون محل چھوڑ کر ایک بار پھر پہلے کی سی گوشہ نشینی کی زندگی گزارنا شروع کر دیتی ہے۔ بغاوت کی آگ اور تیز ہو جاتی ہے۔ خدام شہر چھوڑ کر بھاگتے ہیں اور آخرکار یوسف کو بھی خزانہ لے کر بھاگنے کی نوبت آجاتی ہے۔

چوتھے اور آخری ایکٹ میں قاضی ابو محمد حبہ خاتون سے گزارش کرتا ہے کہ وہ اس گوشہ نشینی کی زندگی کو چھوڑ کر حکومت کی باگ ڈور سنبھال لے۔ عوام بھی یہی چاہتی ہے اور اس کا اصرار کرتی ہے۔ قاضی ابو محمد اور عوام کے اصرار پر آخرکار حبہ خاتون کو کشمیر کی قیادت کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے۔

ڈراما کے پلاٹ پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ایک تاریخی کردار کے ارد گرد پروفیسر مجیب نے ایسا تانا بانا تیار کیا ہے جو نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ جدید دور کی سماجی اور سیاسی اتھل پتھل اور داؤ پیچ کی جانب بھی صاف اشارہ ملتا ہے۔ حالانکہ واقعہ مغل دور حکومت کا ہے لیکن اسے ہم آج بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ دور میں بھی حاکموں کو عوام سے ملنے اور ان کی حقیقت جاننے کا کتنا وقت اور کتنی دلچسپی ہے۔ وہ عوام کی خبر لینے کے بجائے اپنے حاکم یا ان کے نمائندے ہونے پر اس قدر مست رہتے ہیں کہ عوام کی خبر گیری کی نہ تو ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ ان کی ضرورتوں سے آشنا ہونا چاہتے ہیں۔ کیونکہ فیصلہ کرنا ان کے ہاتھ میں اب رہا ہی نہیں ہے۔ جو فیصلے کرتے ہیں ان کی باتوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھ بند کر کے یقین کرنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو ان کا عیش و

آرام جاتا رہے گا۔ اگر کوئی انھیں حقیقت سے آشنا کرنا چاہتا ہے تو ان کے ارد گرد رہنے والے ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھنے نہیں دیتے۔ ایسا ہی ایک منظر اس ڈرامے کے تیسرے ایکٹ میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ سید مبارک حقیقت سے آشنا کرانا چاہتے ہیں تو انھیں ہی غدار ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام کے جذبات سے بادشاہ یوسف واقف نہیں ہو پاتا اور عوام بغاوت کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک حصہ آپ بھی دیکھیں:

سید مبارک: مجھ سے لوگ اپنی مصیبتیں بیان کرتے رہتے ہیں میں جس طرح سمجھ میں آتا ہے ان کو تسلی دیتا ہوں۔ اب کچھ عرصے سے لوگوں میں پریشانی بہت بڑھ گئی ہے۔ انھیں اس کا دکھ ہے کہ عالی جاہ انھیں دیدار کا کوئی موقع نہیں عنایت فرماتے۔ ان کے حال کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ جو فریاد کرنے آتا ہے اس کے ساتھ اور بھی زیادہ سختی کی جاتی ہے۔ اب وہ میرے گرد جمع ہوا کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ ان کی شکایتیں آپ تک پہنچاؤں۔

محمد بٹ: جہاں پناہ! یہ بات کس قدر غلط ہے کہ آپ رعایا کے حال سے باخبر نہیں۔ حکومت کا سارا کام دستور کے مطابق ہو رہا ہے اور کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کی جاتی۔ لیکن بعض لوگ ہیں جو اپنی بدنیتی کی وجہ سے سرکشوں کی حمایت کرتے ہیں اور فتنے کی آگ کو بھڑکاتے رہتے ہیں۔

سید مبارک: عالی جاہ! مجھے پورا یقین ہے کہ آپ رعایا کو آسانی سے مطمئن فرما سکیں گے۔ اس لیے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر عالی جاہ کو منظور ہو تو میں کل یا پرسوں لوگوں کو عیدگاہ میں جمع کروں اور آپ ان کی تسلی فرما دیں۔

علی شیر خاں ماگرے: ظل اللہ، مجھے اس میں عذر ہے۔ مجھے شہر کا حال معلوم ہے اور اس کی بنا پر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ظل اللہ کا ایسے مجمع میں تشریف لے جانا جس میں بدمعاشوں اور غنڈوں کو مرعوب رکھنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو بہت خطرناک ہوگا۔

سید مبارک: عالی جاہ۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آپ کی رعایا آپ سے بہت محبت کرتی ہے اور آپ کو اپنے بیچ میں دیکھ کر اسے بہت تسلی ہوگی۔ آپ اپنی رعایا پر اعتبار فرمائیے۔

حبہ خاتون: عالی جاہ، میری بھی یہی درخواست ہے۔

ولی عہد: جہاں پناہ! آپ رعایا پر اعتبار ضرور فرمائیں۔ مگر اس کے ساتھ احتیاط بھی لازمی ہے۔

سید مبارک: عالی جاہ! میں اس کا ذمہ لے سکتا ہوں کہ لوگ احترام اور عاجزی کے ساتھ اپنی شکایتیں بیان کریں گے اور کسی قسم کی بے ادبی نہ ہوگی۔

محمد بٹ: ظل اللہ، جب کسی کا آپ کی رعایا پر اتنا اثر ہے کہ وہ فوج کے بغیر آپ کی سلامتی کا ذمہ لے سکے تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس نے اپنے اثر سے کام لے کر فساد کو دبایا کیوں نہیں۔

یوسف شاہ: تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔

سید مبارک: عالی جاہ! اس وقت رعایا کی دل جوئی کی ضرورت ہے۔ یہ آپ ہی فرما سکتے ہیں۔ اب میرا اثر لوگوں کو روک نہیں سکتا۔

محمد بٹ: ظل اللہ، مجھے اس پر اعتراض ہے کہ اس طرح آپ کے اور آپ کے خادموں کے طرزِ عمل کی شکایت کی جائے۔ کیا آپ اپنی رعایا کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ کیا آپ حکومت کے فرائض کو انجام نہیں دے رہے ہیں۔ یہ دل جوئی کرنے کا مطالبہ مجھے صرف ایک بہانہ معلوم ہوتا ہے۔

یوسف شاہ: (یکبارگی طیش میں آ کر) دیکھو! سید مبارک، اب میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا۔ یہ فساد تمھاری وجہ سے ہو رہا ہے اور اسے دور کرنا بھی تمھارا ہی فرض ہے۔ تم اسی وقت جاؤ اور بغاوت کے جذبے کو لوگوں کے دلوں سے نکالو، ورنہ جو کچھ ہوگا اس کے تم ذمہ دار ہو۔

سید مبارک: عالی جاہ! میں آپ کا حکم بجالانے کی پوری کوشش کروں گا۔ مگر میری درخواست ہے کہ آپ میرے ساتھ اپنے کسی معتبر وزیر کو بھیج دیجیے تا کہ وہ لوگوں کے جوش کا اندازہ کرلے اور میرے طرزِ عمل کو بھی جانچ لے۔

محمد بٹ: ظل اللہ، اس میں بھی آپ کی حکومت کی بڑی سبکی کا اندیشہ ہے۔ لوگ کہیں گے کہ بادشاہ ہاتھ نہیں آیا تو وزیر ہی کو ذلیل کرو۔

یوسف شاہ: (مستی کے غصے میں کانپتے ہوئے) بس کرو، سید مبارک اب جاؤ اور تم سے جو کچھ کہا گیا ہے کرو۔

اور مجبوراً سید مبارک کو جانا پڑتا ہے۔ چونکہ عوام بادشاہ کو دیکھنا چاہتی ہے۔ بادشاہ سے اپنے دل کا حال بیان کرنا چاہتی ہے۔ اسے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ محمد بٹ جیسے لوگ بادشاہ کو حقیقت سے آگاہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کو عوام کے مسائل سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ان سب کی نظر صرف اور صرف خزانے پر ہے، جس کا علم بادشاہ کو نہیں ہو پار ہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بادشاہ کو شراب و شباب کا ایسا چسکا لگا دیا گیا ہے کہ اب وہ عوام کی جانب توجہ ہی نہیں کرتے اور بادشاہ یوسف شاہ کے نام سے محمد بٹ جیسے لوگ ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس لیے عوام بغاوت کر دیتی ہے اور بغاوت کے بعد محمد بٹ بادشاہ کو خزانے کے ساتھ بھاگ جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ جبکہ حبہ خاتون اس وقت بھی بادشاہ کو عوام کے بیچ جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ اس منظر کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

یوسف شاہ: یہ سب سید مبارک کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ اسے پہلے ہی قتل کر دینا چاہیے تھا۔

حبہ خاتون: جی ہاں، سیلاب کی خبر لانے والے کا منہ بند کر دیا جاتا تو سیلاب رک جاتا۔ اب اطمینان دلانے والوں کا اطمینان رنگ لا رہا ہے۔

یوسف شاہ: اس کا کیا مطلب ہے؟

حبہ خاتون: عالی جاہ، میری بات کا کبھی کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

یوسف شاہ: (عاجزی سے) آج آپ میری بہت سخت آزمائش کر رہی ہیں۔ آخر

بتایئے تو اب کیا کروں؟

حبہ خاتون: مجھے محل سے چلے جانے کی اجازت دے دیجیے۔

یوسف شاہ: لوگ آپ کو پہچانتے ہیں۔ آپ کا محل سے نکلنا خطرناک ہے۔

حبہ خاتون: لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

(دیوان خاص کا ایک دروازہ زور سے کھلتا ہے۔ اور محمد بٹ انتہائی پریشانی اور خوف کی حالت میں داخل ہوتا ہے)

محمد بٹ: ظل اللہ، غضب ہو گیا۔ شہر میں آپ کے خادم قتل ہو رہے ہیں۔ اور ان کے گھر لوٹے جا رہے ہیں۔ فوج نے افسروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے آپ کے جو خیر خواہ بچ گئے ہیں وہ ادھر ادھر چھپے ہوئے ہیں اور شہر سے بھاگنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ اب حضور کیا حکم ہے؟

یوسف شاہ: ملکہ جہاں اب فرمایئے!

حبہ خاتون: عالی جاہ، آپ کو ابھی تھوڑی دیر ہوئی یقین دلایا گیا تھا کہ آپ کے خادم رعایا کی حالت سے باخبر رہتے ہیں۔ یہ تو انھیں سے پوچھنا چاہیے کہ انھیں منہ چھپانے اور شہر سے بھاگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

محمد بٹ: ظل اللہ، مجھے اب یقین ہے کہ سید مبارک نے آپ کی دشمنی میں غداروں کو فساد پر آمادہ کیا۔

یوسف شاہ: (گھبرا کر) مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

محمد بٹ: لیکن اب اسے غداری کی سزا دینے کے لیے موقع کا انتظار کرنا ہوگا اس وقت تو ہمیں اپنی سلامتی کی تدبیر کرنا ہے۔

یوسف شاہ: ملکہ جہاں اب بتایئے کیا کریں؟

حبہ خاتون: آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔

یوسف شاہ: کہاں چلوں آپ کے ساتھ؟

حبہ خاتون: جمہور کے دل میں۔

یوسف شاہ: اسی جمہور کے دل میں جو مجھے قتل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

محمد بٹ: جہاں پناہ! اب ایسی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نے خزانہ کھلوایا ہے۔ اس میں سے جتنا آسانی سے لے سکیں گے لیں گے۔ دریا کی طرف ایک کشتی تیار ہے اور دوسرے کنارے پر چند لوگ گھوڑے لیے کھڑے ہیں۔ اب دیر نہ کیجیے۔

پروفیسر مجیب کی مکالمہ نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کئی مقام پر مکالے کی شکل میں شاعری کی ہے۔ انھوں نے کشمیر کے مناظر اور اس سے پیدا ہونے والے احساسات کو حبہ خاتون کی زبان سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اگر انھیں ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے تو نہ صرف ایک اچھی نظم کی شکل اختیار کرلے گا بلکہ اس زمانے کے کشمیر کی خوبصورتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوا محسوس کریں گے۔ ایسے مناظر میں سے ایک منظر سے آپ بھی لطف اندوز ہوں:

حبہ خاتون :......کئی سال ہوئے ایک روز صبح کو اٹھی تو اسی نشے میں چور تھی۔ میرے گھر کے پاس ایک چشمہ بہتا تھا۔ چشمے کے کنارے ایک شمشاد کا درخت تھا۔ میں نے چشمے کو پیار کیا، شمشاد سے لپٹ گئی۔ چاہتی تھی کہ پہاڑ میرے پاس آجائیں، مجھ سے گلے ملیں۔ وہ نہیں آئے تو روٹھ گئی۔ پھر میں شمشاد کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گئی اور چشمے کے بہاؤ کو دیکھنے لگی۔ اس کی ہر لہر کے ساتھ معلوم ہوتا تھا کہ میرے دل ودماغ میں نشے کی لہریں اٹھتی ہیں۔ دل میں ایک شوق بھرا ہے جو سینے کو چیر کر نکلنا چاہتا ہے۔ میں نے گنگنانا شروع کیا۔ میرے ہاتھ پاؤں ساز کے تاروں کی طرح کانپنے لگے۔ میرا پہلا گیت چشمے کی طرح پھوٹ نکلا...... کیا دیکھتی ہوں کہ ایک صوفی اپنے نوجوان مرید کے ساتھ سامنے کھڑے ہیں۔ انھوں نے میرے نشے کی کیفیت پہچان لی۔ میرے پاس اس طرح بیٹھ گئے کہ گویا میرا گانا سننا چاہتے ہیں مگر میں گھبرا گئی۔ دل سے جو سُر نکلنا چاہتے تھے وہ گلے میں پھنس

گئے۔ جیسے آپ کی پتلی گردن کی صراحی میں شراب پھنس جاتی ہے......
نوجوان مرید نے کہا: مولانا روم کی ایک غزل سناتا ہوں اور بڑی خوش الحانی
سے ایک غزل سنائی...... مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا۔ شاید میں بھی اس
کے ساتھ گانے لگی......ایک سچے سُر نے زندگی کے ساز کو جگا دیا......

ان مکالموں کی روشنی میں بھی اگر اس ڈراما کے کرداروں کو دیکھتے ہیں تو ان کی خصوصیات ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ یوسف شاہ جیسا نااہل بادشاہ دکھائی دیتا ہے تو محمد بٹ جیسا مفاد پرست وزیر، قاضی ابومحمد جیسا مذہبی پیشوا جو لوگوں کو جن کاموں سے منع کرتا ہے خود بھی اس سے محظوظ ہوتا ہے۔ سید مبارک جیسا عوام کی فکر کرنے والا درباری بھی دکھائی دیتا ہے جو ملک وقوم کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے حبہ کو تیار کرتا ہے تو ان کی مدد کرنے والا شاگرد عطا محمد جیسا کردار بھی نظر آتا ہے۔

حبہ خاتون کے کردار پر نظر ڈالیں تو علم ہوتا ہے کہ وہ ایک سچی اور جمہوریت پسند خاتون ہے۔ اس نے شاہی محل میں بھی عوام اور جمہوریت کی حمایت کی اور اسی خیال کے تحت شہزادہ یوسف کے ساتھ محل سے راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے اپنی گزشتہ زندگی اور گوشۂ تنہائی کو پسند کیا۔ جب عوامی شورش کو دبانے کے لیے مغلوں کو دعوت دینے کی تجویز اس کے سامنے آئی تو اس نے پوری جرأت کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور کہا: ''کشمیر کشمیریوں کا ہے''۔

ہیروئن کی تلاش:

محمد مجیب نے جب ڈراما 'حبہ خاتون' لکھا تو اسے اسٹیج کرنے کی غرض سے ایک خاتون فنکار کی تلاش شروع ہوئی، ایسی خاتون جس کا سن زیادہ نہ ہو مگر دنیا دیکھ چکی ہو یعنی تجربہ کار ہو، جس کے دل میں درد ہو مگر بے فکروں کی طرح ہنس بول سکے۔ جس کی شکل اچھی ہو اور آواز بھی اچھی ہو۔ اس تلاش کے دوران آنے والی پریشانیوں اور عورتوں کو اسٹیج پر لانے کے سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں اور ساتھ ہی اس مسئلے کو مدنظر رکھ کر کہ ڈراما دیکھنا اور بات ہے اور ڈراما اسٹیج کرنا اور، محمد مجیب نے 1953 میں ڈراما 'ہیروئن کی تلاش' لکھا۔ 1956 میں ڈراما 'دوسری شام' کے پشت پر ڈراما 'ہیروئن کی تلاش' سے متعلق اشتہار ان الفاظ میں شائع ہوا:

اس ڈرامے میں ڈراما نگار نے بڑے موثر پیرایہ میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری موجودہ زندگی کس قدر سطحی ہے۔

پانچ سین کے اس ڈراما میں کل 13 کردار ہیں جو سماج کے مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ڈراما کا پلاٹ اس طرح ہے۔

ڈراما نگار جیوتی پرکاش اپنے نئے ڈراما کے لیے ہیروئن کی تلاش میں ہے۔ مسز مہرہ ،شیوچرن، لالا سروپ چند، رگھورام، کیلاش ناتھ، یہ تمام لوگ مل کر اس ڈراما کو کھیلنے کی تیاریوں پر مشورہ کرتے ہیں۔ مشورے کے دوران یہ مسئلہ درپیش آتا ہے کہ ہیروئن کا کردار کس سے ادا کروایا جائے؟ آخر میں یہ طے پاتا ہے کہ اس کے لیے تین مختلف خواتین یعنی کنور رانی، پورنما اور نرملا سے باری باری سے بات کی جائے۔ کنور رانی ایک دولت مند اور عیش پرست عورت ہے۔ وہ ڈرامے میں کام کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ پورنما کا آئی اے ایس شوہر اپنے سماجی مرتبے کی وجہ سے اپنی بیوی کو ڈرامے میں کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ نرملا کا شوہر رام رتن ایک سرمایہ دار ہے۔ وہ بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ نرملا ڈرامے میں کام کرے۔

آخری منظر میں مسز مہرہ کے گھر پر تمام لوگ پھر سے یکجا ہوتے ہیں کیونکہ ابھی تک ہیروئن کی تلاش کا معاملہ حل نہیں ہوا ہے۔ مشورے کے دوران مسز مہرہ کا نام ہیروئن کے لیے آتا ہے تبھی مسز مہرہ کے دل کی مراد پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ صرف یہ جتانے کے لیے کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اس ڈراما کو مسز مہرہ نے لکھوایا ہی اس لیے تھا کہ وہ ہی ہیروئن کا کردار ادا کرے، وہ اپنی دلی خواہش کا اظہار کرنے میں ذرا سا تکلف سے کام لیتی ہے۔ اسی دوران اس کی بھانجی کملا (جو مسز مہرہ کے ساتھ ہی اس کے گھر میں رہتی ہے) کا نام آتا ہے۔ کملا کا نام آتے ہیں مسز مہرہ کا موڈ بگڑ جاتا ہے اور وہ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے:

مسز مہرا: ......آپ لوگ بڑی خوشی سے کملا کو روپ متی بنائیں۔ مگر میں آپ لوگوں کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ کملا میرے یہاں نہیں رہے گی اور میں آپ لوگوں کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔

ڈراما' ہیروئن کی تلاش' کے ذریعے ڈراما نگار نے سماج کے اتھلے پن کو نمایاں کرتے ہوئے موجودہ معیارِ زندگی اور طرزِ زندگی پر بھرپور طنز کیا ہے۔ ڈراما کے مکالموں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجیب صاحب ڈراما لکھتے وقت کن مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے تھے اور کرداروں کے انتخاب میں ان کا معیار اور ان کی پسند و ناپسند کیا تھی۔ ایک طرف موجودہ ڈرامے پر تنقید ہے تو دوسری جانب کہانی اور ڈراما کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ اچھے اور برے ڈرامے میں کیسے تمیز کی جاتی ہے، ڈرامے کے اداکار اور فلم کے اداکار اور ان کی اداکاری میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ڈراما دیکھنے اور کرنے میں کیا فرق ہوتا ہے، اور اس طرح کے بہت سے نکات کو ڈراما' ہیروئن کی تلاش' کے ذریعہ نہایت کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔ فلم کے گرتے معیار اور اس کی اداکاری کی مصنوعیت کا احساس اب سے ساٹھ برس پہلے مجیب صاحب کو تھا۔ اس ڈرامے میں پیش کیے گئے رگھورام کے الفاظ دیکھیں:

> رگھورام: ...... میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے ڈرامے کا کالج کے زمانے سے بہت شوق ہے۔ ایک زمانے میں اس شوق کی وجہ سے کچھ بدنام بھی ہو گیا تھا۔ اب فضا بالکل بدل گئی ہے۔ لڑکوں لڑکیوں پر اتنی پابندیاں نہیں رہی ہیں۔ مگر دوسری طرف فلموں نے نوجوانوں کے مذاق کو بالکل بگاڑ دیا ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کسی کو تھوڑی سی ایکٹنگ آ گئی تو کیا ہوگا۔

اسی طرح اسٹیج ڈرامے کی اداکاری اور فلم اداکاری میں فرق اور اس کے نکات سے بھی پروفیسر مجیب بخوبی واقف تھے۔ ان کی نظر میں فلم اداکاروں کو اچھا ڈراما نہیں دینا چاہیے کیونکہ وہ ہمیشہ اسے کیمرے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں، تماشائی کی نظر سے نہیں۔ ہم واقف ہیں کہ ڈرامے کا اصل جوہر تماشائی کی شمولیت سے ہی کھلتا ہے۔ فلم اور ڈرامے کے تماشائی نہ صرف مختلف ہوتے ہیں بلکہ مختلف مزاج کے مالک ہوتے ہیں۔ فلم کے عام ناظرین کی ذہنیت کی عکاسی پروفیسر مجیب ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> رام رتن: صاحب فلم تو میں دیکھتا رہتا ہوں، ان میں سے کچھ پسند بھی آتی ہیں۔ لیکن

ڈراما کیوں دکھایا جاتا ہے؟ جب اس میں ناچ ہوتا ہے نہ گانا، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کالج میں تھا تو یار دوست کبھی کبھی پکڑ لے جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ ڈراما اچھا نہ ہوا تو دو چار لڑکیوں کو دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد تو میں نے کوئی ڈراما دیکھا نہیں اور نہ دیکھنے کا جی چاہتا ہے۔

ہاں یہ بھی درست ہے کہ کچھ ناظرین ایسے ہیں جو فلم اور ڈراما دونوں دیکھتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جو ڈراما کے تماشائی یا اداکار ہیں ان کو فلم کے مقابلے ڈراما دیکھنے اور کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے، کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ فلم کے اداکار سچی اداکاری نہیں کرتے۔ ان کی اداکاری کیمرے کے زاویے اور ایڈیٹنگ ٹیبل کی مدد سے نمایاں ہوتی ہے تو اس کے مقابلے میں اسٹیج اور ڈرامے کی اداکاری کا جوہر ناظرین کے آنکھوں کے سامنے اور براہ راست دکھائی دیتا ہے۔ اداکار ناظرین کے سامنے ان کے جذبات کے ساتھ ہنستے اور روتے ہیں۔ فلم اور ڈرامے کی اداکاری کے سلسلے میں پروفیسر مجیب جیوتی پرکاش کی زبانی کہتے ہیں:

جیوتی پرکاش: میں ڈراما لکھ رہا تھا تو مسز مہرا سے کبھی کبھی اس بارے میں مشورہ ہوتا تھا کہ روپ متی کا پارٹ کس سے کرایا جائے۔ سوچتے سوچتے تھک جاتے تو ان کی یا میری زبان سے یہ نکل جاتا تھا کہ اور کوئی عورت نہ ملی تو بمبئی سے جان پہچان کی فلم ایکٹرس کو بلا لیں گے۔ مگر پھر ہم دونوں یہ کہہ اٹھتے تھے کہ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ فلم والوں کو اچھا ڈراما دینا اس کی مٹی پلید کرنا ہے۔ فلم ایکٹنگ ایک بیماری ہے کہ جس کو لگ جائے وہ پھر سچی ایکٹنگ کے لائق نہیں رہتا۔ دوسری طرف مجھے اس کا یقین ہے کہ جو لڑکی یا عورت روپ متی کا پارٹ کرنے پر راضی ہو جائے گی وہ اس طبیعت کی نہ ہوگی کہ فلم ایکٹنگ کو اختیار کرنا درکنار، فلم دیکھنا بھی پسند کرے۔ روپ متی کا پارٹ تو صرف بہت ہی شریف گھرانے کی بہت ہی شریف عورت کر سکتی ہے اور کسی کو یہ پارٹ دیا گیا تو روپ متی کی ہر خوبی ایک عیب بن جائے گی۔

پروفیسر مجیب سچی اداکاری کے اصول سے بخوبی واقف تھے۔ اس زمانے میں جب اردو ڈرامے کی تنقید ابھی توانا نہیں ہوئی تھی، لوگ ڈراما کو معیوب اور دوسرے درجے کا ادب سمجھتے تھے، ڈرامے کی تنقید کا مطلب اس کے بارے میں صرف معلومات فراہم کرنا تھا لیکن مجیب صاحب نہ صرف اچھے اور برے ڈرامے پر گفتگو کر رہے تھے بلکہ اداکاری کے اصول پر بات کر رہے تھے۔ فلم کی اداکاری کو بناوٹی مانتے تھے اور ڈرامے یا اسٹیج کو سچی۔ شیو چرن کی زبانی سچی اداکاری کے بارے میں مجیب صاحب کے خیالات دیکھیں:

> شِو چرن: (جوش کے ساتھ) انھوں نے پہلے ایکٹ نہیں کیا ہے تو کوئی حرج نہیں، ایکٹنگ کا نیا اصول یہ ہے کہ بناوٹ بالکل نہ ہو، آدمی بس جیسا ہے ویسا ہی رہے، اسی طرح بولے، اسی طرح چلے پھرے۔ ہمارے لیے شاید یہ اچھا ہی ہوگا۔ اگر کنوارانی صاحبہ نے پہلے کسی ڈرامے میں حصہ نہیں لیا ہے۔ کیوں جیوتی پرکاش صاحب، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

ہندوستانی ڈرامے کے سفر پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ آزادی کے بعد بلکہ بہت دنوں کے بعد اس جانب توجہ دی جانے لگی لیکن پروفیسر مجیب نے اس سے کہیں پہلے نہ صرف توجہ دلائی بلکہ اسے کر کے دکھایا۔ اس ضمن میں اپنی بات کو ایک اور طریقے سے پیش کرتے ہوئے محمد مجیب مسز مہرہ کی زبانی بتاتے ہیں کہ اداکاری اور ایک کامیاب اور سچی اداکاری کے لیے کیا اصول ہو سکتے ہیں۔ جب مسز مہرہ سے کہا جاتا ہے کہ روپ متی کا کردار وہ کریں تو وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے سچی بات کہتی ہیں:

> مسز مہرا: مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ دل کی بات دل میں رکھوں اور لوگوں کو اس بارے میں عقلی گدے لگانے دوں کہ میرا اصل منشا کیا ہے۔ میرے دل سے یہ خیال بالکل نکل گیا تھا کہ مجھ سے روپ متی کا پارٹ کرنے کو کہا جا سکتا ہے۔ اب آپ لوگوں نے فرمائش کی ہے تو مجھے اس خیال کو دوبارہ دل میں آباد کرنا ہوگا۔ روزمرہ کی زندگی میں روپ متی کا انداز اختیار کرنا ہوگا۔ گویا اس کی

کوشش کرنا ہوگی کہ روپ متی بن جاؤں۔ اگر میں ایسا نہ کرسکی تو آپ سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ روپ متی کا پارٹ نہیں کرسکتی ہوں۔

کیلاش ناتھ: واہ صاحب، اس وقت تو آپ نے ایکٹنگ کا بنیادی اصول بڑی خوبی سے بیان کردیا ہے۔ اب تو مجھے اور بھی یقین ہوگیا ہے کہ روپ متی کا پارٹ آپ ہی کو ادا کرنا چاہیے۔

نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان میں ڈرامے کی صورت حال کم و بیش ایک جیسی ہی ہے۔ جب تک لڑکیاں کنواری ہوتی ہیں اس کے لیے اسکول اور کالج میں ادبی اور ثقافتی پروگراموں میں حصہ لینا نہ صرف قبول ہوتا ہے بلکہ بھائی باپ اسے اسٹیج پر دیکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کو موسیقی اور رقص کی تعلیم دلواتے ہیں۔ ان کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتے ہیں لیکن جیسے ہی اس کی شادی ہوجاتی ہے وہی بھائی شوہر کی شکل میں اپنی بیوی کو اسٹیج پر دیکھنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ اس کے درمیان کبھی سماجی رتبہ حائل ہوتا ہے تو کبھی سرکاری عہدہ۔ ایسے ہی ایک شوہر بیوی یعنی پورنما اور کیشو داس ہیں۔ پورنما اپنے اسکول اور کالج کے زمانے میں ڈرامے میں حصہ لیا کرتی تھی لیکن ایک سرکاری افسر کی بیوی ہونے کی وجہ سے اب وہ چاہتے ہوئے بھی اپنا شوق پورا نہیں کرسکتی۔ پروفیسر مجیب نے پورنما کی خواہش اور اس کی مجبوری کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

پورنما: مسز مہرا، آپ خفا نہ ہوں۔ اس میں کملا کا کوئی قصور نہیں ہے، آپ کا جب ٹیلیفون آیا تو میں نے صاحب سے ان کی رائے پوچھی کہ میں ڈرامے میں حصہ لوں یا نہ لوں۔ انھوں نے کہا کہ میں مجسٹریٹ ہوں اور یہ بالکل مناسب نہ ہوگا کہ تم ایک ڈرامے میں حصہ لو۔ ڈراما دیکھنے کے لیے ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ سرکاری ملازموں کو اپنی عزت کا بہت خیال رکھنا ہوتا ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو ناشتے کے وقت اسی لیے بلایا تھا کہ آپ صاحب سے ملیں اور وہ خود اپنی رائے آپ کو بتادیں۔

پورنما چاہتے ہوئے بھی اپنی بات اپنے شوہر سے نہیں کہہ پاتی۔اس پر اس کے مجسٹریٹ شوہر کا حکم چلتا ہے۔وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کملا اور مسز مہرہ کی مدد لیتی ہے کہ وہ اس کے شوہر کیشو داس سے بات کر کے اسے راضی کر لے کہ وہ ڈراما میں حصہ لے سکے۔اس سلسلے میں کیشو داس، مسز مہرا اور کملا کے درمیان ہونے والی گفتگو دیکھیں:

مسز مہرا:...... مجھے معلوم ہے کہ جب وہ کالج میں تھیں تو اکثر ڈراموں میں حصہ لیا کرتی تھیں اور یہ ڈراما کچھ ایسا مشکل نہیں ہے کہ وہ اس میں حصہ لیتے ہوئے گھبرائیں۔ اصل میں ہم کو ایک ایسی ہیروئن کی ضرورت ہے جس کے چہرے اور انداز سے شرافت اور تہذیب ظاہر ہوتی ہے، اور جس کی صورت شکل اور آواز بھی اچھی ہو۔جو ان شرطوں کو پورا کر سکے اس کے لیے ہیروئن کا پارٹ کرنا کچھ بہت مشکل نہ ہوگا۔

شو چرن: کیلاش ناتھ صاحب، آپ تو مسز کیشو داس کو مختلف ڈراموں میں ایکٹ کرتے دیکھ چکے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ روپ متی کے پارٹ کے لیے بہت ہی موزوں ہوں گی، جیوتی پرکاش صاحب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

کیشو داس: جی ہاں، آپ بے شک ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ پورنما ڈراموں میں حصہ لیا کرتی تھیں اور ان کی ایکٹنگ بہت پسند کی جاتی تھی۔ مجھے اس پر بالکل کوئی اعتراض نہیں کہ کالجوں میں ڈرامے کیے جائیں اور لڑکیاں ان میں حصہ لیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہندستان میں ایکٹنگ کے فن کو ترقی دینے کی بہت ضرورت ہے۔ یہ صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اچھے تعلیم یافتہ لوگ ڈراما لکھنے اور انھیں ایکٹ کرانے میں دلچسپی لیں۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ کے سامنے اپنی کچھ مجبوریاں بیان کروں۔

کملا: اچھا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم پورنما سے آپ کے دفتر میں ایکٹنگ کرائیں گے۔

کیشو داس: جی نہیں، میں یہ نہیں سمجھتا ہوں لیکن اگر آپ مجھے اجازت دیں تو آپ کو یہ بتادوں کہ میں سمجھتا کیا ہوں۔

کملا: یہ تو آپ دفتر میں دن بھر کرتے ہوں گے۔ یہاں پورنما کو بات کرنے کا موقع دے دیجیے، تو کیا حرج ہے۔

کیشو داس: (عاجز آکر) اونہہ آپ سے نپٹنا بڑا مشکل ہے۔ میں دفتر جاتا ہوں۔ مگر میں یہ آپ سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ پورنما آپ کے ڈرامے میں حصہ نہیں لے سکتی۔

سرکاری افسران کی مانند سماج کے عزت دار لوگوں کا بھی یہی رویہ ہے۔ وہ ڈراما یا تہذیبی وثقافتی سرگرمیوں کے لیے چندہ تو دے سکتے ہیں، انھیں منعقد کرنے میں اپنا پورا تعاون دینے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن جب ان کی ذاتی شمولیت کی باری آتی ہے تو معذرت چاہتے ہیں۔ ان کے گھر کی خواتین بازار تک تو جا سکتی ہیں لیکن ادبی، ثقافتی سرگرمیوں یا ڈراموں میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ پروفیسر مجیب نے ایسے ہی لوگوں کی نمائندگی کے لیے لالا رام رتن کا کردار تخلیق کیا ہے۔ ایسے لوگوں کو دوسروں کی بہو، بیٹی اور بیوی کو اسٹیج پر دیکھنے میں لطف آتا ہے لیکن جب اپنے گھر کی خواتین کی باری آتی ہے تو انھیں یہ گوارہ نہیں ہوتا۔ لالا جی کی بیوی کو بھی ڈرامے کا شوق ہے اور وہ کملا سے اس میں حصہ لینے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ کملا اور ان کے ساتھی جب لالا جی سے بات کرتے ہیں تو لالا جی کو سخت اعتراض ہوتا ہے۔ پروفیسر مجیب کے الفاظ میں ان کرداروں کے خیالات دیکھیں:

کملا: نرملا کہتی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اسے ایک ڈرامے میں پارٹ کرتے دیکھا تھا۔

رام رتن: (کھسیانی ہنسی ہنس کر) ہاں بچی بات تو یہی ہے، مگر جو بات اس سے اچھی لگتی تھی وہ اب نہیں لگتی۔ دوسرے کی لڑکی اسٹیج پر دیکھنے اور اپنی استری کو دیکھنے اور دکھانے میں بڑا فرق ہے۔

کملا: نرملا گھر میں بہت خوش ہے۔ آپ اسے اسٹیج پر ہیروئن کا پارٹ کرتے دیکھیں گے اور گھر آ کر اس کی تعریف کریں گے تو اور خوش رہا کرے گی۔

رام رتن: جی ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر صاحب ہماری طبیعت نہیں مانتی۔

(کملا اٹھ کر دروازے کے پاس جاتی ہے اور نرملا کو پکار کر وہیں اس کا انتظار کرتی ہے)

سروپ چند: ارے لالا جی، آپ ہماری بات نہیں سمجھے۔ ہم ایک بہت اچھا سماجی اور اخلاقی ڈراما کرنا چاہتے ہیں جسے جیوتی پرکاش صاحب یہ جو یہاں بیٹھے ہیں، انھوں نے لکھا ہے۔ ہمیں ہیروئن کا پارٹ کرنے کے لیے نرملا کی ضرورت ہے۔ آپ مان جایئے۔ آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آپ بھی بہت خوش ہوں گے اور نرملا دیوی بھی۔

رام رتن: یہ تو سب ٹھیک ہے۔ مگر صاحب میری طبیعت نہیں مانتی۔

(اس دوران میں نرملا آ گئی ہے۔ کملا اس کے پھوڑے پکڑ کر دیوار سے اڑا دیتی ہے۔ اور دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی ہے۔)

کملا: اری نرملا، تو بھی بتا تو کیا چاہتی ہے۔

نرملا: میں تو جو پارٹ دیا جائے کرنے کو تیار ہوں۔ تم جانتی ہو مجھے ڈرامے کا کتنا شوق ہے۔

کملا: پھر تو لالا جی سے کہتی کیوں نہیں ہے؟

نرملا: کہو تم لوگ، میں نہیں کہتی۔

کملا: ہم تو کہہ رہے ہیں، لیکن وہ نہ راضی ہوئے تو؟

(اس کا جواب نرملا آنکھوں سے دیتی ہے جو اس کی بے بسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ کملا اسے چھوڑ کر اپنی جگہ واپس آ جاتی ہے۔ نرملا گھر کے اندر چلی جاتی ہے)

مسز مہرا: لالا جی، آپ یہ بات کیسے کہتے ہیں۔ اب عورتوں کو بندر رکھنے کا رواج نہیں رہا۔

رام رتن: جی ہمارے یہاں بندر رکھنے کا رواج بالکل نہیں ہے۔ استریاں سب

بازار جاتی ہیں، سیر تماشے میں جاتی ہیں، آزادی کے ساتھ سب سے ملتی جلتی ہیں۔

کملا: ہماری درخواست ہے کہ ڈوری کو ذرا اور ڈھیل دے دیجیے۔ جس سے نرملا ڈرامے میں حصہ لے سکے۔

(رام رتن کوئی جواب نہیں دیتا۔ صرف اس کے چہرے سے کسی قدر نا گواری ظاہر ہوتی ہے۔ اسی دوران میں نرملا دروازے کے پاس آتی ہے اور اشارے سے کملا کو اندر بلاتی ہے۔ کملا لپک کر اندر جاتی ہے اور تھوڑی دیر میں کشتیوں میں کھانے کا سامان لاکر رام رتن کے سامنے سجانا شروع کر دیتی ہیں۔ جب سامان لگ جاتا ہے رام رتن پلیٹوں میں مٹھائیاں رکھنا شروع کر دیتا ہے اور نرملا اور کملا سب کو پلیٹیں دیتی ہیں۔)

رام رتن: (سروپ چند سے) اور سنایئے لالا جی کیا خبر ہے۔

سروپ چند: ارے صاحب، خبریں بہت سی ہیں، آپ سے معاملے بھی بہت سے رہتے ہیں۔ اس سے تو یہی بات ذہن پر سوار ہے کہ ڈرامے کے لیے ہیروئن تلاش کی جائے۔

کملا: لالا جی، آپ نے جو جواب دیا ہے وہ نرملا سے مشورہ کر کے دیا ہے یا اپنی طرف سے دے دیا۔

رام رتن: (ذرا تامل کے بعد) یہ تو ایسا صاف معاملہ ہے کہ اس میں مشورہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

کملا: مگر مجھے یقین ہے کہ نرملا کا بہت جی چاہتا ہوگا کہ ڈرامے میں حصہ لے، آپ نہ مانتے ہوں تو اس سے پوچھ لیجیے۔ آپ کے سامنے کھڑی ہے۔

رام رتن: (دوسری طرف منہ پھیر کر) جی یہ باتیں اس طرح نہیں پوچھی جاتی ہیں۔

کملا: تو انھیں اس طرح طے بھی نہیں کر دینا چاہیے۔ یہ اصول کی باتیں ہیں، لڑکی چار پانچ برس کی ہوتی ہے تو ماں باپ چاہتے ہیں کہ ناچنا گانا سیکھے اور اس میں کامیاب ہوتی ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ لڑکی کی شادی ہوگئی تو یہ

سب چیزیں بند کردی جاتی ہیں اور ردی فلم دیکھنے کے سوا اسے اور کسی تسکین کا موقع نہیں ملتا۔ یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے۔

ان مکالموں سے ایک جانب سماج کے ٹھیکہ داروں کے خیالات کا علم ہوتا ہے تو دوسری جانب عورتوں کی خواہشات کا گلا کس طرح گھونٹا جاتا رہا ہے اس جانب بھی اشارہ ملتا ہے۔ سماج اور تہذیب کے ٹھیکہ داروں کی اجارہ داری اور اس کی ذہنیت پر بھی پروفیسر مجیب نے کھل کر روشنی ڈالی ہے۔ اس دور میں فن کی صورت حال اور اس کی بگڑتی صورت حال کی فکر مجیب صاحب کو تھی۔ ریڈیو اور فلموں کے عروج کو ایک جانب مستحسن سمجھتے تو دوسری جانب LIVE PERFORMANCE کے گرتے معیار کے لیے بھی فکر مند تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس گرتے معیار کی مکمل طور پر نہیں تو کچھ ذمہ داری تو ان پر عائد ہوتی ہی ہے۔ سماجی اقدار اور زمانے کے بدلتے مزاج کو محسوس کریں اور اس جانب توجہ کرتے ہوئے شخصیت پرستی کو چھوڑ کر مثبت اصول کو بڑھاوا دیں۔ اس جانب مسز مہرا کی زبانی پروفیسر مجیب اشارہ کرتے ہیں:

مسز مہرا: کنورانی صاحبہ! اصل بات یہ ہے کہ ہم سب محسوس کرتے ہیں کہ ہماری زندگی بالکل خالی ہوتی جارہی ہے۔ زندگی میں SUBSTANCE پیدا ہوتا ہے VALUES سے اور ہمارے VALUES سب غائب ہوتے جارہے ہیں۔ پالیٹکس اور پبلک لائف کی جو حالت ہے وہ میں آپ کو کیا بتاؤں، آپ خود مجھ سے بہت بہتر جانتی ہیں۔ آرٹ کی صورت ریڈیو اور فلم نے ایسی بگاڑی ہے کہ اب شاید ہی کبھی درست ہو سکے۔ خاندانی لوگوں کو ہماری تعلیم نے برباد کردیا ہے۔ ہم چاہیں تو زمانے کی رو میں جیسے بہتے ہیں ویسے ہی بہتے رہیں۔ گرداب سے بچنے اور کسی کنارے تک پہنچنے یا کسی ٹھکانے لگنے کا خیال چھوڑ دیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے اور تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو پھر صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہم PERSONALITY کے CONCEPTION کو اپنے دماغوں میں

صاف کریں اور ایسی PERSONALITIES کے نمونے تیار کریں جوان VALUES کو EMBODY کرتے ہوں، جنھیں ہم اپنے سماج میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

پیش کیے گئے مکالموں کو ہی اگر دیکھیں تو ہمیں پروفیسر مجیب کی کردار نگاری بہتر نظر آتی ہے۔ کردار کی بڑی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں ارتقا ہو اور اس ڈرامے کے بیشتر کردار میں ارتقا پایا جاتا ہے۔ ڈرامے کے شروع میں وہ جیسے نظر آتے ہیں آخر میں مختلف نہیں تو اس کی کئی پرتیں کھلتی دکھائی دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر مسز مہرا، کملا، شیو چرن، لالا رام رتن، سروپ چند، جیوتی پرکاش وغیرہ کے کردار کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ مکالمے ان کرداروں کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ مکالموں کی زبان کردار کی مناسبت سے استعمال کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکالمے کردار کی شناخت ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً شیو چرن کا ہر بات کے آخر میں یہ کہنا کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا، یا پھر کملا کے مکالمے۔ اگر ان مکالموں سے کرداروں کے نام ہٹا دیے جائیں تو بھی بتایا جاسکتا ہے کہ یہ کس کے مکالمے ہوسکتے ہیں۔

ڈراما 'ہیروئن کی تلاش' سماج کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ڈرامے کی کامیاب تنقید بھی ہے۔ گویا طنز و مزاح کے پیرائے میں محمد مجیب نے نہ صرف ایک کامیاب ڈراما تخلیق کیا ہے بلکہ فن ڈراما کے بہت سے پہلو پر مثبت اور کامیاب تنقید کے نمونے بھی چھوڑے ہیں۔ اس دور کے سماجی اقدار اور مزاج کو کامیابی سے پیش کیا ہے تو شرفا کی ذہنیت کو منظر عام پر لایا ہے۔ گویا یہ ڈراما نہ صرف اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے بلکہ اردو ڈرامے کی تنقید کا ایک اہم باب بھی ہے اس لیے اردو ڈرامے کی تاریخ میں اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری شام:

ازدواجی زندگی کے مسائل پر مشتمل ڈراما 'دوسری شام' دو ایکٹ میں لکھا گیا ایک سماجی اور اصلاحی ڈراما ہے۔ 1954 میں لکھے گئے دس کرداروں پر مشتمل اس ڈرامے کا تانا بانا کچھ اس طرح تیار کیا گیا ہے:

ڈراما 'دوسری شام' کا مرکزی کردار چودھری ایک آرٹسٹ ہے۔ چودھری کی بیوی ننھی کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ چودھری کے فن کو سمجھ سکے یا فنکار کے احساسات کی قدر کر سکے۔ لیکن وہ اپنے شوہر کو دیوتا سمجھتی ہے۔ دوسری جانب چودھری ننھی کے خلوص اور اس کی محبت کی قدر نہیں کرتا اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چودھری کی زندگی میں 35 برس کی ایک شادی شدہ خاتون 'شاما' داخل ہوتی ہے، جو آرٹ اور اس کی خوبیوں سے بخوبی واقف ہے اور چودھری کے فن کی قدر داں ہے۔ وہ چودھری کے رہن سہن اور زندگی کا معیار ایسا نہیں پاتی جیسا ایک عظیم فنکار کا ہونا چاہیے۔ شاما پہلی فرصت میں چودھری کے کمرے کی صورت بدل دیتی ہے، ضروری ساز و سامان خرید کر قرینے سے آراستہ کرتی ہے لیکن اس کی یہ تمام کوششیں ناکام ثابت ہوتی ہیں، اس کے سپنے پورے نہیں ہوتے۔ ان تمام چیزوں کو چودھری اپنی آزاد طبیعت کے منافی، تمام عنایتوں کو پاؤں کی زنجیر اور ایک عورت کی غلامی سمجھ کر اس زندگی کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہتا ہے:

> چودھری: (مسکراتے ہوئے بے پروائی سے) کچھ نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم وحشت کے اس دور سے گزر گئے ہیں۔ جب گھربار عورت کا ہوا کرتا تھا اور وہ مرد کو محبت کی مشق کرنے کے لیے پالتی تھی۔ لیکن اصل میں ہم اسی حالت میں ہیں۔ مرد ابھی تک عورت کی ملکیت ہے، اگر وہ آزاد ہونا چاہے تو عورت فوراً زہر کھانے پر تیار ہو جاتی ہے۔ —

جذبات کے اسی سیلاب میں گھر سے نکل جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ اچانک ننھی سامنے آجاتی ہے اور ہاتھ جوڑ کر قدموں پر گر پڑتی ہے۔ چودھری حیران و پریشان

کھڑا رہ جاتا ہے۔ پھر لڑکھڑاتا ہوا واپس مڑتا ہے۔ یہیں پر ڈراما ختم ہو جاتا ہے۔

اس ڈرامے کے ذریعے پروفیسر مجیب نے ایک اہم سماجی مسائل کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ایک فنکار کی ذہنیت، اس کا مزاج اور اس کی فکر کو کامیابی سے دکھایا ہے۔ ایک فنکار دنیاوی اور مصنوعی چمک دمک اور آرام و آسائش سے دور ایک خیالی دنیا میں گم رہتا ہے جو اس کی تخلیق اور ذہنی سکون کا ضامن ہوتا ہے۔ ڈراما نگار اس ڈرامے کے ذریعے ہمیں مصوری کے اصول، اس کی باریکی اور رنگوں کی اہمیت کا بھی احساس دلاتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کا ذہن اس قدر مغرب زدہ ہو گیا ہے کہ ہمیں اپنی چیزوں اور فن میں خوبی نہیں دکھائی دیتی، اس کے مقابلے باہر کی کم تر اور غیر معیاری چیزیں اور فن کو ہم اہمیت دیتے ہیں۔ ڈراما نگار نے رام کمار کے کردار کے ذریعے نہ صرف مصوری کے فن کی باریکیوں کو بتایا ہے بلکہ ہندوستانی مصوری کی اہمیت اور فنکاری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ رام کمار اور چودھری کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کرداروں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک حصہ دیکھیں:

رام کمار: جی ہاں، ضرور دکھائیے۔ میں تو اسی لیے حاضر ہوا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ مجھ میں مصوری کی کچھ سمجھ آ جائے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو کچھ ایسی تصویریں بھی دکھا دیجئے جو آپ مکمل نہ کر سکے ہوں یا جنھیں آپ نے رجکٹ (Reject) کر دیا ہو۔ اور اس کی وجہ بھی بیان کر دیجئے۔ (چودھری کپ بورڈ کھولتا ہے اور اس میں سے تصویریں چن چن کر نکالتا ہے۔) آپ ائل (Oil) ہی میں کام کرتے ہیں یا پنسل، چاک اور واٹر کلر میں بھی مشق کرتے ہیں؟

چودھری: واٹر کلر تو میں نے قریب قریب چھوڑ دیا ہے۔ اس میں وہ شدت، وہ Intensity پیدا نہیں ہوتی جو میں چاہتا ہوں۔ پنسل اور چاک کا ایک اور البم آپ کو دکھاؤں گا، مگر اصل بات یہ ہے کہ جب ائل کلرز کی ریچ نس (Richness) کی عادت ہو جائے تو اور کوئی میڈیم (Medium) جی پر نہیں پڑتا۔

رام کمار: یہ آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ مگر پنسل ڈرائنگ کی سادگی اور صفائی، اس کی Directness اوئل کلرز میں نہیں آتی۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ بیشتر کام اوئلز (Oils) میں کریں تب بھی پنسل اور چاک میں مشق جاری رکھیں۔ وہ آپ کے لیے ایک طرح کی ڈسپلن بھی ہو جائے گی۔ (چودھری نے دس بارہ تصویریں منتخب کر لی ہیں اور دو البم بھی نکال لیے ہیں۔ وہ ایزل پر سے نامکمل تصویر ہٹا کر ایک بنی ہوئی تصویر لگا دیتا ہے۔ رام کمار پیچھے ہٹ کر سٹی کے کونے پر بیٹھ جاتا ہے اور تصویر کو غور سے دیکھتا ہے) خوب، رنگ بھی خوب جاگتے ہوئے ہیں اور کومپوزیشن (Composition) بھی بہت لطیف ہے مگر اس کا اسٹائل مجھے ٹریزیشنل (Transitional) سا معلوم ہوتا۔ آپ ایک طرز کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف جا رہے ہیں۔ اب ذرا اس کے سال دو سال بعد کی کوئی تصویر دکھایئے گا۔ (چودھری تصویروں میں سے ایک چھانٹ کر ایزل پر رکھتا ہے)۔ دیکھئے میں ٹھیک کہہ رہا تھا نا؟ آپ امپریشنزم (impressionism) کو چھوڑ کر ایک خاص وضع کی ریلزم (Realism) کی طرف آ گئے ہیں۔ (جیب سے سگریٹ کیس نکالتا ہے اور چودھری کو پیش کرتا ہے۔ پھر لائٹر سے دونوں کے سگریٹ جلاتا ہے) اچھا، یہ تو بتایئے، ہمارے یہاں کا امپریشنسٹک (Impressionistic) آرٹ خالی یورپی مصوری کی نقل ہے یا اس میں کچھ جان بھی ہے۔

چودھری: (ایزل پر ایک تصویر رکھتے ہوئے) میرے خیال میں دونوں باتیں ہیں۔ ہر آرٹسٹ ایک دور سے گزرتا ہے جب اسے موجود اور معلوم شکلوں کی پابندی ناگوار ہوتی ہے۔ یورپ میں امپریشنزم (Impressionism) کا دور ریلزم (Realism) کے بعد آیا، ہم ممکن ہے امپریشنزم

(Impressionism) سے گزر کر اپنی خاص ریلزم کی طرف جائیں یا
کوئی اور طرز اختیار کریں۔ میں دوسروں کے بارے میں کیا کہوں جب
خود اپنے بارے میں یقین نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میری طبیعت مجھے
کدھر لے جائے گی۔ مگر میں کسی 'ازم' کی، کسی نام اور کسی فلسفے کی پابندی
نہیں چاہتا۔

رام کمار: بالکل ٹھیک ہے۔ اور میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آپ میں آزاد
رہنے کی صلاحیت ہے۔ میں ابھی پیرس میں تھا اور وہاں موزوں آرٹ کی
چند اکزی بشن (Exhibition) دیکھنے گیا۔ مجھے وہاں کوئی ایسی تصویر
نظر آتی جیسی کہ آپ نے دکھائی ہے تو میرا جانا وصول ہو جاتا۔

ڈراما 'دوسری شام' کے کرداروں پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں موجود ہر کردار اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ موجود ہے۔ چودھری، رام کمار اور وکیل کے اندر انسانی خوبی اور خامی مختلف اور مکمل صورت میں موجود ہے۔ تو ننھی، شاما، شکنتلا اور مینا کے اندر عورت کے مختلف روپ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک اپنے شوہر پر نچھاور ہونا جانتی ہے تو دوسری اس کی فنکاری کو پہچاننا اور اسے نکھارنا اور کامیاب بنانا چاہتی ہے۔ ایک جانب شکنتلا اپنے دوست کے فن کو عالمی سطح پر دیکھنا چاہتی ہے تو دوسری طرف ایک کامیاب فنکار کے ساتھ ساتھ اس کے گھریلو زندگی میں بھی سکون کی متمنی ہے۔ اس طرح پروفیسر مجیب نے کردار کو خلق کرتے وقت انسانی خوبی اور اس کی کمزوریوں کو ذہن میں رکھا ہے۔ کیوں کہ انھیں معلوم ہے:

چودھری: (اپنے خیال میں) انسان کی شخصیت مصوری کے قابو میں نہیں آتی، اور وہی
اصل چیز ہے۔ اس میں صرف احساسات بیان ہو سکتے ہیں، تعلقات بیان
نہیں ہو سکتے۔ یہ انسان کو اکیلا کر دیتی ہے...... انسان، جسے ویسے بھی کوئی
نہیں ملتا جس کا ہاتھ وہ پکڑ سکے۔

پروفیسر مجیب کے اس ڈرامے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں نفسیات کا خاصا علم تھا۔ انھوں نے کردار کو پیش کرتے ہوئے اس کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کے کرداروں کے درمیان ہونے والی گفتگو پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف موضوع پر بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنی فکر اور انسانی نفسیات کو پیش کر رہے ہیں۔ ایسا ہی کردار اس ڈرامے میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر چودھری کی گفتگو کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیکھیں:

> چودھری: (مسکراتے ہوئے بے پروائی سے) کچھ نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم وحشت کے اس دور سے گزر گئے ہیں۔ جب گھر بار عورت کا ہوا کرتا تھا اور وہ مرد کو محبت کی مشق کرنے کے لیے پالتی تھی۔ لیکن اصل میں ہم اسی حالت میں ہیں۔ مرد ابھی تک عورت کی ملکیت ہے، اگر وہ آزاد ہونا چاہے تو عورت فوراً زہر کھانے پر تیار ہو جاتی ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'دوسری شام' مکمل طور پر سماجی ڈراما ہے جس میں یوں تو تین کردار سرگرم نظر آتے ہیں لیکن اس کے علاوہ سماج کے مختلف طبقوں کے ساتھ اور کردار ہیں جن کی مدد سے ڈراما نگار نے نہایت کامیابی سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ازدواجی زندگی اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب شوہر اور بیوی میں مکمل ہم آہنگی ہو، دونوں ایک دوسرے کو سمجھیں اور اس کا لحاظ رکھیں، ایک دوسرے کے خیالات اور جذبات کا احترام کریں۔ دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو چلائیں اور راہ کی مشکلات اور رکاوٹوں کو ایک جان ہو کر دور کریں۔ سماج میں بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو انھیں مشورہ دینے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن ازدواجی زندگی میں صرف شوہر اور بیوی ہی ایک دوسرے کو بہتر طور پر Judge کر سکتے ہیں اور مختلف مواقع پر خود ہی فیصلہ لینا ہوتا ہے، ایک دوسرے کی کمیوں کو دور اور خوبیوں کو اجاگر کرنے میں مدد کر سکتے ہیں۔

آزمائش:

پہلی جنگ آزادی جن حالات میں اور حب الوطنی کے جس سچے جذبے کے ساتھ لڑی گئی جس میں تمام فرقوں اور طبقوں نے بلاتفریق مذہب وملت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس کی حیثیت آج ایک خواب کی سی رہ گئی ہے۔ اس جنگ میں ادنیٰ واعلیٰ کی تفریق کو بالائے طاق رکھ کر عوام ایک ہی صف میں محمود و ایاز کی طرح کھڑے نظر آئے۔ ان حالات کو پیش کرنے کی غرض سے پروفیسر محمد مجیب نے 1857 کے اس تاریخی واقعے کی صد سالہ تقریبات کے موقعے پر 1957 میں ڈراما 'آزمائش' لکھا۔ یہ ڈراما چار ایکٹ پانچ مناظر اور 34 کرداروں پر مبنی ہے۔ اس ڈرامے کی اہمیت کے مدنظر ڈراما نگار محمد مجیب نے پہلے اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ جو جنوری 1957 میں آرڈیل (Ordeal) کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا اردو ایڈیشن جولائی 1957 میں شائع کیا گیا اور پھر جب یہ ڈراما آڈیٹوریم میں کھیلا گیا تو لوگوں نے محسوس کیا کہ 1857 کا واقعہ ابھی اسی وقت پیش آیا ہے جس کا تاثر بہت دنوں تک لوگوں کے ذہن میں قائم رہا۔ ڈراما 'خانہ جنگی' کے 1958 میں شائع شدہ ایڈیشن کے آخری صفحے پر ڈراما 'آزمائش' سے متعلق شائع شدہ اشتہار یوں ہے:

> (1857ء کی جنگ آزادی سے متعلق دلچسپ ڈراما)
>
> اس جنگ آزادی کو بعض مورخین نے 'غدر' کا نام دیا تھا۔ لیکن اس غدر کی اصل نوعیت کیا تھی؟ یہ آپ کو اس ڈرامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوگی۔

ڈراما 'آزمائش' کا تانا بانا کچھ اس طرح بنا گیا ہے کہ کچھ ہندوستانی نسل کے فوجی انگریزی فوج سے بغاوت کرکے بہادر شاہ ظفر کو اپنا سرپرست بنا کر انگریزوں سے لڑنے کے لیے دہلی آجاتے ہیں۔ پہلے تو بہادر شاہ ظفر اپنی لاچاری اور مجبوری ظاہر کرتے ہیں لیکن جب ان لوگوں کا اصرار بڑھتا ہے تو سرپرستی قبول کر لیتے ہیں۔ لڑائی شروع ہوتی ہے تو شہر میں افراتفری اور لاقانونیت پھیل جاتی ہے۔ ہر طرف شرپسند لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ جنرل بخت خان کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر اس جنگ کو ایک منظم جنگ آزادی کی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں جس میں انھیں طرح

طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف وہ شرپسندوں کی لوٹ مار کو روک کر شہر کے اندر قانون بحال کرنے اور ضروری اشیا کی قلت کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو دوسری جانب فوج کی رسد اور اسلحہ وغیرہ کے لیے فنڈ کی فراہمی اور نئے بھرتی کیے گئے سپاہیوں کی ٹریننگ کا انتظام کرتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں جو جذبہ قومی وملی سے سرشار جوق در جوق جہاد میں شامل ہونے کے لیے آتے ہیں کیونکہ ان میں بہت سے کمزور، غیر مسلح اور فنون جنگ سے ناواقف ہیں لہٰذا وہ کسی مورچے پر پہنچ کر لڑنے کے بجائے لڑنے والوں کے لیے مصیبت بن سکتے ہیں۔

دراصل اس وقت ہر طبقے میں وطن پر نثار ہونے کا جذبہ اپنے عروج پر تھا۔ وہ مرد ہوں یا عورتیں، اعلیٰ طبقے کے لوگ ہوں یا نچلے طبقے کے، یہاں تک کہ بچے بھی وطن پر جان نثار کرنے کے لیے بے چین دکھائی دیتے ہیں۔ مردوں کی قیادت وہ لوگ کرتے ہیں جو مختلف مورچوں پر اپنی مرضی سے جوق در جوق پہنچ رہے ہیں اور جنھیں روکنا مشکل ہو رہا ہے۔ عورتوں کی قیادت منی بائی، سلمیٰ، بھاگوتی اور رانی کشن کنور باقاعدہ جنگ میں حصہ لے کر کرتی ہیں تو نچلے طبقے کی قیادت کہاروں کا وہ گروہ کرتا ہے جو گھات لگا کر صرف لاٹھیوں سے ہی انگریز فوج کی ایک ٹکڑی پر ٹوٹ پڑتا ہے اور بھاری جانی نقصان کے باوجود انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بچوں کی قیادت مدرسے کے وہ طالب علم کرتے ہیں جو بچھڑا پلٹن بنا کر آگے آگے کودتے ہیں اور جن کے لیے اس وقت موت بھی بازیچۂ اطفال ہوگئی ہے۔ لیکن اس جنگ آزادی میں شریک ہونے والے سپاہیوں کی بڑی تعداد غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم ہونے، رسد اور اسلحے کی کمی، شہر میں لاقانونیت اور اسی قسم کی دوسری بہت سی وجوہات کی بنا پر بخت خان اور ان کے ساتھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ ہندوستانی سپاہی کو ہر مورچے پر شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لیتے ہیں جہاں سے انھیں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور ہندوستان پوری طرح انگریزوں کے قبضے میں آ جاتا ہے۔

جب ہم ڈرامے کے پلاٹ پر بغور نظر ڈالتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ 1857 کے واقعے کی گونج محسوس ہوتی ہے بلکہ ڈرامے کے فن پر کھرا اترتا ہے پلاٹ بحیثیت مجموعی چست اور ابتدا وسط اور انجام کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

آزمائش:

پہلی جنگ آزادی جن حالات میں اور حب الوطنی کے جس سچے جذبے کے ساتھ لڑی گئی جس میں تمام فرقوں اور طبقوں نے بلاتفریق مذہب وملت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس کی حیثیت آج ایک خواب کی سی رہ گئی ہے۔ اس جنگ میں ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق کو بالائے طاق رکھ کر عوام ایک ہی صف میں محمود ایاز کی طرح کھڑے نظر آئے۔ ان حالات کو پیش کرنے کی غرض سے پروفیسر محمد مجیب نے 1857 کے اس تاریخی واقعے کی صد سالہ تقریبات کے موقعے پر 1957 میں ڈراما 'آزمائش' لکھا۔ یہ ڈراما چار ایکٹ پانچ مناظر اور 34 کرداروں پر مبنی ہے۔ اس ڈرامے کی اہمیت کے مدنظر ڈراما نگار محمد مجیب نے پہلے اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ جو جنوری 1957 میں آرڈیل (Ordeal) کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا اردو ایڈیشن جولائی 1957 میں شائع کیا گیا اور پھر جب یہ ڈراما آڈیٹوریم میں کھیلا گیا تو لوگوں نے محسوس کیا کہ 1857 کا واقعہ ابھی اسی وقت پیش آیا ہے جس کا تاثر بہت دنوں تک لوگوں کے ذہن میں قائم رہا۔ ڈراما 'خانہ جنگی' کے 1958 میں شائع شدہ ایڈیشن کے آخری صفحے پر ڈراما 'آزمائش' سے متعلق شائع شدہ اشتہار یوں ہے:

(1857ء کی جنگ آزادی سے متعلق دلچسپ ڈراما)

اس جنگ آزادی کو بعض مورخین نے 'غدر' کا نام دیا تھا۔ لیکن اس غدر کی اصل نوعیت کیا تھی؟ یہ آپ کو اس ڈرامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوگی۔

ڈراما 'آزمائش' کا تانا بانا کچھ اس طرح بنا گیا ہے کہ کچھ ہندوستانی نسل کے فوجی انگریزی فوج سے بغاوت کر کے بہادر شاہ ظفر کو اپنا سرپرست بنا کر انگریزوں سے لڑنے کے لیے دہلی آجاتے ہیں۔ پہلے تو بہادر شاہ ظفر اپنی لاچاری اور مجبوری ظاہر کرتے ہیں لیکن جب ان لوگوں کا اصرار بڑھتا ہے تو سرپرستی قبول کر لیتے ہیں۔ لڑائی شروع ہوتی ہے تو شہر میں افراتفری اور لاقانونیت پھیل جاتی ہے۔ ہر طرف شرپسند لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ جنرل بخت خان کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر اس جنگ کو ایک منظم جنگ آزادی کی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں جس میں انھیں طرح

طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایک طرف وہ شرپسندوں کی لوٹ مار کو روک کر شہر کے اندر قانون بحال کرنے اور ضروری اشیا کی قلت کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو دوسری جانب فوج کی رسد اور اسلحہ وغیرہ کے لیے فنڈ کی فراہمی اور نئے بھرتی کیے گئے سپاہیوں کی ٹریننگ کا انتظام کرتے ہیں۔ پھران لوگوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں جو جذبہ قومی وملی سے سرشار جوق در جوق جہاد میں شامل ہونے کے لیے آتے ہیں کیونکہ ان میں بہت سے کمزور، غیر مسلح اور فنون جنگ سے ناواقف ہیں لہٰذا وہ کسی مورچے پر پہنچ کر لڑنے کے بجائے لڑنے والوں کے لیے مصیبت بن سکتے ہیں۔

دراصل اس وقت ہر طبقے میں وطن پر نثار ہونے کا جذبہ اپنے عروج پر تھا۔ وہ مرد ہوں یا عورتیں، اعلیٰ طبقے کے لوگ ہوں یا نچلے طبقے کے، یہاں تک کہ بچے بھی وطن پر جان نثار کرنے کے لیے بے چین دکھائی دیتے ہیں۔ مردوں کی قیادت وہ لوگ کرتے ہیں جو مختلف مورچوں پر اپنی مرضی سے جوق در جوق پہنچ رہے ہیں اور جنھیں روکنا مشکل ہو رہا ہے۔ عورتوں کی قیادت منی بائی، سلمیٰ، بھاگوتی اور رانی کشن کنور باقاعدہ جنگ میں حصہ لے کر کرتی ہیں تو نچلے طبقے کی قیادت کہاروں کا وہ گروہ کرتا ہے جو گھات لگا کر صرف لاٹھیوں سے ہی انگریز فوج کی ایک ٹکڑی پر ٹوٹ پڑتا ہے اور بھاری جانی نقصان کے باوجود انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بچوں کی قیادت مدرسے کے وہ طالب علم کرتے ہیں جو بچھڑا پلٹن بنا کر آگے آگے کودتے ہیں اور جن کے لیے اس وقت موت بھی بازیچۂ اطفال ہو گئی ہے۔ لیکن اس جنگ آزادی میں شریک ہونے والے سپاہیوں کی بڑی تعداد غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم ہونے، رسد اور اسلحے کی کمی، شہر میں لاقانونیت اور اسی قسم کی دوسری بہت سی وجوہات کی بنا پر بخت خان اور ان کے ساتھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ ہندوستانی سپاہی کو ہر مورچے پر شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لیتے ہیں جہاں سے انھیں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور ہندوستان پوری طرح انگریزوں کے قبضے میں آجاتا ہے۔

جب ہم ڈرامے کے پلاٹ پر بغور نظر ڈالتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ 1857 کے واقعے کی گونج محسوس ہوتی ہے بلکہ ڈرامے کے فن پر کھرا اترتا ہے پلاٹ بحیثیت مجموعی چست اور ابتدا وسط اور انجام کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

پروفیسر محمد مجیب کا یہ آخری ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں ڈراما نگار نے اپنے فن کا مکمل مظاہرہ کیا ہے۔ یہ ڈرامانہ صرف جدید اردو ڈرامے بلکہ ہندوستانی ڈرامے کے سفر میں اہمیت کا حامل ہے۔ پارسی تھیٹر کے بعد جو ڈرامے لکھے گئے ان میں سے زیادہ تر ڈرامے اسٹیج نہیں کیے جا سکے۔ ڈراما آزمائش، ڈرامے کے فن اور اسٹیج کی ضروریات دونوں پر کھرا اترتا ہے۔ کردار جتنے بھی ہیں سب اپنے اپنے طور پر سرگرم نظر آتے ہیں۔ رام سہائے مل، بلبھ گڑھ کے راجا نہار سنگھ، کوتوال شہر رجب علی، محمد یوسف، حکیم احسن اللہ خاں اور سدھاری سنگھ کے ساتھ ساتھ مدرسے کے طالب علم اور کہارتک کے کردار کو اس فنکاری سے ڈھالا گیا ہے کہ ان پر غیر فطری ہونے کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام کردار نہ صرف ہندوستان میں موجود مختلف طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ مختلف رنگ اور نسل کے ساتھ ساتھ مختلف مذاہب کے بھی نمائندہ نظر آتے ہیں۔ زنانہ کرداروں میں منی (ناچنے گانے والی)، سلمٰی (محمد یوسف کی منگیتر اور احسان اللہ خاں کی صاحبزادی) کے ساتھ ساتھ بھاگوتی (رام سہائے کی بیوی) اور رانی کشن کنور کے کردار بہت اہم ہیں۔ یہ تینوں ہی عورتیں الگ الگ طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود ملک پر قربان ہونے کا یکساں جذبہ رکھتی ہیں اور اپنی بساط کے مطابق بھرپور تعاون کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جان تک قربان کردیتی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر اسٹیج پر نظر نہیں آتے لیکن دوسرے کرداروں کے مکالموں کے ذریعے ان کا بھی سراپا واضح اور روشن نظر آتا ہے۔ ہر کردار اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ ہر منظر میں بتدریج ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ڈرامے کے مکالمے کردار کی مناسبت سے لکھے گئے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ڈرامے کی زبان کا تعین کرداروں کے مکالموں سے کیا جاتا ہے نہ کہ اس کے رسم الخط سے۔ اس لیے یہاں کرداروں کی مناسبت سے مکالمے چھوٹے بڑے، ثقیل اور آسان اردو میں موجود ہیں، جس کی مدد سے نہ صرف ڈرامے کا پلاٹ آگے بڑھتا ہے بلکہ کردار کی خوبیاں خامیاں اور اس کی فکر کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ بہت سے واقعات مناظر کے ذریعہ پیش تو نہیں کیے گئے ہیں لیکن کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ اس طرح بیان کردیے گئے ہیں کہ پورا واقعہ سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً جب لٹیرے احسن اللہ کے گھر میں گھس کر ان کی بیٹی سلمٰی، محمد یوسف اور رجب علی کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور سدھاری سنگھ وہاں آتا ہے تو اس موقع پر سدھاری سنگھ کا یہ مکالمہ دیکھیں:

سدھاری سنگھ: میں بہت معافی چاہتا ہوں کہ ان لٹیروں نے آپ کو اتنی تکلیف پہنچائی۔
دس کو گولی مار چکا ہوں، دو کو بازار میں پھانسی دے چکا ہوں، مگر یہ کم بخت کسی
طرح مانتے ہی نہیں۔

اسی طرح مکالمے کی مدد سے ڈراما نگار نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت، زمانے کا بدلتا مزاج، انگریزوں کی مداخلت بلکہ زور آزمائی اور ہندوستانیوں کے رویے کو نہایت کامیابی سے پیش کیا ہے۔ ان مکالموں سے بادشاہ کی بے بسی اور اپنی حکومت پر ان کی پکڑ نہ ہونے کا صاف احساس ہوتا ہے۔ مرزا مغل، حکیم احسن اللہ، راجا نہار سنگھ اور سدھاری سنگھ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ کے اختیار میں کچھ بھی نہ ہونے کے باوجود انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑنے کے لیے عوام ان کی رہنمائی چاہتی ہے۔ یہ مکالمے اس طرح ہیں:

مرزا مغل: خیر تو ہے احسن اللہ۔ ہم تو تمھارا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے، تم نے آ کر
عیش کا دروازہ بند کر دیا۔

حکیم احسن اللہ: حضور، اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہوں، مگر زمانے کی گردش نے گستاخی عام کر
دی ہے۔ اب نہ آداب کے لیے گنجائش ہے، نہ آداب کا خیال کرنے کے لیے۔

مرزا مغل: کیوں، کیا ہوا؟

حکیم احسن اللہ: جب سوچتا ہوں کہ شہنشاہانِ مغلیہ کی شان کیا تھی، دبدبہ کیا تھا، اور اب
حالت کیا ہے تو جذبۂ وفاداری کہتا ہے کہ فدایانِ سلطنت کے لیے ڈوب
مرنے کا مقام ہے۔ اگر زندہ ہوں تو اس وجہ سے کہ خدمت کا حق ادا کرنا ہے۔

مرزا مغل: ہاں ہاں احسن اللہ، یہ تو ٹھیک ہے۔ وعظ و نصیحت کی ابتدا تم اسی طرح کیا
کرتے ہو، مگر بات تو بتاؤ۔

حکیم احسن اللہ: کیا بتاؤں۔ زبان میں طاقت نہیں کہ بیان کر سکے۔ فرنگیوں کی
گستاخیاں کیا کم تھیں۔ آج اپنے ملک والوں کی بے باکی دیکھ لی...... میرٹھ
کی فوج نے غدر کر دیا ہے۔ وہاں مار دھاڑ کر کے باغی آج یہاں پہنچے۔
حضورِ اقدس سے مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کے بادشاہ بن جائیں۔

مرزا مغل: اور حضور نے کیا فرمایا؟

(احسن اللہ غصے میں بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی جواب نہیں دیتا۔ خاموشی)

راجا نہار سنگھ: کیا وہاں سرکار پر جان نثار کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا؟

حکیم احسن اللہ: جی نہیں۔ نافرمانوں سے گفتگو کرنے اور ان کی گالیاں سننے کے لیے بندہ طلب کیا گیا۔ بندے نے کیپٹن ڈگلس کو بلوایا۔ مسٹر فریزر کو خبر کرائی۔ ان کے بنائے وہاں کچھ نہ بنی۔ قلعے کے باہر ان پر جو کچھ گزری وہ آپ کل سن لیجیے گا۔ اور پھر طے کر لیجیے گا کہ سرکار اپنی اس عمر میں باغیوں کے سردار بن سکتے ہیں یا نہیں اور برطانوی فوج سے لڑنے اور ایک بڑے شہر کو کھلانے پلانے کا اہتمام کر سکتے ہیں یا نہیں۔ مجھے تو صرف سرکار سے محبت اور عقیدت ہے۔ میں طبیب ہوں، سرکار کا نمک خوار ہوں اور بس۔

(دیوان خانے کے قریب شور برپا ہوتا ہے: "ٹھہرو، ٹھہرو، کہاں جا رہے ہو"، "چپ رہو نہیں تو ایک باڑھ میں سب کو ختم کر دیں گے"۔

(تھوڑی دیر میں سدھاری سنگھ دس پندرہ مسلح سپاہیوں کے ساتھ داخل ہوتا ہے اور مرزا مغل کے سامنے کھڑا ہو کر فوجی سلام کرتا ہے۔ سپاہی بھی قطاریں بنا کر کھڑے ہوتے ہیں اور ہتھیار پیش کرتے ہیں)

مرزا مغل: ہیں بھئی، یہ کیا؟

سدھاری سنگھ: (پھر سلام کر کے) حضور، ہم آپ کے جاں نثار فوجی ہیں۔ حکم لینے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔

حکیم احسن اللہ: حضور، یہ انھیں نافرمانوں کے بھائی بند ہیں جو آج قلعے کے نیچے سرکار کا درشن کرنے اور سیاست کے اعلیٰ مسائل پر گفتگو کرنے آئے تھے۔ ان کی اصلیت دیکھنا چاہتے ہوں تو ان کی مرضی کے خلاف کچھ فرما دیجیے۔

سدھاری سنگھ: حضور، اس میں شک نہیں کہ ہم نے نافرمانی کی ہے، اپنے دھرم کو اپنی

نوکری پر ترجیح دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری طرح لاکھوں آدمی
انگریزوں کی حکومت سے بیزار ہیں اور وہ لڑائی میں ہمارا ساتھ دیں گے۔
لیکن ملک میں ہم کو کوئی جانتا نہیں۔ آپ کا خاندان اس دیس کی آبرو ہے،
آپ کے حکم پر ہم اور ہمارے ساتھ ہزاروں آدمی جان دینے کو تیار ہو
جائیں گے ہم آپ کی رہبری چاہتے ہیں۔

اس طرح کے بہت سے مکالمے کئی مقام پر مل جائیں گے جو اس ڈرامے کی خوبی ہے اور جن کے ذریعہ ڈرامے کو طوالت سے بچایا گیا ہے۔

پروفیسر مجیب کے اس ڈرامے کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس ڈرامے میں بھی انھوں نے عورتوں کے کردار کو نہایت فعال اور سرگرم دکھایا ہے۔ ایک جانب مرد کردار جنگ آزادی میں حصہ لینے اور جہاد کرنے پر آمادہ ہیں تو دوسری جانب عورتیں بھی ہر صورت میں ان کا ساتھ دینے اور قربانی دینے کو تیار دکھائی دیتی ہیں۔ وہ بھی مردوں کی مانند ہر آزمائش سے گزرنے کے لیے خود کو پیش کرتی ہیں۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے کا جذبہ اس قدر ان کے اندر ہے کہ وہ اس کے لیے ہر شرط ماننے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ اس ضمن میں چند مکالمے دیکھیں:

بخت خاں: .... اور ای مہریاں کاہے کا آئی ہیں؟
جہادی عورت: ہم بھی مردوں کے ساتھ لڑیں گے اور مریں گے۔
بخت خاں: بٹیا مرے کا ہوئے تو اپنے گھر جاؤ، آرام سے پلنگ پر لیٹ کے مرو۔
ہمرے سامنے مری ہو تو نہ ہمرا کوئی پھائدہ ہوئی ہے نہ تمرا۔ اور یو ہم سے کہو نا
کہ تم سپاہین کی طرح لڑ لے ہو۔ یو تمرا کام نہ ہوئے۔
جہادی عورت: آپ ہمیں میدان میں بھیج کر دیکھ لیجیے۔
بخت خاں: میدان ماں ہم تم کا ایس نہ بھیج دیبا۔ پہلے لڑنا سیکھو۔ تب مرنا ائی ہے۔
او یو جانو ہمرے پاس مردن کی کوئی کمی نا ہیں ہے۔ تو بٹیا پہلے تم کوائد سیکھو۔
جہادی عورت: ہم فوجی قواعد سیکھنے کے لیے تیار ہیں۔

بخت خاں: اچھا بل یو کہے دیت ہن اکی جومہریا کوائدنہ کری پائی ہے اوکا چولھا جھونکے پر لگائی دیبا۔

(منّی اندر آتی ہے اور جہادی عورتوں کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ ایک سبز چادر لپیٹے ہے)

جہادی عورت: ہمیں ہر شرط منظور ہے۔

ڈراما آزمائش کی زبان کرداروں کے ساجی وتہذیبی پس منظر کے مطابق ہے جو کردار جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے اس کی جھلک اس کے مکالمے میں دکھائی دیتی ہے۔ کہار کی زبان، محمد یوسف کی زبان سے مختلف ہے۔ بخت خاں دیہاتی زبان اور لب ولہجہ میں باتیں کرتا ہے تو مرزا مغل سلیس اور معیاری اردو میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں اور منّی کی زبان میں ایک الگ انداز ہے۔ مثال کے طور پر یہ مکالمہ دیکھیں:

ایک جہادی: ہم ٹونک سے جہاد کرنے آئے ہیں۔

بخت خاں: ٹونک، ٹونک، وہی ٹونک ناجہاں ای سسرے انگریج ایک ٹھگ کا نواب بنائی دہن رہیں؟ کاتم کا وہی بھیجس ہے۔

جہادی: جی نہیں۔ نواب امیر علی خاں کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہمارا نواب صاحب سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم دین کی خاطر لڑنے اور جان دینے آئے ہیں۔

بخت خاں: تو اتی دور کا ہے کا آیو بھیا۔ کاہواں کتل کرنے کے لیے تم کا کوؤ ناہیں ملا؟

جہادی: ہم عیسائی حکومت سے اور انگریزوں سے لڑنے آئے ہیں۔

بخت خاں: مُل بھیا، ہمری پھوج ماں ہندو مسلمان سبھے ہیں، یو ناہیں ہوئی سکت ہے کہ لڑے ہندو اور جیتو تم، مرے ہندو اور جنت ماں جاؤ تم۔ جو ہیاں دلی ماں رہنا چاہت ہو تو بھیا اپنے حصے سے جیادہ نہ مانگو۔ ہم نہ کوؤ کے ساتھ رعایت کربا نہ کوؤ کا جنت پہنچاوے کا جمہ لیبا۔

جہادی: جی نہیں، ہم کوئی رعایت نہیں چاہتے۔ ہم آخر دم تک لڑنے کی نیت کر کے آئے ہیں۔

بخت خاں: جی تنا ہم کہن ویسن لڑی ہو؟

جہادی: جی ہاں۔

بخت خاں: یو سمجھو بھیا کہ اللہ کا نام لینا ہم ہوں کا آوت ہے۔ جو تم کہانہ منی ہو تو ہم اللہ کا نام لے کے تم کا بندوق سے اڑائی دیبا۔

جہادی: جی ہاں، ہمیں منظور ہے۔

مجیب صاحب کے ڈراموں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے ڈراموں میں مکالمے بہت طویل ہوتے ہیں۔ 'آزمائش' اس کی نفی کرتا ہے۔ بعض مکالمے دیکھنے میں طویل لگتے ہیں لیکن پیش کش کے لحاظ سے کردار کے لیے اسٹیج پر کرنے کے لیے بہت کچھ موجود ہے، یا پھر یہ باتیں اتنی اہم ہیں کہ انھیں نکالا نہیں جاسکتا۔ ڈراما 'آزمائش' میں ہی انھوں نے ایک جانب مختصر ترین مکالمے لکھے ہیں تو ضرورت کے تحت اوسط اور طویل مکالمے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان مکالموں کو بغور دیکھتے ہیں تو کہیں بھی بھرتی کے محسوس نہیں ہوتے۔ آپ بھی دیکھیں کہ کس طرح مجیب صاحب نے اپنی فنکاری کا نمونہ پیش کیا ہے:

محمد یوسف: (آگے بڑھ کر اور انھیں سامنے کی طرف سے روکتے ہوئے) ٹھہرو، کہاں جاتے ہو!

(سدھاری سنگھ برقع پوش کو پیچھے سے گھیر لیتا ہے)

پہلا برقع پوش: (زنانی آواز میں) بھیا میں غریب بڑھیا ہوں......

محمد یوسف: اچھا، نانی اماں، ذرا شکل تو دکھاؤ!

(محمد یوسف برقع نوچ لینا چاہتا ہے، مگر وہ اترتا نہیں۔ وہ برقع پوش کے سر پر پستول کا دستہ مارتا ہے، اور جب وہ گر پڑتا ہے تو پیروں کی طرف سے برقع اٹھاتا ہے۔ باقی برقع پوش سہمے کھڑے رہتے ہیں) ارے یہ تو سپاہی ہے! اچھا، اب اس کی نوبت آگئی کہ عورتوں کا بھیس بنا کر بھاگ رہے ہو!

دوسرا برقع پوش: (برقع اُتار کر پھینکتے ہوئے) جی ہاں، اس کی نوبت آگئی ہے۔ کھانے کو

آپ نہیں دیتے، ہتھیار آپ نہیں دیتے، ہمیں لڑنے کا حکم دیتے ہیں، خود انگریزوں کو چھپا چھپا کے خط لکھتے ہیں۔ ہم یہاں ڈٹے رہیں تو انگریز آکر ہمیں پھانسی دے دے گا، ہم بھاگیں تو آپ پیچھے سے گولی ماردیں گے۔ کل آپ ہی نے تین آدمیوں کو گولی ماری اور دو کو پھانسی دے دی۔ ہم برقع پہن کر نہ بھاگیں تو اور کیا کریں۔

محمد یوسف: تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک ہے۔ تم بھاگ سکتے ہو تو بھاگو، میں پیچھے سے گولی ماروں گا۔ جو مرگیا وہ یہیں پڑا رہے گا، جو زخمی ہوا اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ تمھارا جی چاہے اس طرح بھگوڑوں کی موت مرو، جی چاہے میدان میں مَردوں کی طرح جان دو۔ ہتھیار چاہتے ہو تو کشمیری دروازے کے پاس چھوٹا سا اسلحہ خانہ ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔ وہاں نہ ملیں تو ٹولی بنا کر خود تلاش کرو۔

پلاٹ کی سطح پر قصے میں نہ صرف تسلسل قائم ہے بلکہ اس میں کشمکش اور تصادم کا مادہ بھی موجود ہے جو ڈرامے کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ ہر منظر کے بعد ناظرین کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے اور وہ اس کا انتظار کرتے ہیں کہ اب آگے کیا ہوگا۔ یہ خصوصیت اردو ڈرامے میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس ڈرامے کے قصے پر غور کرنے کے بعد یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا کہ اس میں 1857 کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے تمام طبقوں کو جگہ دی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ تاریخی حقیقت کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'آزمائش' محمد مجیب کا آخری ڈراما ہے جو 1857 کی جنگ آزادی کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف 1957 ہے۔ یہ ڈراما اسٹیج کی ضروریات اور ڈرامے کے فن دونوں پر پورا اترتا ہے۔ اس کے سبھی کردار بے حد فعال اور فطری ہیں۔ پلاٹ کی سطح پر قصے میں نہ صرف تسلسل قائم ہے بلکہ اس میں کشمکش اور تذبذب کا مادہ بھی موجود ہے۔ مکالمے چست اور رواں ہیں۔ زبان کرداروں کے تہذیبی اور سماجی پس منظر نیز ان کے سماجی مقام و مرتبے

کے مطابق ہے۔ بحیثیت ڈراما نگار محمد مجیب اردو ڈراموں کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ محمد مجیب نے آزمائش کے ذریعے ہمارے سامنے 1857 کے واقعات کو تازہ کر دیا ہے۔ جب بھی ہم اس پہلی جنگ آزادی کو یاد کرنا چاہیں تو اس ڈرامے کو اسٹیج کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ گویا یہ ڈراما تحریری شکل میں موجود ہونے کے باوجود ہمارے لیے تصویر کا کام کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان ناقدوں کی امیدوں پر بھی کھرا اترتا ہے جو ڈرامے میں صرف ادب تلاش کرتے ہیں۔

پروفیسر مجیب کی ڈراما نگاری کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں ڈراما کو سنبھالا دیا جب پارسی تھیٹر کا زوال ہو چکا تھا۔ اردو ڈراما کیا ہندوستانی ڈرمے کی حالت بہتر نہیں تھی۔ ان کے ڈراموں کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ڈرامے کی تکنیک سے واقف تھے بلکہ جدید تکنیک اور اسٹیج کے بدلتے رویے اور اس کی ضروریات کی پوری جانکاری رکھتے تھے، ہندوستانی فلم اور اس سے منسلک فنکاروں کے رویے سے آشنا تھے تو ڈراما اور اسٹیج کی طاقت اور اس کی سچائی کے جانکار تھے۔ تو اریخ کے استاد، ایک اہم اور قابل اعتبار منتظم تھے تو اردو زبان و ادب کے رسیا اور اردو ڈراما، اسٹیج اور اس کے فن سے متعلق علم کے مالک۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جتنے ڈرامے تحریر کیے وہ اسٹیج کی زینت بنے بلکہ ہندوستانی ڈرامے کی تاریخ میں قابل تقلید اور اہم مقام کے حقدار ثابت ہوئے۔ انھوں نے ڈرامے سے متعلق جو خیالات پیش کیے وہ ڈرامے کی تنقید کی راہ ہموار کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوئے۔ بحیثیت مجموعی پروفیسر مجیب نہ صرف ایک اہم اور کامیاب ڈراما نگار ہیں بلکہ اردو ڈرامے کی تنقید کے راہنماؤں میں اہمیت کے حامل ہیں اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اردو ڈرامے کی تاریخ اور تنقید ان کے حوالے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی تو شاید بے جا نہ ہو۔

یہاں ان کے ڈراموں کو سال اشاعت کی مناسبت سے شامل کیا جا رہا ہے۔ ڈراما 'حبہ خاتون' میں انھوں نے پیش لفظ تحریر کیا تھا جو شائع شدہ کتاب کے مطابق ہی یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔ ڈراموں کے متن سے پہلے ڈرامے کے فن سے متعلق پروفیسر مجیب کے کتابچے 'آؤ ڈراما کریں' کو شامل کیا جا رہا ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ڈراما کے مطالعے سے پہلے قاری کو

ڈرامے کے فن سے متعلق بھی مختصر ہی صحیح جانکاری حاصل ہو جائے۔ مجیب صاحب نے ڈرامے کے کردار کی فہرست پیش کرتے وقت ڈراما کھیتی، انجام، خانہ جنگی، حبہ خاتون اور آزمائش میں 'اشخاص' درج کیا ہے تو ڈراما ہیروئن کی تلاش اور دوسری شام میں 'کیریکٹرز' لکھا ہے۔ اس کتاب میں آسانی اور یکسانیت کے لیے کردار لکھا جا رہا ہے۔ ہاں ساتھ ہی اشخاص اور 'کیرکٹرز' بھی درج ہے۔

ڈاکٹر محمد کاظم
اسوشیئٹ پروفیسر
شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

آؤ ڈراما کریں

آؤ ڈراما کریں

محمود، خالد، راشد، حفیظ، سلامت اور نہ جانے کتنے اور سب ایک ہی مدرسے میں پڑھنے والے، تصور کے یہاں جمع ہوئے تھے۔ دعوت بڑوں کی تھی۔ یہ سب دم چھلے تھے۔ انھیں اچھے اچھے کپڑے پہنائے گئے اور میزبان کے گھر لاکر چھوڑ دیا گیا کہ جو چاہو کرو مگر شرارت نہ کرو۔

تھوڑی دیر تک یہ کودتے پھاندتے رہے۔ پھر چائے پلائی گئی۔ چائے کے بعد یہ پھر کھیلے کودے۔ مگر سردی کا زمانہ تھا، اندھیرا جلدی ہوگیا اور یہ سب اندر بلا لیے گئے۔ یہاں بڑوں کا ساتھ تھا۔ بچے جو کچھ کرتے وہ شرارت، جو کچھ کہتے وہ شور۔ آخر میں محمود سے نہ رہا گیا۔ اس نے خالد سے کہا: ''آؤ بھئی خالد ایک ڈراما کریں۔''

خالد کو معلوم نہیں تھا کہ ڈراما کسے کہتے ہیں۔ مگر خالی بیٹھے بیٹھے اس کی طبیعت اکتا گئی تھی۔ کرنے کا نام سنتے ہی وہ جاگ اٹھا، اس نے کہا: ''آؤ کریں۔''

محمود نے کہا: ''اچھا دیکھو تم ہو بسکٹ والے۔ تم ایک ٹوکری سر پر لے کر ہانک لگاتے ہوئے آؤ 'کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ!' میں اور رشید یہاں کھڑے ہوں گے۔ تم سامنے آؤ گے تو میں کہوں گا: 'ارے بھئی کس حساب سے دیتے ہو؟' تم ٹوکری اٹھا کر زمین پر رکھ دینا،

بسکٹوں پر سے کپڑا ہٹا لینا اور مجھے بتانا: 'یہ دس دس پیسے کے ہیں، یہ بڑے بیس بیس پیسے کے ہیں۔'
اس کے بعد میں بسکٹوں کو دیکھ کر کہوں گا: 'یہ دس پیسے والے چار دے دو۔' میں بسکٹ لے لوں گا اور تم کو ٹھینگا دکھا کر بھاگوں گا۔ تم میرے پیچھے دوڑنا۔ جب تم ذرا دور نکل جاؤ گے تو راشد تمھاری ٹوکری سے بسکٹ نکال کر گود میں بھر لیں گے اور چمپت ہو جائیں گے۔ تم تھوڑی دیر بعد آؤ گے تو دیکھو گے کہ آدھی ٹوکری غائب ہے اور بڑی کھسیانی صورت بناؤ گے اور ٹوکری سر پر رکھ کے پھر چل دو گے۔ آؤ کرو بڑا مزہ آئے گا۔"

خالد نے کچھ سوچ کر کہا: "واہ میں کھسیانی صورت کیوں بناؤں، تم آپ بناؤ۔"

خالد کے ابا ماجد صاحب محمود کی باتیں کان لگائے سن رہے تھے۔ خالد نے بسکٹ والا بننے سے انکار کیا تو انھوں نے کہا: "نہیں خالد اس میں بگڑنے کی بات نہیں۔ ڈرامے میں بے وقوف کا پارٹ کرنے سے کوئی بے وقوف نہیں بن جاتا اگر تم نے بسکٹ اسی طرح بیچے جیسے بسکٹ والا بیچتا ہے اور دھوکا کھانے کے بعد ایسی صورت بنائی جس سے معلوم ہو تم نے سچ مچ دھوکا کھایا ہے اور بہت پچھتا رہے ہو تو لوگ کہیں گے کہ تم بہت ہوشیار ہو اور بسکٹ والے کا پارٹ خوب کرتے ہو۔ تم کو تو اس پر خوش ہونا چاہیے۔"

لیکن خالد کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ وہ چپ رہا۔

پھر محمود نے کہا: "تم اور راشد لڑکے بنو، میں بسکٹ والا بنوں گا۔ چچا آپ مجھے ایک ٹوکری دلوا دیجیے۔"

ماجد صاحب اٹھ کر تصور کے والد خورشید صاحب کے پاس گئے جو کچھ دور بیٹھے تھے اور ان کے کان میں کچھ کہا۔ خورشید صاحب مسکرا کر اٹھے اور اندر چلے گئے۔

ماجد صاحب نے واپس آ کر محمود سے کہا: "اچھا آؤ بھئی محمود، تم کو بسکٹ والے کی صورت بھی تو بنانا ہے۔"

محمود نے کہا: "جی ہاں۔"

ماجد صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر بازو کے ایک کمرے میں لے گئے۔ یہ شاید خورشید صاحب کے سونے کا کمرہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد خورشید صاحب ایک میلی سی لنگی اور اتنا ہی میلا کرتا اور

ٹوپی لے کر آئے۔ محمود نے اپنے اچھے اچھے کپڑے اتار کر لنگی باندھی، اور کرتا پہنا، ٹوپی سر پر رکھی۔ اتنے میں ایک نوکر چھوٹی سی ٹوکری لے کر آیا جس میں بسکٹ بھی رکھے تھے۔ ماجد صاحب نے کہا: ''لو بھئی بسکٹ والے اپنی ٹوکری سنبھالو۔ اچھا مگر یہ تو بتاؤ اسے لے کر کیسے چلو گے؟''

محمود نے ٹوکری اٹھالی۔ ایک ٹانگ چھوٹی کرلی۔ بدن ایک طرف کو جھکایا، گردن دوسری طرف کو اور سر پر ٹوکری رکھ کر ہانک لگائی: ''کیا میٹھے ہیں بسکٹ۔'' ماجد صاحب ہنس پڑے۔ انھوں نے کہا: ''بھئی واہ، تم تو بڑے استاد نکلے۔ اچھا تم ذرا دیر ٹھہرو میں ذرا جا کر اسٹیج ٹھیک کر آؤں۔''

ماجد صاحب نے جا کر مہمانوں سے کہا: ''حضرات! دو تین بچے آپ کو ایک چھوٹا سا ڈراما دکھانا چاہتے ہیں۔ آپ ذرا تکلیف کر کے ایک طرف کو بیٹھ جائیں جس میں اسٹیج کے لیے جگہ نکل آئے۔''

مہمان خوشی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ماجد صاحب نے اسٹیج کے لیے اس طرح جگہ نکالی۔

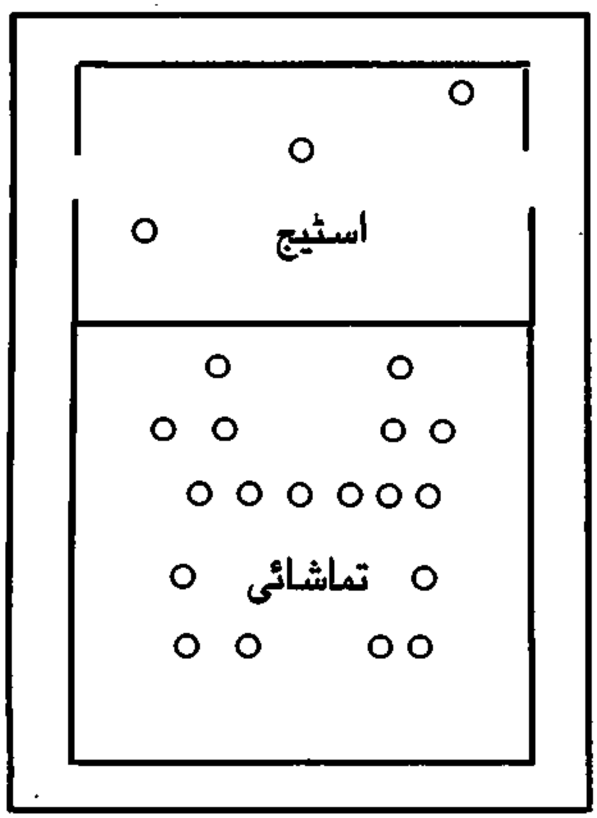

مہمان جب ٹھیک سے بیٹھ گئے تو ماجد صاحب خالد اور راشد کو لے کر اس کمرے میں گئے جہاں محمود انتظار کر رہا تھا۔ انھوں نے تینوں کو سامنے کھڑا کر کے کہا: ''دیکھو بھئی، میں نے تمھارے ڈرامے کے لیے اسٹیج تیار کرا دیا ہے۔ اس میں دو دروازے ہیں۔ بائیں طرف جو دروازہ ہے، اس میں سے پہلے خالد اور راشد باتیں کرتے ہوئے جائیں گے۔ وہ دو چار قدم چلے ہوں گے جب پیچھے سے بسکٹ والے کی ہانک سنائی دے گی۔ خالد تم راشد کو وہیں کھڑا کر دینا اور خود ذرا آگے جا کر ٹھہر جانا۔ جب بسکٹ والا اندر آ جائے اور خالد کے قریب پہنچے تب وہ پوچھیں گے کہ بھئی کس حساب سے دیتے ہو۔ تم راشد، اس وقت ذرا بسکٹ والے کی طرف بڑھ آنا مگر اس طرح کہ اس کے اور تماشائیوں کے درمیان نہ آ جاؤ۔ اس کا ضرور خیال رکھنا۔ آگے تو تمھیں معلوم ہے نا؟''

تینوں نے کہا: ''جی ہاں۔''

تماشائی سب بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں اسٹیج کی بائیں طرف سے اسکول کے دو لڑکے باتیں کرتے ہوئے آئے اور ان کے داخل ہوتے ہی ایک ہانک سنائی دی: ''کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ! کرارے ہیں بسکٹ۔''

ایک لڑکے نے دوسرے کی طرف آنکھ ماری اور کہا: ''ارے یہی ہے وہ بسکٹ والا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کو وہیں روک دیا اور خود ذرا آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں بسکٹ والا داخل ہوا اور اس نے ایک اور ہانک لگائی۔ پہلے نے جو اسٹیج کے بیچ میں کھڑا تھا کہا: ''ارے بسکٹ والے ذرا دکھاؤ تو کیسے بسکٹ ہیں۔''

بسکٹ والے نے سر پر سے ٹوکری اتارتے ہوئے کہا: ''لو، ایسے بسکٹ ہیں کہ شہر میں کہیں نہ ملیں گے۔ خالص گھی کے ہیں۔ ایسے خستہ کہ کھاتے ہی منہ میں گھل جائیں۔ یہ دس دس پیسے کے ہیں، یہ دس پیسے کے دو۔ یہ بڑے بیس بیس پیسے کے۔''

بسکٹ والا لنگڑا کر چلتا تھا۔ کمر ٹیڑھی تھی، ٹوپی ٹیڑھی، اب بسکٹ کے دام بتاتے ہوئے اس نے تماشائیوں کی طرف منہ پھیرا تو معلوم ہوا کہ وہ کانا بھی ہے اور بات کہنے کے بعد ایک طرف کو زبان بھی نکال دیتا ہے۔ تماشائیوں کو یہ سب دیکھ کر خوب مزہ آیا اور سب کے جی میں یہ بات آئی کہ اگر لڑکے اس کے ساتھ شرارت کریں تو بڑا اچھا ہو۔''

پہلے لڑکے نے جس نے دام پوچھے تھے، اب کہا: ''اچھا یہ دس پیسے والے چار دے دو۔''

اس نے اپنی جیب میں ایک ہاتھ ڈالا۔ جیسے کوئی پیسے نکالنے کے لیے ڈالتا ہے۔ بسکٹ والے نے اس کے دوسرے ہاتھ میں بسکٹ دے دیے اور پیسے لینے کے لیے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ لڑکے نے اس کے ہاتھ میں انگوٹھا چھلایا اور اسٹیج کے دوسرے دروازے سے بھاگ کر نکل گیا۔ بسکٹ والا اٹھا اور لنگڑاتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا، جب وہ دروازے سے نکل گیا تو دوسرے لڑکے نے جو چپ چاپ کھڑا تھا، لپک کر ٹوکری سے بہت سے بسکٹ نکالے۔ کچھ جیبوں میں بھرے کچھ گود میں اور پہلے دروازے سے نکل کر غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد بسکٹ والا ہانپتا کانپتا پھر داخل ہوا۔ اس کی صورت شکل اور چال پر ویسے بھی ہنسی آتی تھی۔ ٹوکری خالی دیکھ کر اس نے جو کھسیانی صورت بنائی، وہ تو بس غضب کی تھی۔ سارے تماشائی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ وہ تھوڑی آنکھیں بلکہ اپنی ایک آنکھ مچمچاتا رہا پھر ٹوکری اٹھائی اور دوسرے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پھر ایک ہانک لگائی: "کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ! کرارے ہیں بسکٹ۔"

یہ ہانک بھی بڑی سبق آموز تھی کیونکہ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ بسکٹ والے کی عقل حیران اور ٹوکری خالی ہے۔

ماجد صاحب، محمود، خالد اور راشد کو لے کر اسٹیج پر آئے۔ لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ ماجد صاحب نے کہا: "حضرات! آپ یہ ذرا سا تماشا دیکھ کر سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمارے بچوں میں ڈراما کرنے کی کتنی قدرتی استعداد ہے۔ محمود بسکٹ والے کے شوق کو دیکھ کر مجھے بھی شوق ہو گیا ہے کہ ان بچوں کو ڈرامے کا فن سکھاؤں۔ آپ سے امید ہے کہ آپ ان کی ہمت بڑھاتے رہیں گے اور جب کبھی یہ کوئی ڈراما تیار کریں تو اسے دیکھیں گے۔ محمود میں تمھیں سب کی طرف سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اب اگر تم خود نہ اکتا گئے تو تمھیں ڈراما کرنے کے بہت سے موقعے ملیں گے اور لوگ تمھاری نقلوں کو دیکھنے کے لیے دور دور سے آئیں گے۔"

محمود پھر لنگڑا، ٹیڑھا اور کانا ہو گیا۔ اس نے ٹوکری سر پر رکھی اور ہانک لگائی۔ اس کے بعد وہ دروازے سے نکل کر بھاگ گیا اور لوگوں نے پھر خوب تالیاں بجائیں۔

ڈراما کیا ہے؟

محمود نے بسکٹ والے کی نقل اس خوبی سے کی تھی کہ ماجد صاحب سمجھ گئے کہ اگر شوق دلایا جائے تو وہ بہت اچھی نقلیں کرنے لگے گا۔ وہ اسے اور اس کے دوستوں کو اکثر کسی بہانے سے اپنے یہاں بلاتے، ان کی جھجک دور کرنے کے لیے خود بھی کسی کی نقل اتارتے اور پھر لڑکوں سے پوچھتے کہ بتاؤ میں نے ٹھیک نقل اتاری یا نہیں۔

ماجد صاحب کی چھ برس کی بچی رضیہ کو یہ تماشے بہت پسند تھے۔ وہ جب کہیں جاتی تو لوگوں کی صورت، چال ڈھال، بات چیت کے طریقے پر غور کرتی رہتی اور پھر گھر آ کر اپنے ابا کو بتاتی کہ یہ بی بی اس طرح چلتی ہیں، وہ بی بی اس طرح بولتی ہیں۔ تھوڑے دنوں میں محمود، راشد اور خالد کو ماننا پڑا کہ رضیہ ان سے کسی بات میں کم نہیں۔

لیکن نقل کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر کو سب کا جی اکتا گیا۔ ایک مرتبہ جب ماجد صاحب کے یہاں جمع تھے تو محمود نے کہا:

''ماجد صاحب ایک اسٹیج بنوایئے۔''

ماجد صاحب نے پوچھا: ''کیوں؟''

محمود کا منشا صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس کو اب خالی نقلیں اتارنے میں مزہ نہیں آتا۔ اسٹیج بنوانے کی فرمایش اس نے کچھ سوچ کر نہیں کی تھی لیکن وہ یہ بات اب ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا:

''لوگ کہتے ہیں کہ ڈرامے کے لیے ایک اسٹیج بھی چاہیے۔''

ماجد صاحب نے کہا: ''ہاں اسٹیج بھی چاہیے۔ لیکن وہ اتنا ضروری نہیں۔ جیسے لکھنے کے لیے میز ہو تو اچھا ہے لیکن وہ نہ ہو تب بھی کام چل جاتا ہے۔ اگر آدمی کو لکھنا آتا ہو اور اسے معلوم ہو کہ لکھنا کیا ہے۔''

''جی ہاں۔''

''تو اصل میں ہمیں سوچنا یہ ہے کہ ہم کس کی نقل کریں اور کیوں کریں۔ جب یہ سمجھ میں آجائے گا تو اسٹیج بھی بنالیں گے۔ اب تک تم ایسے لوگوں کی چال ڈھال اور بول چال کی نقل کرتے رہے ہو جو تمہیں عجیب معلوم ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ دلچسپ بھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے 'کیفیت'۔ تم نے بسکٹ والے کی نقل کی تھی تو یہ دکھایا تھا کہ وہ خالد کے پیچھے دوڑا تھا اور انھیں پکڑ نہیں پایا اور واپس آکر دیکھا تو خالد نے ٹوکری خالی کردی تھی۔ اس وقت وہ کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ یہ اس کی 'کیفیت' تھی اور ایک خاص وجہ سے پیدا ہوئی۔ رضیہ جانتی ہو کیسے؟''

رضیہ نے زور سے سر ہلایا:

''جی ہاں اس کے بسکٹ دو شریر لڑکوں نے چرائے تھے۔ بہت شریر لڑکوں نے۔ اور اب وہ بے چارے کی نقل اتارتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔''

''جناب کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ہم نے سچ مچ کسی بسکٹ والے کے بسکٹ چرائے۔'' خالد نے خفا ہو کر کہا۔

رضیہ نے منھ بنا کر جواب دیا:

''میں کیا جانوں؟''

ماجد صاحب بیچ میں بول دیے:

''مگر میں جانتا ہوں انھوں نے سچ مچ چوری نہیں کی تھی، چوری کی نقل اس طرح اتاری تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے چوری کی مشق کی ہے۔ مگر رضیہ بیگم آپ لڑنے جھگڑنے کا قصہ کسی

اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ مجھے پوری بات کہہ لینے دیجیے۔''

رضیہ معصوم بن کر بیٹھ گئی: ''جی ابا جان۔''

''میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ آدمیوں کی شکل وصورت، بول چال وغیرہ کی نقل ہم اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی کیفیت دکھا سکیں۔ یہ کیفیت کسی خاص وجہ سے کسی خاص موقع پر پیدا ہوتی ہے۔ کوئی لڑکا شرارت کرتا ہے اور مار کھاتا ہے تو وہ روتا ہے، یہ رونا ایک 'کیفیت' ہے۔''

رضیہ سے پھر نہ رہا گیا۔ اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''بعض لڑکے ایسے بے شرم ہوتے ہیں کہ مار کھانے پر بھی نہیں روتے۔''

''یہ بھی ایک کیفیت ہے۔ اس کی نقل اتارنا البتہ بہت مشکل ہے۔ خوشی بھی ایک ''کیفیت'' ہے۔ موٹا آدمی تیز دوڑنا چاہے اور نہ دوڑ پائے یہ بھی ایک 'کیفیت' ہے۔ رضیہ بھولی بن کر فساد کی باتیں کرے یہ بھی......''

''جی ابا......''

''اب ذرا سب لوگ رضیہ کی صورت دیکھو، صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی چوری کھول دی گئی ہے۔ چہرے سے حیرت ٹپکتی ہے۔ آنکھیں مجھے ملامت کرتی ہیں۔ کہتی ہیں 'ابا جان بھلا آپ کے دل نے کیسے گوارا کرلیا کہ اپنی لڑکی کی نسبت آپ ایسی بات کہیں، لیکن مجھے ان آنکھوں میں کوئی اور بھی منہ چھپائے بیٹھا ہوا نظر آرہا ہے۔ جسے ایسی باتوں میں بڑا لطف آتا ہے۔ اصل میں وہی ہے رضیہ۔ ظاہر میں جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، وہ اسی اصل رضیہ کی بنائی ہوئی جھوٹ موٹ کی کیفیت ہے۔ مگر رضیہ کو ایسی صورت بنانے میں بڑا کمال ہے، جو انھیں جانتا نہ ہو وہ آسانی سے دھوکا کھا سکتا ہے۔''

لڑکے سب ہنسنے لگے۔ رضیہ نے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ ماجد صاحب نے کہا:

''اچھا اب ایک قصہ سنو۔ ایک مرتبہ رضیہ کی اماں، میں، رضیہ اور ان کے بھائی شاہد نمائش میں گئے تھے۔ رضیہ اس زمانے میں دو برس کی تھیں۔ نیا نیا چلنا سیکھا تھا۔ اس لیے چلنے کا بہت شوق تھا۔ ان کو شاید خیال تھا کہ چاہے جدھر چلی جائیں ان کی اماں جان اور ابا جان وقت پر ہاتھ پکڑ لینے اور گود میں اٹھا لینے کو ضرور پہنچ جائیں گے۔ جب ہم لوگ گھر سے چلے تو یہ بہت خوش تھیں۔

شاہد کو بھی بازاروں اور میلوں کی سیر کرنے کا بہت شوق ہے۔ وہ بھی خوشی سے اچھل رہے تھے۔ ہم لوگ نمایش میں پہنچے۔ دیر تک چیزیں خریدتے اور گھومتے رہے۔ ایک دکان پر رضیہ کی ماں اور میں سامان دیکھنے لگے اور رضیہ کا خیال نہیں رہا۔ ایک بار خیال آیا اور دیکھا تو رضیہ غائب! پہلے ہم سمجھے کہ آس پاس کہیں ہوں گی۔ شاہد نے دوڑ دوڑ کر ادھر اُدھر دیکھنا اور پکارنا شروع کیا، رضیہ کا کہیں پتا نہ تھا۔ اب ان کی اماں جان نے رونا شروع کیا، میں بھی کچھ پریشان ہو گیا۔ میں نے شاہد سے کہا کہ تم اماں جان کے پاس رہو اور خود نمایش کے دفتر میں گیا کہ واں کسی سے کہوں کہ میری لڑکی کھو گئی ہے جیسے ہی واں پہنچا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی رضیہ کو کندھے پر سوار کیے چلا آرہا ہے۔ رضیہ مجھے دیکھ کر میری طرف لپکیں اور میں نے انھیں گود میں لے لیا۔ دفتر میں جو صاحب تھے انھوں نے سارا قصہ سنا اور پھر مجھے رضیہ کو لے جانے کی اجازت دے دی۔"

رضیہ نے پوچھا: "تو کیا آپ کو وہ روک بھی سکتے تھے؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میں پرائی لڑکی کو چرا کر لے جانے نہیں آیا ہوں۔ ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو لڑکیوں کو چرا لے جاتے ہیں۔"

"ہائے اللہ!"

"خیر یہ تو ہو گیا مگر مجھے اسی وقت خیال آیا کہ اس کا ایک بہت اچھا ڈراما بنایا جا سکتا ہے۔"

محمود نے کہا: "مگر دو برس کی بچی کیسے ڈراما کر سکتی ہے؟"

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ اس لیے ہمیں قصے کو ذرا بدلنا ہوگا۔ کچھ بڑھانا بھی ہوگا۔ مگر یہ تو تم سمجھ سکتے ہو کہ اس میں بہت سے ایسے موقعے اور ان کے ساتھ ایسی کیفیتیں دکھائی جا سکتی ہیں جن کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم لوگوں میں سے ہر ایک ڈرامے کا ایک قصہ سوچے اور پھر جو قصہ سب سے اچھا ہوگا، اسے ہم ڈراما کر کے دکھائیں گے۔ اس کا تم کو خیال رکھنا چاہیے کہ ڈرامے کی جان موقع اور کیفیت ہے۔ اور تمھارے قصوں میں جتنے اچھے وہ موقعے اور کیفیتیں ہوں گی جن کی نقل کی جا سکتی ہے، اتنا ہی اچھا ڈراما ہوگا۔ اچھا اب چلو تمھاری رضیہ کی اماں نے ناشتہ تیار کیا ہے۔ اس کے بعد پھر بیٹھ کر ڈرامے کا قصہ تیار کریں گے۔"

ڈرامے کا قصہ

ناشتے کے بعد پھر سب ماجد صاحب کے کمرے میں جمع ہوئے، انھوں نے کہا: ''ناشتے کے وقت محمود کچھ چپ چپ تھے، معلوم ہوتا ہے انھوں نے ڈرامے کے لیے کوئی قصہ سوچ لیا ہے۔''

محمود پہلے کچھ شرمایا۔ پھر اس نے کہا: ''میں نے کسی کتاب میں ایک قصہ پڑھا تھا کہ کچھ لوگ جنگل میں جا رہے تھے، کسی بہت خطرناک جگہ پر ڈاکوؤں نے انھیں گھیر لیا، مگر ایک لڑکے کی بہادری کی وجہ سے سب بچ گئے......''

رضیہ نے سر اٹھایا اور دیوار کی طرف دیکھ کر کہا: ''اور اس لڑکے کا نام محمود تھا۔''

محمود نے اپنی بات کو اس طرح جاری رکھا کہ گویا اس نے کچھ سنا ہی نہیں ہے: ''اصل بات یہ تھی کہ ڈاکوؤں کی سردار ایک عورت تھی جو مرد کا بھیس بنائے تھی۔ اس نے ڈاکے ڈالنے اس وجہ سے شروع کیے کہ بچپن میں وہ بہت شریر تھی۔ سب کی مار کھایا کرتی تھی، اور جب وہ بڑی ہوئی تو اس کا بدلہ لینے کے لیے ڈاکو بن گئی۔''

''جی ہاں۔''

ماجد صاحب نے کہا: ''ڈاکوؤں کے بہت سے قصے ہیں۔ ایک لحاظ سے وہ سب ڈرامے

کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ جنگل کا بھیانک منظر، مسافروں کا خوف، ڈاکوؤں کی وحشی صورتیں، ان کا بے گناہ مسافروں پر ظلم، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو ڈرامے کے لیے مناسب کیفیتیں پیدا کرتی ہیں، مگر ان کے ساتھ کوئی اچھا قصہ بھی ہونا چاہیے۔ ابھی تم بچے ہو، تمھارے دل میں جنگل کے خیال سے ہی خوف پیدا ہو سکتا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ہر ڈاکو کی صورت ڈراونی ہوتی ہے۔ اسے ظلم کرنے میں مزہ آتا ہے۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تمھیں جنگل کے خیال سے ڈر نہ لگے گا۔ تم نے اتنے اچھے برے لوگ دیکھے ہوں گے کہ ڈاکو بھی تمھیں آدمی ہی معلوم ہوں گے۔ تب تم کہو گے کہ جنگل میں ڈاکوؤں نے مسافروں کو لوٹ لیا تو اس میں کون سی بات ہے کہ اسے ایک اچھا قصہ سمجھا جائے۔ قصے میں تو اور خوبیاں بھی ہونی چاہیے جن سے آدمی اثر لے سکتا ہو۔ ایسے قصے کو اچھا ڈراما بنانے کے لیے جنگل کے منظر کو بھیانک بنانے کی خاص کوشش کرنی چاہیے۔ مسافروں کے خوف کو اس طرح دکھانا چاہیے کہ وہ بناوٹی نہ معلوم ہو اور اس واقعے کا کہ ڈاکوؤں نے مسافروں کو لوٹ لیا، کوئی مطلب کوئی مقصد ہونا چاہیے، جس سے معلوم ہو کہ یہ واقعہ کیوں بیان کیا گیا۔ کہو رضیہ کچھ سمجھ میں آیا؟''

رضیہ نے زور سے سر ہلا کر کہا: ''جی نہیں۔''

''خیر تو اب ہم ایک قصہ بنالیں گے۔ اس سے تم سمجھ جاؤ گی۔ ہاں محمود تم نے کیا کہا تھا؟ ڈاکوؤں کی سردار ایک عورت تھی؟ یہ بات دلچسپ تو ہے مگر اس کی وجہ سے قصہ بناوٹی معلوم ہوگا۔''

''جی ہاں، عورتوں میں اتنی ہمت کہاں ہوتی ہے کہ ڈاکو بن سکیں۔''

''نہیں ایسا تو نہیں ہے۔ لیکن ڈاکو زیادہ تر مرد ہی ہوتے ہیں۔ مجھے وہ بات زیادہ پسند آئی کہ یہ عورت بدلہ لینے کے لیے ڈاکو بن گئی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکو ایک قسم کا آدمی ہوتا ہے۔ جیسے شیر ایک خاص قسم کا جانور ہوتا ہے۔ اگر تم دکھاؤ کہ کوئی اس وجہ سے ڈاکو بن گیا کہ اس پر ظلم کیا گیا تھا تو اس میں خاص بات پیدا ہو جائے گی۔''

راشد کی آنکھیں ایک بارگی چمک اٹھیں: ''اچھا اور لڑکے کی باتیں سن کر ڈاکو کو خیال آتا ہے کہ جیسے پہلے لوگ مجھ پر ظلم کرتے تھے۔ ویسے ہی اب میں دوسروں پر کر رہا ہوں اور اسی وجہ سے وہ مسافروں کو چھوڑ دیتا ہے۔''

ماجد صاحب بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا: ''بھئی واہ راشد یہ تو تم نے بہت ہی پتے کی بات کہی۔ اس سے تو ہمارا قصہ بن گیا۔ لو اب میں تمھیں سارا قصہ سنا دیتا ہوں اس کے بعد تم اپنی اپنی رائے دینا۔''

ماجد صاحب نے تھوڑی دیر تک اپنی آنکھیں بند رکھیں اور پھر کہنے لگے:

''دہلی سے کچھ دور میوات کی طرف ایک گاؤں تھا۔ اس میں ایک آدمی رہتا تھا جسے سب عیدو عیدو کہتے تھے۔ یہ دل کا بہت اچھا مگر مزاج کا ذرا تیز تھا اور اس کی گاؤں کے نمبر دار اور چودھری سے لڑائی ہوگئی۔ ان دونوں نے ایسا کچھ کیا کہ عیدو کی ساری زمین چھن گئی اور وہ کسی الزام میں جیل خانے بھیج دیا گیا۔ عیدو کا اکلوتا لڑکا نواب جس کی عمر تقریباً سترہ برس کی تھی، اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ باپ کے جیل جانے کے تھوڑے دن بعد اس نے نمبر دار کو ایک ایسی لاٹھی ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور پھر وہ غائب ہوگیا۔ اس میں لیڈر بننے اور تنظیم کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے گرد چند آدمیوں کو جمع کیا اور ڈاکے ڈالنے لگا۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ ایک مرتبہ اسے معلوم ہوا کہ خزانے کی ایک تجوری جس میں کئی گاؤں کی مالگزاری ہے ایک خاص راستے سے جانے والی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ تجوری کے ساتھ سپاہی ہوں گے، مگر سپاہیوں اور پولیس والوں سے لڑنے میں اسے خاص مزا آتا تھا۔ اس نے خزانے کو لوٹنے کا بڑی ہوشیاری سے انتظام کیا۔ اتفاق سے سپاہیوں کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ ایک بنیا، ایک زمیندار، ایک کسان جو اپنے بھائی، اپنی بیوی اور بارہ تیرہ برس کے لڑکے کے ساتھ لڑکی کے لیے جہیز کا سامان خریدنے جا رہا تھا۔ سپاہیوں میں اور نواب کے آدمیوں میں لڑائی ہوئی جس میں کچھ سپاہی مارے گئے، کچھ زخمی ہوئے اور پھر نواب نے قافلے کو گھیر لیا۔ نواب کے آدمی چاہتے تھے کہ قافلے کے سارے آدمیوں کو مار ڈالیں جس میں ان کے خلاف کوئی گواہی دینے والا نہ رہ جائے۔ لیکن لڑکے نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ نواب نے سب کو چھوڑ دیا اور دنیا کی طرف سے اس کا دل ایسا صاف ہوگیا کہ اس نے چوری اور ڈاکہ ڈالنے سے توبہ بھی کر لی۔ کہو محمود قصہ ٹھیک ہے؟''

''جی ہاں ڈرامے کے لیے بہت اچھا رہے گا۔''

خالد نے کہا: ''مگر اس میں کوئی ہنسی کی بات بھی ہونا چاہیے۔''

رضیہ بولی: ''اور اس ڈرامے میں میں کیا کروں گی؟''

''یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں اور تمھیں معلوم ہے کہ ڈرامے اور قصے میں کیا فرق ہے۔ قصہ سنایا جاتا ہے اور ڈراما دکھایا جاتا ہے۔ اس میں الگ الگ سین اور منظر ہوتے ہیں اور ہمیں ایسے واقعات کو جیسے کہ نواب کا رفتہ رفتہ بہت مشہور ڈاکو بن جانا، اس طرح بیان کرنا ہوگا کہ وہ ڈراما دیکھنے والوں کو معلوم ہو جائے۔ مگر اسے الگ سے نہ دکھانا پڑے۔ قصے میں جو باتیں پھیلا کر بیان کی جاتی ہیں انھیں ڈرامے میں سمیٹ کر چند منظروں میں دکھانا ہوتا ہے۔ اچھا اب میں نے تم کو قصہ سنا دیا ہے اور وہ ڈرامے کے لیے مناسب بھی رہے گا۔ کل دفتر کی چھٹی ہے میں بیٹھ کر ڈراما لکھوں گا اور پرسوں تم سب آ جاؤ تو پھر اسے دکھانے کی بات چیت بھی ہو جائے۔''

ڈرامے کا خاکہ

صبح اٹھتے ہی رضیہ نے ماجد صاحب سے کہا: ''ابا جان آج آپ ڈراما لکھیں گے نا؟''

ماجد صاحب نے مسکرا کر کہا: ''جی سرکار لکھوں گا۔''

رضیہ نے اپنی اماں سے کہا: ''دیکھیے آج ابا جان کے پاس کوئی جانے نہ پائے اور آپ انھیں بازار بھی نہ لے جایئے گا۔''

''اچھا بھئی اچھا۔ آج تمھارے ابا جان کو بالکل چھٹی ہے۔''

ناشتے کے بعد ماجد صاحب سگریٹ پیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رضیہ ان کے پیچھے پیچھے گئی اور جب انھوں نے بہت سے کاغذ اپنے سامنے رکھ لیے اور لکھنے کو قلم اٹھایا تو وہ چپکے سے چلی آئی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جاتی اور جھانک کر دیکھتی کہ ابا جان کیا کر رہے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ وہ قلم سے ہی نہیں لکھتے، پنسل سے کچھ بنا بھی رہے ہیں۔ جب اس نے انھیں کئی مرتبہ یہی کرتے دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ اندر گئی اور دیکھنے لگی کہ ابا جان کیا بنا رہے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ کئی کاغذوں پر کھنچو نے کھنچے ہیں اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہیں۔

''ابا جان یہ آپ نے کیا بنایا ہے؟''

ماجد صاحب اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے: ''یہ منظروں کے خاکے ہیں۔''

''منظروں کے خاکے؟''

''جی ہاں۔''

ماجد صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔ رضیہ ان کی میز کے پاس کھڑی رہی۔ پھر ماجد صاحب نے کہا: ''اچھا اب آپ تشریف لے جائیے اور مجھے اپنا کام کرنے دیجیے۔''

رضیہ نے کھیسیں نکالیں۔ کچھ مچلی، کچھ ٹھنکی اور جگہ سے نہیں ہٹی۔

''پہلے یہ بتا دیجیے کہ آپ نے پنسل سے کیا بنایا ہے؟''

ماجد صاحب نے کھڑے ہو کر انگڑائی لی اور کمرے میں ٹہلنے لگے۔ اور پھر بولے:

''آدمی جب کچھ کرنا چاہے تو اسے پہلے سے سوچ لینا چاہیے کہ وہ اسے کیسے کرے گا۔ ہم جب بازار جاتے ہیں اور پہلے سے سوچ لیتے ہیں کہ کون سی چیز کہاں سے لیں گے تو وقت بھی بچتا ہے اور پیسہ بھی۔ جب کبھی ہم پہلے سے طے کر کے نہیں جاتے تو ہر قدم پر سوال اٹھتا ہے کہ کدھر جائیں۔ تمھاری اماں جان کچھ کہتی ہیں، میں کچھ کہتا ہوں، تم کچھ اور کہتی ہو، اسی میں جھگڑا ہوتا ہے۔ اب میں نے وعدہ کیا ہے کہ تم سب بچوں کے لیے ڈراما لکھوں گا۔ یہ تو میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ ڈرامے کا قصہ کیا ہوگا۔ میں نے اسے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، ساتھ ہی یہ سوچ لیا ہے کہ ہر حصے یا سین کا پس منظر کیا ہوگا۔ سین اور پس منظر کا مطلب میں اس وقت بتاؤں گا جب تم سب جمع ہو گے۔ اب بس بھاگ جاؤ نہیں تو کام ختم نہ ہو پائے گا۔''

''تو آج شام تک آپ ضرور کام ختم کر دیں گے؟''

''ہاں، بس اب چل دو یہاں سے۔''

رضیہ اچکتی ہوئی دروازے تک گئی، پھر مڑ کر کہا: ''نہیں ابا ابھی بتا دیجیے۔''

ماجد صاحب نے بناوٹی غصے سے کہا: ''چل بھاگ یہاں سے۔''

رضیہ پھر سے دروازہ بند کر کے بھاگ گئی اور ماجد صاحب پھر لکھنے لگے۔

دوسرے دن شام کو ماجد صاحب دفتر سے واپسی پر اپنے دروازے کے پاس پہنچے تو بچوں کا شور اور ہنسی مذاق سنائی دیا۔ وہ دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے۔ رضیہ کہہ رہی تھی:

''جناب، آپ لوگ ہیں کس خیال میں۔ یہ ڈراما آپ لوگوں سے نہیں کیا جائے گا۔ اس

میں چار سین ہیں اور ہر سین کا ایک پس منظر ہے۔ میں نے اماں سے پوچھا تھا۔ انھیں بھی نہیں معلوم کہ پس منظر کیا ہوتا ہے۔"

ماجد صاحب نے ہنس کر دروازہ کھولا اور کہا: "اچھا آپ سب لوگ جمع ہو گئے!"

رضیہ کرسی کے ہتھے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ ایک پیر گدی پر تھا دوسرا ہوا میں چکر لگا رہا تھا۔ ابا کو دیکھتے ہی وہ اچھلی اور گھر کے اندر غائب ہو گئی۔ ماجد صاحب مسکراتے ہوئے اپنے کمرے میں گئے اور منہ ہاتھ دھویا۔ پھر ڈرامے کا مسودہ لے کر آئے۔ جیسے ہی وہ بیٹھے رضیہ چپکے سے آئی اور ان کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ ماجد صاحب نے مسودے کو ترتیب دیتے ہوئے کہا:

"اچھا بھئی اب کام بہت ہے، آپ لوگ ذرا غور سے سنیے۔ آپ کو نواب ڈاکو کا قصہ جو میں نے پچھلی دفعہ سنایا تھا، یاد ہے نا؟ اب میں نے اسے لکھ لیا ہے۔"

رضیہ بولی: "جی ہاں اور اسے آپ نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور یہ سوچ لیا ہے کہ ہر حصہ یا سین کا پس منظر کیا ہوگا۔ آپ نے کہا تھا کہ سین اور پس منظر کا مطلب میں اسی وقت بتاؤں گا جب تم سب جمع ہو جاؤ گے۔ کہی۔"

رضیہ دبک کر ماجد صاحب کی کرسی کے پیچھے چھپ گئی۔ ماجد صاحب نے کہا: "یہ لڑکی ہے تو بڑی شیطان مگر بات ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ڈراما چار حصوں میں ہے۔ اسے تقسیم کرتے وقت مجھے دو باتوں کا خاص طور سے خیال رکھنا تھا۔ ایک تو یہ کہ ہم آدمی بہت تھوڑے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے پاس سامان بہت کم ہے۔ میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ قصہ سنایا جاتا ہے اور ڈراما دکھایا جاتا ہے۔ دکھانے کے لیے ایک تو آدمی چاہیے اور دوسرے جگہ۔ تم جانتے ہو ایسے آدمیوں کو کیا کہتے ہیں جو ڈراما دکھانے میں حصہ لیتے ہیں؟"

محمود نے کہا: "جی ہاں۔ انھیں اداکار یا ایکٹر کہتے ہیں۔"

رضیہ بولی: "جیسے آپ۔"

ماجد صاحب نے کہا:

"ہاں اور جس جگہ ڈراما دکھایا جائے اسے اسٹیج کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑا بھی ہو سکتا ہے اور بہت چھوٹا بھی۔ دسہرے میں رام چندر جی کی زندگی کے حالات، ان کا سیتا سے بیاہ، ان کی راون سے لڑائی وغیرہ سب دکھائے جاتے ہیں تو اسٹیج ایک بہت بڑا میدان ہوتا ہے۔ ہم ڈراما دکھائیں گے

تو کسی کمرے کا ایک حصہ ہمارا اسٹیج ہوگا۔ ڈرامے کے پہلے حصے میں ہمیں دکھانا ہے کہ نواب ڈاکو کے باپ پر کیا گزری۔ ہمیں تماشائیوں کو یہ بھی بتانا ہے کہ یہ واقعہ ہوا کہاں۔ گاؤں میں، کھیت میں، یا راستے میں۔ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ پیچھے ایک پردہ ڈال دیں جس پر گاؤں کی ایک بڑی سی تصویر بنی ہو۔ تصویر میں مکانات ہوں۔ کچھ درخت ہوں جیسے کہ گاؤں میں ہوتے ہیں۔ یا ہم گاؤں کی جگہ کھیت دکھا سکتے ہیں۔ مگر ان کی بھی تصویر بنانی ہوگی۔ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ صرف ایک پردہ ڈال دیں جس کا رنگ ایسا ہو جو قصے سے مناسبت رکھتا ہو، جیسے کالا رنگ......"

راشد نے بات کاٹ کر کہا:

"جی ہاں اور اسے سیدھا لٹکانے کے بجائے ذرا ترچھا لٹکا دیجیے، جس سے معلوم ہو کہ یہ آسمان ہے اور اس پر غم چھایا ہوا ہے۔"

ماجد صاحب نے بہت خوش ہو کر کہا: "خوب، راشد نے بہت اچھی بات کہی...... اچھا یہ تو ایک سین یا منظر اور اس کا پس منظر ہو گیا۔ دوسرے پس منظر دکھانے میں بھی ہم کو ایسی تدبیریں کرنی ہوں گی۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی سوچنا تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ کتنے ایکٹر جمع کر سکتے ہیں اور ڈراما لکھتے وقت میں نے اس کا بھی خیال رکھا ہے۔ اچھا اب ڈراما سن لو۔"

ماجد صاحب نے ڈراما پڑھ کر سنایا اور سب نے اسے بہت پسند کیا۔ سب چاہتے تھے کہ اسے جلد سے جلد کر کے دکھائیں۔ ماجد صاحب نے کہا:

"ہاں میں بھی چاہتا ہوں کہ اسے جلد دکھاؤں۔ ایک مہینے بعد رضیہ کی سالگرہ ہونے والی ہے اور ڈرامے کی تیاری میں کم از کم ایک مہینہ لگے گا۔ میں اس درمیان میں دوستوں سے کچھ مشورہ کر لوں۔ پھر تیاری شروع کریں گے مگر بھئی ڈراما ایسا ہو کہ سب خوب تعریف کریں۔"

محمود نے کہا: "جی ہاں، انشاء اللہ بہت اچھا ہوگا۔"

رضیہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا:

"ذرا آپ کی صورت تو دیکھیے، چلے ہیں ڈراما کرنے!"

ڈرامے کی تیاری

ڈراما سنانے کے تین دن بعد ماجد صاحب نے محمود، راشد اور خالد کو پھر اپنے ہاں بلایا۔ اس مرتبہ ان کے پانچ ساتھی اور بھی بلائے گئے۔ آزاد، محسن، احسن، یونس اور طیب۔ یونس سب سے چھوٹا تھا۔ مگر سب جانتے تھے کہ وہ تیز بھی ہے۔ وہ رضیہ سے بھی چھوٹا تھا اور رضیہ اسی سے کچھ دبتی تھی، اس لیے کہ وہ بات بات پر لڑنے کو تیار ہو جاتا تھا اور بہت زور سے مکّے مارتا تھا۔ ماجد صاحب نے پہلے سب کی دعوت کی اور جب سب کھا پی چکے تو کہا:

''اچھا بھئی آج سے ڈرامے کی تیاری شروع کریں گے۔ میں نے ڈرامے کی کئی نقلیں کرالی ہیں اور اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کس کو کیا بننا ہے۔ یعنی اس کا پارٹ ہوگا۔ نواب ڈاکو کے باپ عیدو کا پارٹ خالد ادا کریں گے۔ نواب ڈاکو کا پارٹ محمود، نمبردار کا پارٹ ارشد، آزاد اس کسان کا پارٹ ادا کریں گے جو اپنی بیوی اور لڑکے کے ساتھ زیور خریدنے جاتا ہے۔ بنیے کا پارٹ محسن کریں گے، زمیندار کا پارٹ احسن۔ کسان کا لڑکا یونس بنیں گے اور طیب، نواب ڈاکو کے ایک ساتھی۔ کسان کی بیوی رضیہ بنیں گی۔''

رضیہ بڑی زور سے چلائی: ''جی نہیں، جی نہیں، میں نہیں بنوں گی۔''

رضیہ نے مچلنا اور ہاتھ پیر پٹکنا شروع کر دیے مگر لڑکوں نے اسے گھیر لیا اور ڈانٹ ڈانٹ کر کہنے لگے: ''آپ بنیں گی کیسے نہیں۔ آپ کو ضرور بننا پڑے گا۔ ماجد صاحب نے جو پارٹ مقرر کیا ہے، وہ آپ کو ضرور کرنا ہوگا۔''

رضیہ نے لڑکوں کے تیور دیکھے تو چپ ہوگئی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بات اسے بہت بری لگی۔ ماجد صاحب نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا اور کہا:

''اچھا آپ لوگ ڈرامے کی ایک نقل لیجیے۔ اس میں اپنا پارٹ آپ کو خوب اچھی طرح سے یاد کرنا ہوگا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ پورا ڈراما بہت اچھی طرح سے اور بار بار پڑھ لیں۔''

محمود نے کہا: ''جی ہاں! جس میں کوئی آخر وقت میں اپنا پارٹ نہ کر سکیں تو اس کی جگہ لے سکیں۔''

ماجد صاحب نے کہا: ''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ اگر آپ پورا ڈراما پڑھیں گے اور اس سے اثر لیں گے تو آپ اپنا پارٹ بہت بہتر ادا کر سکیں گے۔''

راشد نے پوچھا: ''تو پھر ماجد صاحب اب پہلی مشق کس دن ہوگی؟''

ماجد صاحب نے کہا: ''یہ تو بھئی آپ لوگ مجھے بتایئے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلی مشق ہو تب بھی آپ لوگ کتاب دیکھے بغیر اپنے اپنے پارٹ ادا کر سکیں۔ میرے خیال میں آج سے ایک ہفتے بعد، یعنی اگلے اتوار کو آپ سب لوگ تیار ہو کر آئیں۔''

اتوار تک سب نے اپنے اپنے پارٹ یاد کر لیے تھے اور ماجد صاحب بہت خوش ہوئے۔ رضیہ اپنا پارٹ کرتے ہوئے بہت شرمائی۔ مگر پارٹ اس کو بھی خوب یاد تھا۔ ماجد صاحب ساتھ ساتھ بتاتے بھی جاتے تھے کہ یہ بات اس طرح سے نہیں اس طرح سے کہو، ہاتھ یہاں رکھو، اس طرح اشارہ کرو، آخر میں ماجد صاحب نے کہا: ''بھئی مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ لوگوں میں ڈراما کرنے کی بہت بڑی صلاحیت ہے۔ اچھا اب میں نے جو کچھ بتایا ہے اسے یاد رکھیے۔ اگلے اتوار کو پھر مشق کریں گے اور اس کے بعد غور کریں گے کہ آپ کی شکل وصورت کیسی بنائی جائے اور لباس کیا ہو۔''

اگلے اتوار کو سب جمع ہوئے تو محمود نے کہا:

''ماجد صاحب آج مشق جلدی سے کرا لیجیے، پھر ہمیں بتایئے کہ صورت کیسی بنائیں اور کپڑے کیسے پہنیں۔''

ماجد صاحب نے کہا: ''بہت اچھا، اب شروع کر دیجیے۔''

مشق کے بعد ماجد صاحب نے پھر سب کی تعریف کی اور کہا:

''اب ہمیں چاہیے کہ ایک ایک کر کے سب کی صورت شکل اور لباس کا معاملہ طے کر لیں۔ اسٹیج پر سب سے پہلے عیدو آتا ہے۔ میرے خیال میں اسی سے شروع کرنا چاہیے۔ کیوں خالد صاحب آپ اپنے لیے کیسی شکل صورت پسند کریں گے؟ آپ تو مشق کرتے وقت بھی اپنی کمر ذرا جھکا کر بوڑھے آدمی بن جاتے تھے۔ میری رائے میں اگر آپ کے ایک پگڑی باندھ دی جائے اور ہلکی سی داڑھی لگا دی جائے تو آپ بوڑھے محنتی کسان کا نمونہ بن جائیں گے۔ آپ کا لباس ایک سوتی بنڈی اور دھوتی ہونا چاہیے۔ کیوں؟''

خالد نے کہا: ''جی ہاں یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔ مگر داڑھی کیسے لگائیں گے؟''

''داڑھیاں بازار میں بنی بنائی ملتی ہیں مگر مجھے یہ پسند نہیں ہیں اور آپ کے لیے بہت بڑی بھی ہوں گی۔ میں نے بمبئی میں ایک دکان کو لکھا ہے۔ وہاں سے وہ خاص طور سے تیار کیے ہوئے بال بھیج دیں گے اور ایک خاص قسم کا گوند جس سے وہ چپکائے جاتے ہیں۔ آپ داڑھی کی فکر نہ کیجیے وہ تو ایسی لگ جائے گی کہ معلوم ہو بالکل قدرتی ہے۔ پہلے سین میں نواب کے داڑھی مونچھ لگانے کی ضرورت نہیں اور ان کا لباس ایک دھوتی ہوگی مگر آپ نمبردار صاحب، آپ کی کیا شکل ہو؟''

محمود نے کہا: ''ماجد صاحب اور کچھ ہو یا نہ ہو ان کی آنکھیں لال خونی ہونی چاہییں۔''

ماجد صاحب نے کہا: ''کیوں بے چارے کی آنکھ میں پیاز ڈلوانا چاہتے ہو؟''

''جی نہیں، مگر ان کی آنکھیں دیکھ کر ہی تو مجھے غصہ آئے گا اور میں کھینچ کر لاٹھی ماروں گا۔''

ماجد صاحب نے کہا:

''خیر تو یہ اپنی آنکھیں ذرا مل کر لال کر لیں گے۔ میرے خیال میں ان کی داڑھی منڈی ہوئی، مونچھیں خوب لمبی ہونی چاہییں، جس میں یہ مونچھوں پر تاؤ دے سکیں۔ ان کے سر پر گلابی پگڑی ہو تو مناسب رہے گا اور اس کے ساتھ ایک کرتا اور دھوتی۔ کیا رائے ہے نمبردار صاحب، یہ

شکل ٹھیک ہو گی؟"

راشد نے کہا: "جی ہاں اور پیر میں ایک نیا لال جوتا بھی ہو تو اچھا ہے۔"

ماجد صاحب نے کہا:

بہت ٹھیک ہے۔ میاں آزاد کا لباس ایک معمولی کسان کا سا ہوگا اور یونس صاحب بہت آسانی سے کسان کے لڑکے بن جائیں گے۔ بنیے کا لباس میاں محسن جانتے ہیں کہ کیسا ہوتا ہے۔"

محسن نے کہا: "جی ہاں، ایک میلی سی دو پلی ٹوپی، میلا سا کرتا، اس کے اوپر ایک ڈھیلا ڈھیلا سا کوٹ، جو معلوم ہو کہ مانگے کا ہے۔ میلی سی دھوتی اور جگہ جگہ ٹکا ہوا شو جوتا۔"

راشد نے کہا: "اور صورت سے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ آدمی بہت مسکین ہے، مگر آنکھوں میں بے مروتی ہونا چاہیے۔"

ماجد صاحب نے کہا:

"یہ تو نمو نے کے بنیے کا بہت اچھا سراپا ہے۔ اب رہ گئے زمیندار صاحب۔ ان کے لیے اچکن، ٹوپی، چوڑی دار پائجامہ مناسب ہوگا۔ یہ فیشن ایبل بننا چاہیں تو چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی لگا سکتے ہیں مگر یہ ایسی نہ معلوم ہوں جیسی کہ قدرت پیدا کرتی ہے بلکہ اس طرح کی جیسی کہ نائی تجویز کرتا ہے۔"

احسن کچھ شرما کر مسکرایا گویا اسے یہ حلیہ پسند ہے۔

ماجد صاحب نے کہا:

"اب رہ گئے نواب ڈاکو اور ان کے ساتھی طیب۔ انھیں میں کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ وہ چاہیں تو ڈراؤنی شکلیں بنا سکتے ہیں۔ چاہیں تو بھلے آدمیوں کی صورتیں۔ ان کے لیے بندوقوں اور کارتوسوں کی پیٹیوں کا میں انتظام کر دوں گا۔"

محمود نے کہا: "ماجد صاحب آپ کسان کی جورو کو تو بھول ہی گئے۔"

رضیہ نے لپک کر محمود کا منہ نوچ لیا اور گھر کے اندر بھاگ گئی۔

☆☆☆

کھیتی

کردار (اشخاص)

عبدالغفور	:	
مولوی عبدالرحمان	:	
کرم علی	:	مال دار تاجر
دلدار حسین	:	رئیس، زمیندار، میونسپلٹی کا ممبر جو شہر کے بااثر آدمیوں میں سے ہے۔
حشمت اللہ	:	میونسپلٹی کا ایک ملازم۔ خوش حال آدمی
حسام الدین	:	تعلیم یافتہ، خاصا خوش حال زمیندار، شہر کے قریب ایک قصبے میں رہتا ہے۔
عبدالقیوم	:	طالب علم
محمد حسین	:	طالب علم
عبداللطیف	:	طالب علم
مولا بخش	:	لوہار
اللہ دین	:	مولا بخش کا بھتیجا

ایک مستری، دو مزدور، خادم، مجمع کے لوگ،
غریب اور میلے کپڑوں میں راہ رو وغیرہ۔

پہلا ایکٹ

پہلا سین

(حسام الدین کے مکان کے سامنے پھلواری۔ دائیں بائیں پھول دار
درختوں کی قطاریں۔ پیچھے مکان کے سامنے کا حصہ، بیچ میں ایک میز ہے
جس کے ایک طرف حسام الدین اور دوسری طرف حشمت اللہ بیٹھا ہے۔
میز پر چائے لگی ہے اور حشمت اللہ کے ہاتھ میں پیالی ہے۔)

حسام الدین: کہیے چائے بہت بدمزہ تو نہیں ہے؟ میں تو آپ جانتے ہیں کبھی پیتا دیتا نہیں۔ آپ کے آنے کی خبر سنی تو جلدی سے منگوا بھیجی۔ معلوم نہیں، نوکر کون سی پتی لایا اور کیسے بنائی۔ سچ پوچھیے تو مجھے چائے کے معاملے میں ذرا بھی تمیز نہیں۔

حشمت اللہ: (مسکرا کر) خیر آپ نے چائے چھوڑ دی یہ اچھا کیا۔ اس کم بخت سے تو صرف معدہ ہی خراب ہوتا ہے۔ مگر میں آپ کے اس بن باس کا قائل نہیں۔

حسام الدین: جناب بن باس بہت بڑا لفظ ہے۔ مجھ جیسوں کی نسبت اسے استعمال کر کے آپ اس کی خواہ مخواہ ذلت کرتے ہیں۔ میں نہایت لالچی دنیا دار آدمی ہوں، پیسے پیسے پر جھگڑا

کرتا ہوں۔ پیسے پیسے کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہوں۔ کہاں میں اور کہاں بن باس!

حشمت اللہ: پیسہ تو پھر بھی بہت ہوا۔ روپے کی قدر کرنے والے تو کوڑیوں کے پیچھے بھی جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔ میرا مطلب مگر کچھ اور ہی تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کا ہم لوگوں سے، مہذب، تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت سے، شہری زندگی کی دلچسپیوں سے الگ ہونا برا ہے۔ آپ کفایت شعار ہمیشہ سے تھے۔ یہ تو مجھے بھی خوب معلوم ہے، لیکن بے لطفی سے زندگی بسر کرنا کیسی کفایت شعاری ہے۔ شہر میں خرچ زیادہ ہوتا ہے یہ میں نے مانا، مگر آپ تو خدا کے فضل سے خوش حال ہیں۔ آپ کو کاہے کی فکر ہے، سلیقے سے خرچ کیجیے، چین سے رہیے۔ جائیداد کے انتظام کے لیے کوئی آدمی رکھ لیجیے۔ کچھ ایسا دشوار کام تو ہے نہیں، اور نہ اس میں آپ کی سی قابلیت کے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔

حسام الدین: جی میں اپنی قابلیت اور استعداد کو خوب جانتا ہوں۔ ورنہ یہاں کی تنہائی کیوں گوارا کرتا، مگر میرا رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ عقل مند ہو کر شہر میں رہنے سے بے وقوف ہو کر گاؤں میں رہنا بہتر ہے۔ یہاں صحبت نہیں، دل چسپیاں نہیں، مگر بھوک خوب لگتی ہے، نیند بھی خوب مزے کی آتی ہے اور مجھ جیسوں کو اس سے زیادہ اور چاہیے کیا؟

حشمت اللہ: نہیں بھائی، ہم پر تو اس زبردستی کے انکسار کا اثر ہوتا نہیں اور نہ ہم آپ کا اس طرح گاؤں میں بیٹھ کر عمر ضائع کرنا گوارا کر سکتے ہیں۔ قوم کو آپ جیسے تعلیم یافتہ اور روشن خیال جوانوں کی بہت سخت ضرورت ہے، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔ اس صورت میں یہاں پڑے رہنا اپنے فرض سے منہ چھپانا ہے۔ جب ناخدا ہی منہ چھپا کر بیٹھ رہے تو قوم کا بیڑا کیا خاک پار پہنچے گا۔

حسام الدین: اجی کیسا بیڑا اور کہاں کے فرائض؟ دو برس تک شہر کی خاک چھانتا رہا کسی نے پوچھا تک نہیں۔ اب ذرا دل کو سمجھا بجھا کر یہاں رہنے پر راضی کیا ہے تو آپ پہنچے فرض اور ناخدائی کا قصہ سنانے۔ میں تو اب یہاں سے کھسکتا نہیں۔

حشمت اللہ: خیر آپ کھسکنا نہ چاہیں تو کوئی آپ کو کھسکا بھی نہیں سکتا مگر آپ کی شکایت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ عبدالغفور صاحب ہمارے معزز قومی رہنما تو آپ کے عزیز ہوتے ہیں

اور جہاں تک میں اندازہ لگا سکتا ہوں، انھیں آپ کی سرپرستی کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا۔ وہ تو بہت خوش ہوں گے۔ اگر آج کل جیسے مشکل زمانے میں آپ ان کی مدد کو پہنچیں۔ دلدار حسین، ہمارے شہر کے روح رواں، بھی ہمیشہ سے آپ کو مانتے ہیں۔ مولوی عبدالرحمان صاحب جب دیکھیے اسی کا دُکھڑا روتے ہیں کہ میرا حسام الدین جب سے گاؤں میں بیٹھ رہا تب سے محفلیں سونی پڑ گئی ہیں، گفتگو بے مزہ ہوگئی ہے۔ آخر یہ سب لوگ آپ کے بزرگ ہی تو ہیں۔ ان کا دل نہ دکھایئے۔

حسام الدین: جناب میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ دو برس شہر کی خاک چھان چکا ہوں۔ آپ شاید میرا مطلب نہیں سمجھے، یہی رہنما اور سرپرست اور قدر دان تھے جن کی بدولت میری عمر ضائع ہوئی۔ دودھ کا جلا ہوں۔ اب تو چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیوں گا۔

حشمت اللہ: ارے بھائی کمزوریاں ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ ان کو معاف کر دینا چاہیے اگر ہر شخص تمھاری طرح بگڑ بیٹھا کرے تو دنیا کا کام کیسے چلے۔ چھوٹی چھوٹی...... باتیں ہیں، انھیں اتنی اہمیت نہیں دینا چاہیے۔ بس اب غصہ تھوک دو۔ چلو لطف رہے گا......(ذرا سوچ کر) اور مانا کہ آپ کا غصہ بے جا نہیں۔ پھر بھی یہاں بیٹھے بیٹھے کڑھنے سے آخر کیا فائدہ۔ اپنی ہی عمر بے لطفی سے گزرے گی۔ یہاں کوئی ایسا بھی تو نہیں کہ جی گھبرائے تو دو چار باتیں کرلو......نہ تھیٹر ہے نہ سینما، عورتوں کی شکلیں جو یہاں نظر آتی ہیں وہ بھی ماشاء اللہ...... کپڑے ایسے کہ جدھر جائیں ادھر بدبو پھیلا دیں۔ بھولے سے ان کی طرف دیکھ لو تو ہفتے بھر آنکھیں دکھتی رہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بھلے آدمی کے رہنے کی جگہ ہے۔

حسام الدین: (جس نے تقریر غور سے نہیں سنی ہے اکتائے ہوئے لہجے میں) جی ہاں، میں یہاں آیا تھا تو نفاست اور تہذیب کو خیر باد کہہ کر، اور اب ان کو دور ہی سے سلام ہے۔

حشمت اللہ: مگر آخر کیوں؟

حسام الدین: (بیزار ہوکر) جناب سنیے۔ جو شخص ہفتے بھر کام کرنے کے بعد ایک دن گپ بازی کرے اسے تو اس میں لطف آسکتا ہے اور ایسی تفریح کا اس کو ایک طرح سے حق بھی

ہے، لیکن ہفتے میں ساتوں دن فضول بکواس کرنا وقت خراب کرنا ہی نہیں بلکہ شہداپن ہے۔ میں خود اس کا تجربہ کر چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جب تک کوئی کام کرنے کو نہ ہو آدمی کو آپ ہی آپ یہ روگ لگ جاتا ہے۔ رہا کام، سو نوکری میں کرنا نہیں چاہتا۔ تجارت کا مجھے ڈھنگ نہیں آتا، کسی فن کو میں جانتا نہیں کہ اسی میں اپنی جان کھپادوں۔ قوم کی خدمت کرنے کی میں دو سال فکر میں رہا۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ ایسا بھی تو نہ ملا جو مجھے بتا سکے کہ کیا کرنا چاہیے اور کیوں اور کیسے؟ خدمت، خدمت سب چلاتے ہیں، مگر سوا اس کے کہ وہ چلاتے ہیں، میں نے انھیں اور کوئی خدمت کرتے دیکھا نہیں۔ ممکن ہے قوم لوگوں کے اسی طرح چلانے سے جاگ اٹھے۔ لیکن یہ جگانے کا نہایت ایک بے تکا طریقہ ہے اور ہماری قوم بڑی ہی نکمی ہے۔ اگر اٹھتے ہی وہ اپنے جگانے والوں کو تھپڑ نہ لگائے۔ میں نہ قوم کو اس طرح جگانا چاہتا ہوں نہ بعد کو تھپیڑ کھانا۔ قوم سوتی ہے تو اسے اس کی نیند مبارک ہو۔ میں اس میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا اور جگے تو اسے نئی زندگی مبارک ہو، میرے لیے یہ ذرا سی کھیتی اور چھوٹا سا اسکول کافی ہے۔ مجھ میں نہ اتنی ہمت ہے نہ اتنا حوصلہ کہ ساری قوم کو جگانے یا ٹھیک رستے پر چلانے کا ذمہ اپنے سر لوں۔

حشمت اللہ: واہ، واہ، واہ! آپ بھی بڑی جلدی بگڑ جاتے ہیں۔ میں نے تو بس دوستانہ طریقے پر مشورہ دیا تھا کہ شہر میں چل کر رہیے۔ میں آپ کو خفا تھوڑے ہی کرنا چاہتا ہوں۔ یوں تو آپ کا جہاں جی چاہے رہیے، میرا تو اس میں کوئی نقصان نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی بات کہنے کے لیے......

حسام الدین: (کچھ دیر سوچ کر، اور ٹھنڈی سانس بھر کر) جی ہاں وہ بزرگ جن کے نام آپ نے مجھ پر رعب جمانے کو سنائے تھے آخر میں سب کے سب یہی کہہ کر پہلو بچا لیتے ہیں۔ آپ کے عبدالغفور صاحب نے قوم کی خدمت کے سلسلے میں بزازوں کے مقابلے میں بڑی دھوم دھام سے ایک کپڑے کی دکان کھلوائی تھی۔ کسی تاجر نے حماقت سے اپنا روپیہ لگا دیا۔ بچارے کا کپڑا سارا مفت منگوا منگوا کر پہن ڈالا اور جب اس نے ضرورت کے

وقت تھوڑا سا روپیہ قرض مانگا تو اس سے خفا ہو گئے۔ سارے شہر میں منادی کرا دی کہ اس کے یہاں کوئی بھولے سے بھی بالشت بھر کپڑا نہ لے اور غریب کو بالکل تباہ کر دیا۔ پھر یہ دکھانے کو کہ ایک نالائق سوداگر کے دیوالیے ہو جانے سے قوم مایوس نہیں ہو سکتی، انھوں نے ایک اور شخص کو آٹے کی دکان کھولنے پر طرح طرح کے وعدے کر کے آمادہ کر لیا۔ اس کی بھی وہ حالت ہے کہ خدا رحم کرے۔

حشمت اللہ: (ہنس کر) ہاں، وہ بھی بہت جلد ختم ہو جائے گی، کچھ حالات ایسے ہی ہیں...... لیکن عبدالغفور صاحب میں یہ کمزوری ہے کہ وہ ہر کام سے بہت جلد گھبرا جاتے ہیں اور استقلال سے اس میں جٹے نہیں رہتے۔ تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ ہوں یا کوئی اور سب ایسا ہی کریں گے۔ آپ کی طبیعت میں تو ماشاء اللہ استقلال کی کمی نہیں......

حسام الدین: عبدالغفور صاحب ہوں یا میں یا کوئی اور، سبھی ایک سے ہیں۔ وہی ایک موٹی سی بات ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی...... خیر...... اگر آپ چائے پی چکے ہوں اور سیر کرنا چاہیں تو چلیے آپ کو اپنا نیا آموں کا باغ دکھالاؤں، نہیں تو پھر بہت دیر ہو جائے گی۔

حشمت اللہ: (جلدی سے چائے کی پیالی ختم کر کے) ضرور چلیے۔

(دونوں اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔)

(پردہ)

دوسرا سین

(عبدالغفور کے مکان کا ایک کمرہ۔ اس میں ایک دری بچھی ہے، پیچھے کی دیوار سے لگا ہوا ایک قالین ہے جس پر گاؤ تکیہ رکھا ہے—— دلدار حسین قالین کے ایک طرف، مولوی عبدالرحمان اور کرم علی دوسری طرف بیٹھے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد عبدالغفور داخل ہوتا ہے۔ سب اس کے آتے ہی السلام علیکم کہہ کر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔)

عبدالغفور: وعلیکم السلام...... (تینوں کو کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے) ارے ہائیں ہائیں ہائیں، آپ لوگ مجھے اس تکلف سے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ بھلا میں اس لائق ہوں کہ آپ حضرات میرے داخل ہونے پر کھڑے ہوں، بلکہ آپ لوگوں کو تو مجھے دیکھتے ہی ڈانٹنا چاہیے تھا کہ اتنی دیر ہم کو بٹھائے کیوں رکھا، آپ الٹی تعظیم کرتے ہیں...... دلدار حسین صاحب آپ مسند پر تشریف رکھیے۔ مجھ سے یہ گستاخی نہ ہوسکے گی کہ آپ کی موجودگی میں مسند پر بیٹھوں (دلدار حسین جھک کر سلام کرتا ہے اور ہاتھ کے اشارے سے انکار کر دیتا ہے) تو پھر مولوی صاحب آپ ہی تکلیف فرمائیے (مولوی صاحب کی بانہہ پکڑ کر) بس آیئے، آیئے، تکلف نہ کیجیے۔

مولوی عبدالرحمان: نہیں صاحب، میں کیسے مسند پر بیٹھ جاؤں۔ آپ میزبان ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے جلسے کے صدر ہیں۔ مسند پر آپ کے سوا کسے بیٹھنے کا حق ہوسکتا ہے؟ بس اب تکلف نہ کیجیے۔ بسم اللہ تشریف رکھیے۔

عبدالغفور: تو پھر مجبوری ہے۔ (تینوں کو سلام کر کے مسند پر بیٹھ جاتا ہے) ......معاف کیجیے گا، آپ حضرات کو اتنی دیر منتظر رکھا۔ کیا کروں آج کل تو ایسی مصیبت میں پھنسا ہوں۔ بیوی بیمار، لڑکیاں بیمار، بچہ بیمار، ڈاکٹر حکیم جتنے ہیں وہ سب اپنی اپنی تشخیص کرتے ہیں، اپنی اپنی دوائیں لکھ جاتے ہیں۔ اتنا مجھ پر احسان کرتے ہیں کہ فیس نہیں لیتے، اور لیتے بھی تو غریب اور دیوانہ دیتا کہاں سے، مگر ان کی دوائیں خریدتے خریدتے دیوالہ نکلا جاتا ہے۔ ذرا مہلت ملے تو کچھ کماؤں، خاندان کی کچھ خبر لوں۔ مگر میرا دل کب مانتا ہے کہ اپنی اغراض پوری کرنے کے لیے ملت اور قوم کی ضرورتوں کو نظرانداز کروں۔ مولوی صاحب میری ساری زندگی آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ایک دن آرام سے نہیں گزرا، ایک رات چین سے نہیں سویا ہوں۔ صرف اس ڈر سے کہ کہیں میری غفلت سے ملت کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور قیامت کے روز کوئی مسلمان بھائی کھڑا ہو کر خدا سے میری شکایت کرے کہ اس شخص نے، جس کو تو نے ہمارا پاسبان بنایا تھا اپنا فرض ادا نہیں کیا اور اپنی فکروں میں ایسا ڈوب گیا کہ ملت کی آبرو تک کی خبر نہ رہی۔ دلدار حسین صاحب میرے بزرگ ہیں انھیں بہت کچھ میری نسبت معلوم ہے۔ میری غریبی پر ان کو ترس آتا ہے برسوں سے سمجھا رہے ہیں کہ سب کی فکر کرتا ہے۔ اپنی اور اپنے گھر کی بھی تجھے کوئی خبر ہے؟ اب بیچارے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے ہیں۔ گھر والوں کی شکایتیں سنتے سنتے میں بے حیا ہو گیا ہوں، مگر کیا کروں سب کچھ برداشت کرتا ہوں، اس لیے کہ وہ درد جو قوم کی حالت دیکھ کر دل میں اٹھتا ہے اور ساری تکلیفوں سے کہیں زیادہ شدید ہوتا ہے۔ میرا پہلے ارادہ تھا کہ عمر کے صرف چند سال ہی قوم کی نذر کروں گا مگر وہ مدت کبھی پوری نہ ہوئی...... (منہ پر ہاتھ پھیر کر) خیر! یہ داستان تو بہت لمبی ہے۔ اسے سنا کر میں آپ حضرات کا وقت خراب نہیں کرنا چاہتا۔ اب اگر آپ

اجازت دیں تو آپ کے سامنے وہ معاملہ پیش کروں جس کی وجہ سے آپ حضرات کو تکلیف دی ہے۔

دلدار حسین: جی فرمائیے!

عبدالغفور: یہ تو آپ حضرات سے کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس مسئلے کا آپ سے ذکر کرنے والا ہوں اس میں میری کوئی ذاتی غرض نہیں۔ میرے چاہے کوئی دس جوتے مارے، مجھے کوئی پروانہ ہوگی۔ دعادے کر بیٹھا رہوں گا۔ اگر اس کا ثبوت درکار ہو تو کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے مجھ پر روزانہ ایسے وار ہوتے ہیں جو جوتوں کی مار سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں، کیونکہ ان سے دل پر چوٹ لگتی اور آبرو پر حرف آتا ہے۔ میں بیچارا غریب، جواب دوں بھی تو کس کس کا، صبر کرکے بیٹھ رہتا ہوں اور خدا سے دعا مانگ لیتا ہوں کہ دل کو درد سے محفوظ رکھنا منظور نہیں تو کم سے کم آبرو میں بٹا نہ لگنے دے۔ اور میرا یہ رویہ کچھ آج یا کل کا شروع کیا ہوا نہیں۔ میری بچپن سے یہ عادت رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ بھائی جان مرحوم نے اماں جان سے میری جھوٹی شکایت کردی۔ انھوں نے مجھے بہت ڈانٹا، ایک وقت کا کھانا نہیں دیا اور کئی روز تک ناراض رہیں مگر بھائی جان مرحوم کے خلاف میری زبان سے ایک حرف نہ نکلا۔ اس کا بھائی جان کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اس دن سے پھر کبھی مجھ پر خفا تک نہ ہوئے۔ اور اماں اگر کبھی سزا دینا چاہتیں تو ہمیشہ رو دھو کر مجھے بچا لیتے۔ مرتے دم تک مرحوم کا یہی سلوک رہا۔ لوگوں نے میرے خلاف انھیں بہت بھڑکایا، لیکن انھوں نے کبھی کسی کی بات نہ سنی، اور بہتوں کو یہ واقعہ سنا کر ایسا قائل کردیا کہ وہ بھی مجھے ماننے لگے۔ خیر یہ داستان بہت لمبی ہے اسے سنا کر میں آپ حضرات کا وقت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اب اصل واقعہ سنیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بھگوان ملز کے احاطے کے سامنے ایک کشادہ میدان ہے جس میں مل کے مسلمان ملازم اکثر مغرب کی نماز پڑھا کرتے ہیں۔ میدان میں شام کے وقت پان، تمبا کو، پوری، کچالو وغیرہ کی دکانیں لگ جاتی ہیں اور آپ تو خوب جانتے ہیں کہ مسلمان کی جیب میں پیسہ پہنچ جائے تو اسے پھینکنے کی فکر میں کیسا دیوانہ ہوجاتا ہے۔ غرض کہ میدان میں جو دکانیں

لگتی ہیں یایوں کہیے لگتی تھیں، ان کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی اور ہمارے مسلمان بھائی جو دن بھر محنت کر کے نکلتے تھے، ان کی اچھی خاصی تفریح۔ مگر شام کو نماز ضرور ہوتی تھی۔ آپ لوگوں کا...... ادھر کیوں کبھی گزر ہوتا ہوگا، لیکن میں اکثر وہاں نماز پڑھ چکا ہوں۔ ایک دو بار جب امام صاحب بیچارے نہیں آسکے تو پڑھا بھی چکا ہوں۔ اب آپ بتایئے کہ اس سے کس کا نقصان ہوتا تھا، جو لوگ وہاں دکانیں لگاتے تھے، ان کا یا جس شخص کی زمین پر دکانیں لگتی تھیں اور جو دکان داروں سے کڑا کرایہ وصول کرتا تھا اس کا، یا مل والے کا، جس کے ملازموں کو مفت میں تفریح کا موقع مل جاتا تھا؟ مگر نہیں صرف اس وجہ سے کہ سیر کے لیے زیادہ تر مسلمان آتے تھے اور دکان دار بھی زیادہ تر مسلمان ہی ہوتے تھے، جناب پروپرائٹر صاحب بھگوان مل نے زمین کے مالک سے، جو ظاہر ہے کہ ہندو ہیں، اس لیے کہ غریب مسلمان کو بھلا کب کوئی ایک گز بھر زمین خریدنے دے گا۔ جناب ان دونوں نے کہہ سن کر میونسپلٹی سے ایک نوٹس لگوادیا کہ اس زمین پر دکانیں لگانا اور جماعت سے نماز پڑھنا اور غالباً گھومنا پھرنا بھی منع ہے اور میونسپلٹی والوں نے اس خیال سے کہ ان کے نوٹس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جائے گی، پولیس کو ہدایت کی کہ وہاں باقاعدہ پہرہ رکھا جائے۔ اب کسی کی مجال نہیں کہ وہاں جا کر ٹہلے یا دکان لگائے یا نماز پڑھے۔ آپ خود غور کیجیے کہ یہ کیسا کھلا جبر اور تشدد ہے اور کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، جناب فوراً دعوا دائر ہو جائے۔ فوجداری کا مقدمہ چل جائے۔ اخباروں میں فساد پھیلانے کا الزام اعلانیہ لگایا جائے اور یہ اندیشے ظاہر ہونے لگیں کہ یہ مسلمان غدار ضرور شاہ افغانستان کو ہندوستان فتح کرنے کی دعوت دے کر رہیں گے۔ بنیے کی بزدلی کا ٹھکانا، اپنی جان اور مال کے لیے وہ جتنا ڈرائے، دھمکائے اور جھوٹ الزام لگائے وہ کم، مگر لطف تو یہ ہے کہ سچ بولے یا جھوٹ، زبان اسی کی ہے۔ اخبار اسی کے، نیوز ایجنسی اسی کی، ہم بچارے کچھ کرنا چاہیں تو کیا کریں اور کہیں بھی تو کس سے، ہمارے اپنے آدمی اسی کی بات سنتے ہیں اور مجبوراً اسی کو مانتے ہیں۔ میں تو برسوں سے اس شہر کے تمام مالدار مسلمان بھائیوں کو سمجھا رہا ہوں کہ کسی طرح سے تھوڑا سا سرمایہ

اکٹھا کر کے اپنی نیوز ایجنسی قائم کیجیے۔ اس کی کامیابی کا میں ذمہ دار، اس میں خرچ برائے نام ہے اور نفع بے انتہا۔ مجھے تو ایک مسلمان نیوز ایجنسی کی کامیابی کا اتنا یقین ہے کہ اکثر حضرات سے میں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر سالانہ پچاس فی صدی سے کم فائدہ ہو تو بقیہ رقم وہ مجھ سے لے سکتے ہیں (مسکرا کر) اس لیے کہ جہاں انھیں معلوم ہے کہ میں مفلس ہوں وہاں مجھے بھی معلوم ہے کہ مطالبہ کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ مگر مجھ غریب کی بات کون سنتا ہے، کون مانتا ہے۔ اخبار پر خرچ کرنے کو اکثر راضی ہو جاتے ہیں، لیکن اصل چیز جو ہے، یہ (مسکرا کر) اخبار کی اماں نیوز ایجنسی اس بیچاری کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اپنی نیوز ایجنسی کے بغیر اخباروں کا وہی حال رہے گا جو اس بچے کا ہوتا ہے جسے ماں کا دودھ نصیب نہیں ہوتا۔ اسی بچے کی طرح یہ ہمیشہ کمزور اور بیمار رہیں گے۔ خیر یہ داستان تو بہت لمبی ہے۔ اسے کب تک سناؤں۔ آپ سمجھیں گے آپ کا وقت خراب کر رہا ہوں، مگر اب واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس مسجد کو ناپاک لوگوں کے پنجے سے بچانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

مولوی عبدالرحمان: مسجد کون سی؟

عبدالغفور: واہ مولانا، دین کے عالم ہو کر ایسا سوال! میں تو سمجھتا ہوں کہ ہر وہ جگہ جہاں مسلمان جمع ہو کر نماز پڑھا کریں، وہی مسجد ہے، خواہ وہاں کوئی عمارت ہو یا نہ ہو، اور میرا خیال ہے کہ عام طور سے مسلمان سب یہی سمجھتے ہیں۔ شریعت کی رو سے مجھے یقین ہے کہ مسجد کی تعریف یہی ہوگی اور اس کے سوا اور کوئی ہو بھی نہیں سکتی۔ خیر تو آپ اگر اجازت دیں تو میں نے جو تدبیریں اس مسجد کو محفوظ رکھنے کی سوچی ہیں وہ آپ کو سمجھاؤں اور پھر آپ حضرات سے جس امداد کی توقع رکھتا ہوں، وہ بھی عرض کر دوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہم دباؤ ڈال کر میونسپلٹی کو اس معاملے میں دخل دینے سے روک دیں۔ میونسپلٹی کو ایسے معاملوں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں اور ممبران بورڈ پر یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے کہ غریب اور حقیر مسلمان گو اس کے پاس لنگوٹی کے سوا کچھ نہ ہو، اپنے مذہب کے معاملے میں کسی کی دولت اور جاہ وحشم کی پروا نہیں کرتا اور اس معاملے میں دخل دے کر میونسپلٹی

والے پچھتائیں گے۔ دوسری بات جو میں نے طے کی ہے یہ ہے کہ اس معاملہ کا مسلمانوں میں خوب چرچا کیا جائے تا کہ صرف اس شہر میں نہیں بلکہ کل ہندستان میں بچے بچے کو معلوم ہو جائے کہ دشمنوں نے اس کے دین وایمان کو نعوذ باللہ ذلیل کرنے کی کیسی تدبیریں سوچی ہیں۔ مولوی صاحب! آپ کو تو صرف ایک فتوے کی تکلیف دوں گا کہ وہ جگہ جہاں مسلمان بڑی تعداد میں اور پابندی سے نماز کے لیے جمع ہوں، شریعت کی رو سے مسجد کہلائے گی۔ اور لوگوں کو اس جگہ نماز پڑھنے سے زبردستی روکنا گویا ایک بنی بنائی مسجد کو توڑنا ہے (مولوی صاحب کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، مگر عبدالغفور انھیں موقع نہیں دیتا) اس میں تو غالباً آپ کو کوئی عذر نہ ہوگا۔ کرم علی صاحب! آپ کو بہت زیادہ زحمت دینے پر مجبور ہوں۔ آپ شہر کے سب سے ممتاز سوداگر ہیں اور تاجروں کی جماعت پر آپ کے برابر کسی کا اثر نہیں۔ خدا کے فضل سے آپ لوگوں میں دین داری بھی بہت ہے اور تجارت سے میونسپلٹی کو جو آمدنی ہوتی ہے اور اس کے ذریعے سے آپ بورڈ پر جو اثر ڈال سکتے ہیں اس میں شک کی گنجایش نہیں۔ اگر آپ تاجروں کی جماعت میں مسجد کی حفاظت کے لیے تحریک کریں اور ایک زوردار ریزولیوشن پاس کر کے ممبران بورڈ کی عقل درست کر دیں تو ملت کی آبرو رہ جائے گی۔ اس کے علاوہ اور ایک درخواست یہ ہے کہ ریزولیوشن کے ساتھ ہی آپ چندہ بھی جمع کیجیے۔ اگر آپ نے صرف ریزولیوشن پاس کر دیا تو اس کا کوئی خیال نہ کرے گا، لیکن اس کے ساتھ ہی دس پندرہ ہزار چندہ بھی جمع ہو گیا تو سب کے کان کھڑے ہو جائیں گے اور سب کو یقین ہو جائے گا کہ آپ صرف باتیں ہی نہیں بناتے بلکہ میدان عمل میں بھی اللہ اکبر کہہ کر قدم رکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔ (دلدار حسین کی طرف مخاطب ہو کر) دلدار حسین صاحب سے کیا کہوں میں نے انھیں سارا ماجرا اپنا اور ملت کا سنا دیا ہے اور میرا ارادہ ہے کہ سب کچھ انھیں کے سپرد کر دوں، وہ رئیس ہیں، بورڈ کے ممبر ہیں، سب کے محسن اور کرم فرما ہیں، ان کی بات کا سب کو خیال ہوگا۔ ان کی خواہش سب کے لیے ایک حکم ہے جس کو ماننے سے انکار کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ بہتر یہی ہے (دلدار حسین صاحب

سے پھر مخاطب ہو کر) کہ میں سارا معاملہ آپ ہی کے سپرد کردوں اور خود آپ کے حکم پر عمل کرنے کو حاضر ہو جاؤں۔

دلدار حسین: (کچھ روکھے پن سے) مجھے آپ معاف رکھیے تو بہتر ہوگا۔ میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ ایسے ہنگاموں میں شریک ہوں۔

عبدالغفور: جی ہاں، یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں۔ آپ کی صحت واقعی ایسی ہے کہ آپ زیادہ دوڑ دھوپ کے کام نہیں کر سکتے۔ لیکن میرا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ آپ خود زیادہ زحمت فرمائیں، ہم کو تو صرف آپ کی سرپرستی درکار ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ بھی اس تحریک میں پورے طور پر شریک ہیں۔ اور آپ نے بھی دین کی حمایت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ باقی سب آپ ہم پر چھوڑ سکتے ہیں۔ فی الحال اگر آپ اس اعلان پر جو میں شائع کرنے والا ہوں دستخط کر دیں اور بورڈ کے اگلے جلسے میں ایک ریزولیوشن پیش کر دیں کہ میونسپلٹی کا مذہبی معاملوں میں دخل دینا دستور کے خلاف ہے اور بھگوان ملز کے سامنے کی مسجد میں نماز بند کرنا خلاف قانون اور بڑے ظلم کی بات ہے، تو کافی ہوگا۔ میرے خیال میں یہ دونوں کام زیادہ مشکل نہیں ہیں۔ اعلان لکھا ہوا موجود ہے، ریزولیوشن کا مسودہ بھی آپ فرمائیں تو فوراً تیار ہو سکتا ہے، بس، اس کے علاوہ......

دلدار حسین: جی ہاں، اعلان پر دستخط کرنا اور بورڈ میں ریزولیوشن پیش کر دینا تو کوئی مشکل کام نہیں، لیکن ایمان داری کی بات یہ ہے کہ پہلے میں خود بھی اس معاملے میں تفتیش کر لوں پھر دیکھا جائے گا۔

عبدالغفور: تفتیش بڑی خوشی سے کیجیے، لیکن میں نے جو کچھ بتایا اس سے زیادہ آپ کو شاید ہی معلوم ہو سکے۔ بہرحال جیسا آپ مناسب سمجھیں۔

دلدار حسین: بہت اچھا، تو پھر اب مجھے اجازت دیجیے۔

عبدالغفور: تشریف لے جائیں گے؟ بہت اچھا۔ (سب اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دلدار حسین سب کو خاموشی سے سلام کر کے چلا جاتا ہے) دیکھا آپ نے مولوی صاحب، ابھی چھپ کر تیسری شادی کی ہے۔ ذرا سا کام پڑا تو کہتے ہیں کہ صحت خراب ہے۔ (درد

بھرے لہجے میں) سچ ہے مولوی صاحب! اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے مگر امیر آدمی کا جنت میں داخل ہونا دشوار ہے۔ حضرت رئیس ہیں، بااثر ہیں، بہت اچھی استعداد رکھتے ہیں۔ مگر کیا مجال جو ہم مذہبوں کی ذرا بھی خدمت کریں۔ کوئی ہندو اگر کچھ کہے تو فوراً کرنے کو تیار ہیں۔ مسلمان بیچارا خوشامد کرے کہ میرا بھی ذرا سا کام کردو تو سیکڑوں اڑنگے لگائیں گے۔ ہا، کتنے افسوس کی بات ہے مولوی صاحب! سب کچھ برداشت ہوسکتا ہے۔ مفلسی، بھوک، پیاس، جسمانی تکلیفیں مگر جو چوٹ اپنوں کی سرد مہری اور عداوت سے دل پر لگتی ہے وہ نہیں سہی جاتی...... خیر تو کرم علی صاحب آپ تو ملت پر یہ احسان ضرور کریں گے کہ تاجروں کی انجمن کا ایک جلسہ کرادیں اور اتنا چندہ جمع کرلیں کہ ہم غریبوں کی ہمت بندھ جائے، اگر فتوے سے آپ کے کام میں مدد مل سکے تو مولوی صاحب اس کا بھی آپ کے لیے سامان کردیں گے، تو مولوی صاحب، پھر رہے ایک زوردار فتوا۔ بس اب چندروز کے لیے بھول جایئے کہ آپ ایک یتیم خانے کے منتظم ہیں اور اس کام کو جو ملت کے لیے بہت زیادہ ضروری ہے کرڈالیے۔

مولوی عبدالرحمان: (ڈرتے ڈرتے) جی ہاں، لیکن فتوا اگر صرف میرا نہ ہو بلکہ سارے علما کی طرف سے جاری کیا جائے تو اس کا اثر بہت زیادہ ہوگا۔ میں لوگوں کی رائے دریافت کرکے جلد سے جلد آپ کو مطلع کردوں گا۔

عبدالغفور: خیر آپ کی طرف سے مجھے بالکل اطمینان ہے۔ اگر اپنے سوا، میں کسی کے دل کی نسبت کہہ سکتا ہوں کہ وہ ملت کے سچے درد سے بھرا ہے تو وہ آپ کا ہے۔

کرم علی: (اٹھ کر) اچھا تو پھر اب اجازت دیجیے جو کچھ ہوسکتا ہے کروں گا۔

عبدالغفور: بہت اچھا، السلام علیکم۔

مولوی عبدالرحمان: سلام علیکم۔

کرم علی: وعلیکم السلام۔

(کرم علی دروازے پر ہے کہ حشمت اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے)

حشمت اللہ کی آواز: عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں؟

(اس کے بعد حشمت اللہ داخل ہوتا ہے، اس کے پیچھے عبدالقیوم، محمد حسین اور عبداللطیف آتے ہیں، عبدالغفور اور مولوی عبدالرحمان کو سلام کر کے بیٹھ جاتے ہیں)

عبدالغفور: (بڑے تپاک سے) کہو بھائی حشمت کیسے آئے۔ (مسکرا کر) کوئی نئی خبر ہے؟

حشمت اللہ: (جس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا ہے) جی کچھ نہیں (عبدالقیوم اور اس کے دو ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے) آپ حضرات میرے یہاں تشریف لائے تھے کہ عبدالغفور صاحب سے ہماری مجلس میں تقریر کرنے کی گذارش کر دیجیے۔ اس لیے انھیں لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ تینوں حضرات یونیورسٹی کے طالب علم ہیں اور آپ نے مسلمان طلبہ کی ایک مجلس قائم کی ہے جس کے آپ، عبدالقیوم صاحب صدر ہیں اور آپ محمد حسین صاحب سکریٹری، آپ کا اسم شریف عبداللطیف ہے۔ تینوں ماشاء اللہ بہت ہونہار طالب علم ہیں اور آپ کے پیرو بننے کے بہت مشتاق، اگر فرصت ہو تو کوئی تاریخ مقرر کر دیجیے۔

عبدالغفور: (مولوی عبدالرحمان صاحب سے مخاطب ہو کر اور حشمت اللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مولوی صاحب، ہم کو تو بس ایسا آدمی پسند ہے۔ اپنا کام اس پابندی اور سلیقے سے کرتے ہیں کہ برابر ترقی ہوتی رہتی ہے اور پھر ساتھ ساتھ ہر قومی مسئلے سے دلچسپی بھی ہے اور ہر وقت اپنی سی کرنے پر آمادہ بھی رہتے ہیں (طالب علموں سے مخاطب ہو کر) ہاں بھائی، تم جب بھی کہو ہم آنے پر راضی ہیں۔ اب تو کچھ صورت ایسی ہو گئی ہے کہ جتنی تقریریں ہوں اور جتنا شور مچے اتنا ہی اچھا ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم بالکل بے بس اور بے زبان ہیں، اور ان کو دکھانا ہے کہ ان کا یہ خیال سراسر غلط ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ تم لوگوں نے اپنی مجلس قائم کی ہے۔ بہت اچھا ہے۔ تم مسلمان ہو، نوجوان ہو، تم جتنا ہاتھ پیر مار کر اپنی اہمیت اور اپنے جوش کا احساس اپنے اور دوسرے کے دلوں میں پیدا کرو، اتنا اچھا ہے۔ اچھا تو پھر میری طرف سے وعدہ ہے، جب کہو آ کر تقریر کروں گا، اور انشاء اللہ تمھارا جوش دگنا ہو جائے گا۔ میں منمنانے کا تو قائل نہیں، جب بولتا ہوں تو کڑک کر بولتا ہوں۔

(پردہ)

تیسرا سین

(ایک بڑا کمرہ، داہنی طرف ایک بڑی میز بچھی ہے جس کے دائیں طرف تین کرسیاں رکھی ہیں۔ میز سے تھوڑے فاصلے پر اسٹیج کے بیچ میں اور بائیں حصے میں کرسیوں کی بے ترتیب قطاریں ہیں۔ جلسہ ابھی ختم ہوا ہے۔ میز کے قریب عبدالقیوم، محمد حسین اور عبداللطیف کھڑے ہیں۔ حسام الدین اور حشمت اللہ اسٹیج کے بائیں جانب سے سامنے آتے ہیں۔)

حشمت اللہ: (عبدالقیوم سے مخاطب ہوکر) کہیے آپ کو تقریر پسند آئی؟ دیکھیے یہ حسام الدین صاحب گھنٹوں سے میرے پیچھے پڑے ہیں۔ کہتے ہیں تقریر بالکل مہمل تھی۔ اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور ہر سمجھدار آدمی کو جب کہیں بدقسمتی سے ایسی تقریروں سے بچنے کی اور کوئی صورت نہ ہو تو کان میں روئی ٹھونس لینا چاہیے۔

عبدالقیوم: (حسام الدین کو اوپر سے نیچے تک دیکھ کر) میں نے تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونسی نہیں۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تقریر نہایت دلچسپ اور ہمت افزا تھی یوں تو ''فکر ہر کس بقدر ہمت اوست'' (ہر آدمی کا خیال اس کی ہمت اور حوصلے کے مناسب ہوتا ہے) عبدالغفور صاحب پر اس کا الزام کیوں لگایا جائے؟

حسام الدین: بالکل بجا فرمایا۔ مجھے امید ہے آپ کی بلند حوصلگی قوم کو بہت جلد مردانگی سکھا دے گی۔

عبدالقیوم: جناب میں نے اپنی نسبت تو کوئی دعوا کیا نہیں تھا۔ صرف اتنا عرض کیا تھا کہ عبدالغفور صاحب کی تقریر بہت ہمت افزا تھی۔

حسام الدین: جی ہاں میرا مطلب بھی یہی تھا، آپ میں ہمت تھی اور عبدالغفور صاحب نے اسے دوبالا کر دیا...... حشمت صاحب مجھے لگی ہے گنواروں کی سی بھوک، آپ جلدی سے گھر چل کر مجھے کچھ کھلا یئے ورنہ......

عبدالقیوم: امید ہے جو قوت آپ میں تقریر سے نہیں پیدا ہوئی وہ پیٹ بھر کھانے سے ہو جائے گی۔

حسام الدین: جی ہاں، انشاء اللہ (حشمت اللہ کا ہاتھ پکڑ کر) بس اب چلیے حضرت!

(دونوں چلے جاتے ہیں)

عبداللطیف: واہ بھائی، ایسا فرمایشی گنوار آج تک نہیں دیکھا تھا!

محمد حسین: آخر جب ان لوگوں کے دماغ میں کوئی بات گھستی نہیں تو پھر یہ تقریریں سننے کا حوصلہ کیوں کرتے ہیں؟

عبدالقیوم: اسی کا تو عبدالغفور صاحب دکھڑا رویا کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو ذرا بھی ترقی کی خواہش ہوتی ہے ان لوگوں کو یہ جانوروں کی سی سمجھ، اور گنواروں کی سی بھوک پست کر دیتی ہے۔ کہاں عبدالغفور صاحب کی تقریر، کہاں حسام الدین صاحب کی سمجھ، تعلیم کچھ بھی نہیں، دل مردہ ہے۔ بھوک کے سوا کسی چیز کا احساس نہیں۔ چلے عبدالغفور صاحب پر نکتہ چینی کرنے...... اچھا سنو بھائی محمد حسین! اس تقریر کا ایک خلاصہ اخباروں میں بھیجنا ہے، اسے تیار کر لینا چاہیے اور تقریر کے بعد ہم نے عبدالغفور صاحب کی تعریف میں جو کچھ کہا تھا وہ بھی اگر چھپ جائے تو وہ ہم سے خوش ہو جائیں گے۔

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

(دلدار حسین صاحب کے مکان کا ایک کمرہ، جدید طرز پر آراستہ۔ داخلے کا دروازہ سامنے ہے۔ دلدار حسین داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے خادم۔)

دلدار حسین: (اِدھر اُدھر دیکھ کر) کہاں ہیں وہ صاحب؟

خادم: باہر ہیں حضور۔ ابھی بلاتا ہوں۔

(خادم چلا جاتا ہے اور دلدار حسین ایک تھکے ماندے آدمی کے انداز سے ایک کوچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں عبدالقیوم اندر آتا ہے اور نوکر جو اسے پہنچانے آیا ہے دروازے سے واپس چلا جاتا ہے)

عبدالقیوم: (بہت جھک کر) آداب عرض کرتا ہوں۔

(دلدار حسین بغیر منہ سے بولے سلام کا ہاتھ سے جواب دیتا ہے اور پاس ایک کوچ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عبدالقیوم دلدار حسین کو ایک سفارشی خط دے کر کوچ کے سرے پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بیٹھنے کا طریقہ بہت بے

ڈھنگا ہے اور وہ گھبرایا ہوا ہے)

دلدار حسین: (خط پر ایک سرسری نظر ڈال کر) جی فرمائیے......

عبدالقیوم: جناب کو خط سے میری نسبت کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔ میں نے بی۔اے پارسال فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ اس وقت ایم۔اے میں پڑھ رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے میونسپلٹی کے صدر دفتر میں ایک جگہ خالی ہوئی ہے، جس کے لیے ایک بی۔اے کی ضرورت ہے۔ استعداد آپ کو خط سے معلوم ہو گئی ہوگی۔ اگر آپ تھوڑی سی تکلیف فرمائیں اور میری سفارش کر دیں تو بڑی عنایت ہوگی اور میں تمام عمر آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ اس جگہ کے لیے امیدوار تو بہت ہوں گے لیکن میرا حق کسی سے کم نہیں اور اگر آپ میری سفارش کر دیں تو مجھے یقین ہے کہ میں کامیاب رہوں گا۔

دلدار حسین: آپ کی عملی استعداد کا مجھے اس خط کے علاوہ اور ذریعوں سے بھی علم ہو گیا ہے، اور مجھے جو ذرا سا تامل ہے وہ اسی وجہ سے، ایسی ملازمت تو ہرگز آپ کے شایانِ شان نہیں۔ کہاں آپ اور کہاں یہ ڈیڑھ سو کی نوکری۔

عبدالقیوم: (کچھ پریشان ہو کر) میں سمجھا نہیں۔ جناب نے......

دلدار حسین: موٹی سی بات ہے۔ نوکری وہ بیچارے کرتے ہیں جن میں کسی قسم کی قابلیت نہیں ہوتی اور جن کے دلوں میں قومی درد کی گرمی نہیں ہوتی۔ آپ کے سامنے ایک نہایت ہمت افزا مثال موجود ہے جس سے آپ اپنی قابلیت کا استعمال کرنا بہت اچھی طرح سیکھ سکتے ہیں۔ آپ نے تو غالباً ایک جلسے میں اعلان بھی کیا تھا کہ ہر مسلمان کو، جو دل میں درد رکھتا ہے، چاہیے کہ عبدالغفور صاحب کی پیروی کرے اور انھیں کی طرح اپنی جان اور اپنے مال کو قوم پر صدقہ کر دے۔ بس آپ نے جو کچھ کہا تھا وہی کیجیے، نوکری پر لات ماریئے۔

عبدالقیوم: جی ہاں مجھ سے غلطی تو ہوئی، مجھے اس جلسے کی صدارت ہی منظور نہ کرنا چاہیے تھی۔ مگر کیا کرتا۔ لوگوں نے ایسا مجبور کیا اور جب صدر ہوا تو مروت میں خواہ مخواہ عبدالغفور صاحب کی تھوڑی بہت تعریف کرنی ہی پڑی۔ ورنہ میں ہرگز ان کا معتقد نہیں۔ میں محنت کر کے روزی کمانے کو سنت رسول سمجھا ہوں اور جس طرح عبدالغفور صاحب لوگوں سے قوم کے نام پر چندہ مانگ کر اپنے اوپر خرچ کرتے ہیں وہ میرے نزدیک کسب حلال

نہیں، اس لحاظ سے تو ان کی پیروی کرنا ایک اخلاقی جرم سمجھتا ہوں۔

(خادم اندر آتا ہے)

خادم: حضور! کرم علی صاحب اور مولوی عبدالرحمان صاحب تشریف لائے ہیں۔

دلدار حسین: (مسکراتے ہوئے) اچھا تو انھیں یہیں بلا لاؤ (عبدالقیوم سے) جناب میں پچھلے پندرہ سال کے عرصے میں اکثر بورڈ کا ممبر رہا ہوں اور بہت سے لوگوں کی سفارشیں کر چکا ہوں اور نوکر ہونے کے بعد ان کا رویہ بھی میری نظروں کے سامنے رہا ہے۔ آپ کو نوکر رکھوا کر مجھے سخت پریشانی ہوگی۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ آپ کی قوم پرستی مجھے کھلتی ہے۔ آپ سچے قوم پرست ہوتے تو میں آپ کے لیے جی توڑ کوشش کرتا، مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ آپ دبو، خوشامدی اور ناقابل اعتبار ہیں۔ آپ اپنے افسروں میں ایک کی دوسرے سے برائی کیا کریں گے، آپ پر جس نے بھروسا کیا وہ دھوکا کھائے گا اور پچھتائے گا۔ ممکن ہے دنیا میں زیادہ لوگ آپ ہی جیسے ہوں لیکن میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ خدا حافظ!

(مولوی عبدالرحمان اور کرم علی داخل ہوتے ہیں۔ عبدالقیوم کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ان لوگوں کو دیکھ کر رہ جاتا ہے۔ دونوں دلدار حسین سے سلام علیکم کہہ کر اس کے اشارے پر بیٹھ جاتے ہیں)

دلدار حسین: (عبدالقیوم سے) بس اب تشریف لے جایئے۔ اگر آپ نے اس سبق سے فائدہ اٹھایا اور وفاداری اور استقلال کی قدر پہچان لی تو آپ کے لیے بہت سی نوکریاں خالی ہو جائیں گی۔ (عبدالقیوم چلا جاتا ہے) فرمایئے مولوی صاحب! آپ تو اسی چکر میں ہوں گے۔

مولوی عبدالرحمان: جی ہاں!

دلدار حسین: میں بھی اسی میں مبتلا ہوں۔ کل بھگوان داس صاحب تشریف لائے۔ شکایت کرنے لگے کہ ان سے مشورہ کیے بغیر میں عبدالغفور صاحب کی تحریک کا حامی کیوں بن گیا اور دو سو روپے چندہ کیوں دے دیا۔ میں نے کہا میں اس تحریک میں ہوں، نہ اس کی مالی امداد کی ہے۔ تب انھوں نے اخبار دکھایا۔ اس میں میرا نام اور نام کے آگے دو سو چندہ وصول

ہونے کی اطلاع شکریے کے ساتھ تھی۔ میں حیران ہوا۔ اور سوچتا رہا کہ آخر یہ کس نے میرے نام سے چندہ داخل کیا۔ اتفاق سے خیال آگیا۔ عبدالغفور صاحب کا آدمی دوا فروشوں کے بل لے کر میرے پاس آیا تھا اس کے ساتھ عبدالغفور صاحب کا ایک خط تھا، جس میں انھوں نے بلوں کی ادائیگی میں مدد دینے کی التجا کی تھی۔ میں نے سوچا تحریک سے الگ رہنے کی بنا پر وہ مجھ سے بہت خفا ہوں گے۔ اگر ان کی مدد کروں تو شاید اسے ایک ذاتی احسان سمجھ کر رام ہو جائیں مگر انھوں نے جناب اسے چندے میں شامل کر لیا۔ اگر میں کبھی پوچھوں تو کہہ دیں گے کہ بھائی، کیا کرتا لوگ آئے تھے میرے پاس ان دو سو کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس لیے اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے روپیہ دے دیا۔ تم تو جانتے ہو کہ قومی اغراض کے سامنے میں اپنی ضروریات کا خیال کر ہی نہیں سکتا، وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے تو اپنا کام بہت صفائی سے نکال لیا۔ چندے کا اعلان کر کے مجھے اپنی تحریک میں پھنسا دیا اور اپنے بل بھی ادا کر دیے، لیکن آپ یہ بتائیے کہ میں بھگوان داس صاحب سے کیا کہتا۔ کچھ عذر کرتا تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتے اور یہ کہتا کہ تحریک میں شریک ہوں تو بات جھوٹی ہوتی۔ عبدالغفور صاحب کو بدنامی سے بچانے کے لیے میں بہت صدمے اٹھا چکا ہوں۔ اب زیادہ نیاز مندی ممکن نہیں اس لیے میں نے بھگوان داس کو سب کچھ سمجھا دیا اور ان سے التجا کی کہ میری صفائی میں بھی اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ خیر میرا تو ذاتی معاملہ ہے مگر آپ تو یتیم خانے کے کاموں میں ایسے ڈوبے رہتے ہیں کہ دنیا کی خبر تک نہیں ہوتی۔ آپ کو اس جھگڑے میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔

مولوی عبدالرحمان: کیا بتاؤں بری طرح پھنسا ہوں۔ میں واقعات دریافت کرنے اور علما سے مشورہ لینے میں مشغول تھا کہ ایک روز میرے نام سے ایک بہت زوردار فتوا شائع ہو گیا۔ کس کس کو سمجھاتا کہ یہ سب جعل سازی ہے۔ عبدالغفور صاحب کی مروت میں چند دوستوں کے سوا کسی سے کچھ نہیں کہا اور اب ہر وقت سوچتا رہتا ہوں کہ تحریک سے کیسے الگ رہوں، جلسوں میں شریک نہ ہونے کے کیا عذر پیش کروں، جس جہاد کی میرے نام سے دھمکی دی گئی ہے اس کو کیسے سمجھاؤں۔ عجیب جھمیلے میں پڑ گیا ہوں۔

دلدار حسین: (مسکرا کر) جی ہاں! حالت آپ کی بے شک قابلِ رحم ہے، مگر آپ جیسے بامروت اور راست باز لوگوں کا عبدالغفور صاحب کے پنجے سے بچنا مشکل ہے۔ انھیں عرصہ کے بعد اپنا جوش ظاہر کرنے اور چندہ وصول کرنے کا بہانہ ملا ہے اور وہ اس سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ مسلمانوں کی فطرت کچھ ایسی ہے اور معاشی حالت ایسی کہ وہ زندگی، خاص طور سے سکون کی زندگی سے بے زار رہتے ہیں۔ انھیں نشے کی حاجت ہوتی ہے اور عبدالغفور صاحب نشہ بہت سستا بیچتے ہیں۔ ہم اور آپ اگر کسی سے کہیں کہ بھائی اس جنگ میں فتح اسی کی ہے جو استقلال اور تندہی سے اپنے کام پر جٹا رہے تو وہ سمجھے گا کہ ہمیں بنیوں نے خرید لیا ہے اور اب ہم صرف بنیوں کی سی بات کہہ سکتے ہیں۔

مولوی عبدالرحمان: جی ہاں مجھے اپنی عمر میں صرف ایک ایسا آدمی ملا ہے جو سچے دل سے اس کا قائل ہے اور وہ ہے میرا شاگرد حسام، آپ بھی اسے جانتے ہوں گے۔ دو سال تک وہ عبدالغفور کا ملازم بن کر رہا، اس وجہ سے نہیں کہ ان کے فریب میں آ گیا تھا اور اصلیت سے واقف نہیں تھا بلکہ محض اس لیے کہ ایسا اور کوئی شخص اسے نظر نہیں آتا تھا جو اس کی خدمت اور ایثار کی پیاس بجھانے کا وعدہ کرے، لیکن آخر میں وہ بیزار ہو کر چلا گیا۔ اب وہ گاؤں میں ہے اور جسے دیکھنا ہو کہ کام کرنے والے کیسے کام کرتے ہیں وہ اس کے گاؤں میں چلا جائے۔ وہاں کی صفائی، کاشت کاروں کی خوش حالی اور زمیندار کی نیک نیتی اور ہمدردی پر ان کا اعتبار، اس کا چھوٹا سا اسکول دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ خوشی تو مجھے یہ ہے کہ اس نے گاؤں کی عورتوں کو وہ فن سکھا دیا ہے جسے وہ برسوں سے بھولی بیٹھی تھیں۔ اب آپ جس گھر کے پاس سے گزریں گے اس میں سے چرخے کی آواز آتی ہے... رکتے ہوئے سوت کے ڈھیر ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ حسام الدین آٹھ سال سے ہمہ تن اس کام میں مصروف ہے۔ سارا وقت، ساری آمدنی اور سارے دنیاوی حوصلے اسی کی نذر کر دیے ہیں — اور دیکھیے —!

دلدار حسین: جی ہاں، حسام الدین کے استقلال کی میں بھی آزمائش کر چکا ہوں۔ کسی سے کہیے گا نہیں۔ میری لڑکی سے اس کی نسبت کی بات چیت ہو رہی تھی اور میں نے اس کے واسطے

ایک بہت اچھی ملازمت بھی تلاش کر لی تھی، مگر اسے یہ اندیشہ تھا اور بالکل بجا کہ رئیس گھرانے میں شادی کرنے سے اس کا کام بگڑ جائے گا اور اس نے انکار کر دیا۔ مجھے بہت صدمہ ہوا، لیکن حسام الدین سے کوئی شکایت میرے دل میں نہیں اور اب بھی جب اس کا ذکر کرتا ہوں تو تعریف کی غرض سے۔

کرم علی: میں نے تو سنا تھا کہ اس کی نسبت عبدالغفور صاحب کی ایک لڑکی کے ساتھ ٹھہری ہے۔

مولوی عبدالرحمان: (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد) خیر صاحب ایسی باتوں کو کسی اور موقع کے لیے رکھیے۔ ہم دونوں آپ سے یہ گزارش کرنے کے لیے آئے ہیں کہ کل بڑا جلسہ ہونے والا ہے۔ اس کی آپ صدارت قبول فرمائیں۔ ہم کو یہ غلط فہمی ہرگز نہیں کہ آپ اس تحریک سے ذرا بھی ہمدردی رکھتے ہیں، ہم صرف اس خیال سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ شاید آپ کی موجودگی سے عبدالغفور صاحب اور اہل جلسہ کے جوش کے بھڑک اٹھنے کی نوبت نہ آئے۔ ہماری بات تو کوئی نہ سنتا ہے اور نہ سنے گا۔

دلدار حسین: میں اس معاملے میں آپ سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہوں۔ میرے تعلقات کچھ ایسے ہیں کہ میں جلسے میں آ بھی نہیں سکتا۔ عبدالغفور صاحب میری شرکت کا اعلان کر دیں، لیکن میری صحت اچھی نہیں ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں، اگر جلسے کے وقت میں پلنگ پر پڑا رہوں اور میرے کمرے میں ایک ڈاکٹر بیٹھا ہو جو میرے لیے منہ سے بات کرنا بھی نہایت خطرناک قرار دے۔

کرم علی: جناب بہت خوش قسمت ہیں جو ایک اصلی مصیبت سے بچنے کے لیے ایک نقلی مصیبت میں پناہ لے سکتے ہیں، مگر بتائیے ہم کیا کریں؟

دلدار حسین: آپ اطمینان سے جلسے میں شریک ہوں، عبدالغفور صاحب آپ کی طرف سے جو وعدے کریں اور جو دھمکیاں دیں انھیں خاموشی سے سن لیجیے اور انھیں پورا کرنے کا حق محفوظ رکھیے۔

کرم علی: مگر اس سے ہم خواہ مخواہ جھوٹے بنتے ہیں اور لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے سوا کسی کی فکر نہیں، ہم کسی کو کچھ دینا نہیں چاہتے۔ وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ بے مروت ہیں۔

دلدار حسین: خیر اگر اتنا ہی ہوتا تب بھی غنیمت تھا مگر غضب تو یہ ہے ہندوؤں میں بھی عبدالغفور

صاحب جیسے بہت سے قوم کے خیر خواہ پیدا ہو گئے ہیں جو عبدالغفور صاحب کی حرکتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور عبدالغفور صاحب کی بدولت ان بچارے ہندوؤں کے منہ بند ہو جاتے ہیں جو کسی طرح کا فساد نہیں چاہتے اور ہم سے بھائی چارہ کرنے پر تیار ہیں...... جو شکایت آپ کر رہے ہیں وہ میں نے بہت سے ہندوؤں سے بھی سنی ہے ہندو انھیں غدار سمجھتے ہیں...... مسلمان انھیں دشمن۔ حالاں کہ وہ بیچارے دل سے دونوں کے خیر خواہ ہیں۔ میں خود تیس سال سے اپنی نسبت یہی رائے سن رہا ہوں۔ پہلے لوگوں کو سمجھانا چاہا کہ وہ غلطی کر رہے ہیں۔ اب بالکل بے حس ہو گیا ہوں۔

مولوی عبدالرحمان: معاذ اللہ ہمارے دلوں کو بھی کیسا روگ لگ گیا ہے۔ ذہن میں زہر سرایت کر گیا ہے۔

دلدار حسین: (مسکرا کر) جی ہاں مولانا! یہ سب قومی درد سے نا آشنائی کا نتیجہ ہے۔

(خاموشی)

کرم علی: تو پھر آپ جلسے کی صدارت پر راضی نہیں۔

دلدار حسین: بالکل مجبور ہوں۔ میں ویسے بھی اپنی مرضی کے بغیر تحریک میں پھنسا دیا گیا ہوں۔ اگر جلسے میں گیا تو اپنے دوست احباب کو منہ دکھانا دشوار ہو جائے گا۔

کرم علی: خیر مولوی صاحب، تو پھر چلیے، کسی اور سے گزارش کریں۔

مولوی عبدالرحمان: چلیے۔

(مصافحہ کر کے سلام علیکم، وعلیکم السلام کہتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔
دلدار حسین چھت کی طرف دیکھ کر لمبی سانس لیتا ہے)

(پردہ)

دوسرا اسین

(بازار میں کرم علی کی دکان۔ ''کرم علی جنرل مرچنٹ'' ایک لمبے سرخ تختے پر سفید رنگ سے لکھا ہوا ہے، دکان میں بیوپار کا سامان کچھ کھلا، کچھ بادامی کاغذ میں لپٹا ہوا رکھا ہے۔ دکان میں بائیں طرف سامنے کرم علی بیٹھا ہے۔ اس کے پیچھے ایک منشی، جس کے آگے نیچی میز پر حساب کی کتابیں رکھی ہیں۔ راہ رو سامنے سے گزرتے ہیں ۔مولا بخش دائیں طرف سے آتا ہے۔ اور السلام علیکم کہہ کر کرم علی کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے)

کرم علی: ہاں بھائی تو کیا کیا بنا کر لائے تھے؟

مولا بخش: جناب ایک تو وہ بکس جو پچک گیا تھا ٹھیک کیا ہے، چھے چھریاں تیز کی ہیں۔ دو قینچیوں پر دھار لگائی ہے، اور ایک وہ موٹی سلاخ سیدھی کی ہے۔ اس کام کی اجرت اور چیزیں لے جانے کی مزدوری سب پانچ روپے ہوتی ہے۔ میں چیزیں سب کل شام کو دے گیا تھا، اور مجھ سے کہا گیا تھا دس بجے سویرے آنا تو دام مل جائیں گے۔ اگر آپ جلدی سے دے دیں تو بڑی عنایت ہوگی، مجھے بہت سخت ضرورت ہے۔

کرم علی: یہ میں کب کہتا ہوں کہ تمھیں روپے کی ضرورت نہیں مگر تمھیں جو کچھ بنانے کو دیا گیا تھا وہ تم

اورخراب کرلائے ہو۔ منشی جی ذراوہ بکس اور چھریاں اور قینچی جو یہ کل دے گئے تھے اٹھا تو لاؤ، (منشی اٹھ کر اندر سے بکس لے آتا ہے جس میں اور چیزیں رکھی ہیں۔ کرم علی بکس کھول کر سب چیزیں مولا بخش کے سامنے رکھ دیتا ہے) یہ چھریاں تیز کرنے کو دی گئی تھیں۔ تم نے سان پر دھر کر ایسا رگڑا ہے کہ سب کا پھل آدھے سے زیادہ گھس گیا ہے اور اس پر دھار کا حال یہ ہے کہ برسوں رگڑو تب بھی کچھ کاٹے نہ کٹے۔ پھر قینچی کو ذرا دیکھو، یہ بھلا کپڑا کاٹنے کے کام کی رہ گئی ہے؟ اور بکس تو ماشاء اللہ، ہتھوڑے کا نشان دور سے معلوم ہوتا ہے، اور لطف پر لطف یہ کہ جوں کا توں پچکا رہا۔ سلاخ اندر رکھی ہے، پہلے ایک طرف کو مڑی تھی، اب دوسری طرف جھک گئی ہے سارا سامان اکارت گیا۔ اوپر سے پانچ روپے ڈنڈ دیجیے۔

مولا بخش: اچھا صاحب کچھ نہ دیجیے۔ معلوم ہوتا کہ آپ ایسے معاملے کے خراب ہیں تو بے کار کی محنت بچتی۔

کرم علی: ایسی محنت کی جس سے چیز اور خراب ہو جائے، جو اجرت ہے وہ لے لو۔

مولا بخش: تو آخر آپ کیا دینا چاہتے ہیں؟

کرم علی: میں تو ایک کوڑی بھی نہیں دینا چاہتا۔ تم سے چیزوں کی قیمت نہیں مانگتا۔ یہی تم پر احسان ہے۔

(مولا بخش غصے میں دکان کی طرف پیٹھ پھیر کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کچھ عرصے تک داڑھی کھجاتا اور سوچتا رہتا ہے۔ حسام الدین سڑک پر سے گزرتا ہے۔ کرم علی سے صاحب سلامت ہوتی ہے اور وہ ادھر ادھر دیکھ کر دکان پر آجاتا ہے)

کرم علی: کہیے مولانا، کیسے تشریف لائے، آپ تو ایسے گاؤں میں منہ چھپا کر بیٹھے ہیں کہ کبھی نیاز حاصل ہی نہیں ہوتا۔

حسام الدین: ارے صاحب جا کے کیا بیٹھا ہوں، بس اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دے رہا ہوں۔ نام ہے کہ بن باس لیا ہے اور جب دیکھیے شہر میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہوں۔ یہاں سب کہتے ہیں کہ ہمیں کبھی نظر نہیں آتے، گاؤں میں الزام لگایا جاتا ہے کہ شہر کا ایسا

چسکا لگا ہے کہ گاؤں میں قدم جمنے نہیں پاتے۔ اب کس کس کو سمجھاؤں، بدنامی تو ہر صورت سے ہے۔

کرم علی: معاف فرمایئے گا۔ میں نے شکایت تو نہیں کی تھی، نہ آپ کا دل دکھانا چاہتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی اس لیے عرض کیا تھا اور اس میں بدنامی کی کیا بات ہے۔ جہاں جی لگے رہیں خوش رہیے۔

حسام الدین: نہیں صاحب بدنامی ہے، اور اگر آپ یقین نہ کریں تو میرے ساتھ چلیے عبدالغفور صاحب کو تقریر کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتا۔ مجھے جو کچھ ابھی ابھی سنایا ہے وہ خوشی سے دہرا دیں گے، اور اس کے بعد پھر آپ کو دلدار حسین صاحب کی خدمت میں پہنچا دوں گا۔ انھیں کبھی مشورہ دینے میں تامل نہیں ہوتا اور انھوں نے مجھے جو بزرگانہ تنبیہ کی ہے وہ بھی سن لیجیے گا اور فساد کی جڑ یہ ہے کہ میرا لوٹا چوری ہو گیا اور نیا خریدنے آیا ہوں جس کی وجہ سے ناحق ان بکھیڑوں میں پڑا۔

کرم علی: جی ہاں، عبدالغفور صاحب نے تو کچھ ایسی تحریک شروع کی ہے......

مولا بخش: ہاں صاحب تو پھر ایسے ہی کھڑا رہوں؟

کرم علی: جیسا جی چاہے۔ میں نے تمھیں روکا نہیں۔

مولا بخش: (غصے سے کانپتے ہوئے) اچھے آئے، روکا نہیں، روکا نہیں، خواہ مخواہ غریب آدمی کو حیران کرتے ہیں اور اوپر سے باتیں بنانے پر تیار ہیں۔

کرم علی: سنو میاں، بدزبانی سے بگڑا کام تو بنتا نہیں، اور زیادہ کچھ کہو گے تو تھانہ قریب ہے دونوں چلے جائیں گے۔

مولا بخش: اجی دھمکی کیا دیتے ہو، تھانے میں جا کر میرا کیا بنا لو گے؟ خدا کی قسم بازار بھر میں بدنام نہ کیا تو میرا نام مولا بخش نہیں، اور پھر دیکھیے گا جو کوئی بھولے سے بھی آپ کا کام کرنے پر راضی ہو جائے۔

کرم علی: (حسام الدین سے) دیکھیے جناب مسلمان بھائی سمجھ کر ذرا سا کام دیا تھا، سو وہ سارا چوپٹ

کیا۔ اب الٹے دھمکی دیتے ہیں کہ بازار بھر میں بدنام کروں گا (مولا بخش سے) خیر بھائی بدنام ہی کرلو۔

مولا بخش: مگر آپ دام نہ دیں گے۔

حسام الدین: ارے میاں دام مانگ رہے ہو یا ڈاکہ ڈالنے آئے ہو۔ یہ آخر طریقہ کیا ہے؟

مولا بخش: جناب طریقہ وریقہ تو میں جانتا نہیں، میں نے کام کیا ہے اور اس کے دام چاہتا ہوں۔

حسام الدین: اور ظاہر ہے جب اس طرح ڈانٹ ڈپٹ کر دام مانگنا پڑ رہا ہے تو تم نے کیسا کام کیا ہوگا۔ کام اچھی طرح کیا ہوتا تو کرم علی صاحب خود تمھارے گھر دام دینے کو پہنچتے اور شوق سے ایک کے دو دیتے۔

مولا بخش: اجی یہ، انھیں موقع ملے تو آدمی کا خون تک پی جائیں۔ ان کے لیے اچھا کام کرنے میں خوشی کیا۔ اچھا کرو یا برا، یہ حجت کیے بغیر تو کبھی کچھ دیتے نہیں، انھیں اپنا پیسہ بچانے سے مطلب ہے۔ ہماری آبرو رہے یا نہ رہے۔

حسام الدین: جانے دو میاں، آبرو آدمی خود کھوتا ہے۔ کوئی اس سے چھین نہیں سکتا۔

مولا بخش: اچھا صاحب ہم بے آبرو سہی، مگر ہمارے دام تو دلوا دیجیے۔

حسام الدین: میں کیوں دلوا دوں؟

مولا بخش: اس لیے کہ آپ نے ہمیں غریب سمجھ کے ڈانٹ دیا تو ادھر بھی تو کچھ کہیے۔ ہم داموں کے لیے تقاضا کریں تو ہمارا قصور، کام میں ذرا بھی نقص رہ جائے تو ہم ذمہ دار، بیوی بچوں کو کھانے کو نہ ملے تو ہمارے سر مصیبت، آخر ہم اپنا پیٹ کیسے پالیں؟ ہمارے لیے بھی تو کوئی سہارا ہونا چاہیے۔

کرم علی: ارے بھائی ان بیچارے سے کیوں حجت کر رہے ہو، کام میں نے کرایا ہے، جو کچھ دوں گا میں دوں گا۔

مولا بخش: آپ سے ملنے کی امید ہوتی تو میں کیوں کسی کی خوشامد کرتا۔

کرم علی: اچھا دیکھو، تم نے جن چیزوں کی مرمت کی ہے وہ میں سب ان صاحب کے سامنے رکھے

دیتا ہوں، پھر جو کچھ یہ کہیں دے دوں گا۔

حسام الدین: نہیں صاحب، اس سے فائدہ کیا، اس کو تو دے ہی دیجیے۔

کرم علی: کیا؟

حسام الدین: جو کچھ مانگے۔

کرم علی: (کچھ بے مروتی سے مسکرا کر) اگر منہ مانگے دام ملنے کی امید ہوئی تو یہ تو میری دکان ہی بکوالے گا۔

حسام الدین: مگر اس چکر سے تو کسی طرح نکلنا ہی چاہیے۔ آپ کو اندیشہ ہے کہ یہ آپ کی دکان بکوالے گا، اسے خوف ہے کہ آپ اس کا خون چوس لیں گے اور دونوں کی بدظنی میں کام چوپٹ ہوتا ہے، ہنر سارے بے قدری کی وجہ سے مٹے جا رہے ہیں میں تجارت سے واقف نہیں۔ لیکن اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ ہنر کی قدر نہ کیجیے تو استاد بھی اناڑی سے بدتر کام کرتا ہے۔

مولا بخش: ہاں صاحب یہ بات آپ نے ہمارے دل کی کہی۔ ہم کو یقین ہو کہ ہمارے کام کی قدر ہوگی تو ہم محنت کرنے پر تیار ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اپنے ہنر کی لاج رکھنے کے لیے جان کھپا دیں گے، لیکن صاحب ہم محنت سے، شوق سے کام کر کے لائے اور یہاں ہوا مول تول تو ہم میں تو پھر ہمت رہتی نہیں۔

کرم علی: اجی باتیں کیوں بناتے ہو۔ کبھی کچھ سلیقے سے کیا بھی ہے کہ یوں ہی خواہ مخواہ تمھاری پیٹھ ٹھوکا کریں۔

مولا بخش: (کرم علی کو گھور کر) جناب آپ کو دام نہیں دینا ہیں تو نہ دیجیے۔ میرا منہ بند کرنے کی فکر کیوں کر رہے ہیں...... لاحول ولا قوۃ لعنت ہے اس پیشے پر، اور ان کمینوں پر، جن سے سابقہ پڑتا ہے۔ آخ تھو......

(مولا بخش تھوک کر چلا جاتا ہے۔ حسام الدین لمبی سانس بھر کر اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

پہلا سین

(عبدالغفور کا کمرہ۔ آرائش جیسے پہلے ایکٹ، دوسرے سین میں۔ پردہ اٹھنے پر حسام الدین فرش کے ایک کونے پر بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد عبدالغفور داخل ہوتا ہے۔ حسام الدین اسے اٹھ کر نہایت خوف زدہ لہجے میں سلام کرتا ہے۔)

عبدالغفور: (حسام الدین کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر) وعلیکم السلام، وعلیکم السلام۔ خیر بھائی آ گئے، اتنا تو احسان کیا۔ مجھے لوگوں نے ایسا ڈرایا تھا، میں سمجھا تم آنے ہی سے انکار کر دو گے۔ خیر آ گئے ہو تو تم سے مشورہ لینے کا موقع تو مل گیا۔

حسام الدین: (مسکرا کر) بھلا میری ہستی کیا ہے جو آپ کی اطاعت سے کبھی انکار کروں مگر یہ مشورہ لینے کی تدبیر آپ نے خوب سوچی، اور مشیر بھی ماشاءاللہ، بہت اچھا منتخب کیا۔

عبدالغفور: کیوں بھائی۔ میں کوئی نئی بات تھوڑا ہی کر رہا ہوں۔ میرا تو ہمیشہ یہی اصول رہا ہے کہ جو کچھ کرتا ہوں لوگوں سے مشورہ لے کر کرتا ہوں۔ خاص طور پر ان نوجوانوں سے

جن کی کوششوں کے بغیر میرا کچھ بس نہیں چل سکتا۔ اب اس کے لیے میں کیا کروں کہ تم دنیا کو چھوڑ کر جانوروں کی طرح بل میں گھس کر بیٹھ رہے اور کسی کو منہ تک نہیں دکھاتے، خیر بھائی سنو، مسجد پر ہندوؤں کے قبضہ کرنے کا شرمناک واقعہ تو اتنا مشہور ہوگیا ہے کہ تم نے اپنے گاؤں میں بھی اس کی خبر سن لی ہوگی۔ میں نے پہلے ہی سے اس قدر شور مچایا کہ دوست دشمن سب کے کان کھڑے ہو گئے اور میرا خیال تھا کہ ہمارے جوش کو دیکھ کر ہمارے ہندو بھائی ہمارے احساسات کا پاس لحاظ کریں گے اور اس مسئلہ کا کوئی ایسا فیصلہ ہو جائے گا جس سے کسی کا نقصان نہ ہو، اور ہماری آبرو میں بٹا نہ لگے۔ لیکن کیا کروں، ہمارے کچھ مسلمان بھائی ایسے بھی ہیں جنھیں ملت کی آبرو سے زیادہ اپنے دوست احباب کی خوشنودی کی فکر ہے اور ان کی وجہ سے میرا کیا کرایا کام چوپٹ ہوا۔ میونسپلٹی والے اس پر آمادہ ہوگئے تھے کہ جس میدان کو ہزاروں مسلمانوں نے اپنی سجدہ گاہ بنایا تھا وہاں پر مسلمانوں سے جس قدر چندہ وصول ہو، اسی سے ایک مسجد بنوا دیں۔ مگر ان ہی مسلمان بھائیوں کے اکسانے سے وہ پھر اکڑ گئے۔ اور اب ان کے وہی تیور ہیں جن سے پہلے ہمیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تھی۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں کو ان کی زیادتیوں کے باوجود دنیا بھر میں ذلیل کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ ان بنیوں کو ان کی بدتمیزی کا مزہ چکھا دوں گا۔ اس لیے میں نے تم کو بلایا تھا۔ تم کو شکایت تھی کہ کچھ کام کرنے کو نہیں ملتا۔ اب لو، اتنا کام ہے کہ کیے نہ بنے۔ ملت کو آگاہ کرو، خبردار کرو۔ آبرو بچانے کے لیے تیار کرو، مسلح کرو، جوش اور ایثار کے کرشمے دکھانے، شہادت کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔

حسام الدین: (کاہلوں کے سے لہجے میں) جی، مجھے تو معاف رکھیے۔ مجھے تو گاؤں میں رہتے رہتے پھپھوندی لگ گئی ہے۔ دوڑ دھوپ کی ہمت نہیں رہی۔ خون ٹھنڈا پڑ گیا۔ سوا دن بھر لیٹے رہنے کے اب کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔

عبدالغفور: لو، بس ہمیشہ کی سی کاہلی......اور سہل انکاری۔ ارے میاں اب وہ وقت نہیں ہے کہ پڑے پڑے کھایا کرو، اور گپ بازی کیا کرو، اب ہے وقت میدان میں قدم رکھنے کا، لڑنے مرنے کا۔ اشوملت کے دامن پر داغ لگے ہیں، انھیں اپنے خون سے صاف کرو۔ خون کے سوا اور کسی چیز سے وہ دھلنے کے نہیں۔

حسام الدین: میں نے خون کی نسبت تو پہلے ہی عرض کر دیا کہ ٹھنڈا ہو گیا ہے اور اب بہائے نہ بہے گا اور اگر آپ جرح کریں تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ابھی تک پوری بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور میں یہی سوچ رہا ہوں کہ خون بہانے کی کوشش کیوں کروں۔ میرے علم میں تو کوئی ایسی مسجد ہے نہیں جسے میونسپلٹی نے مسمار کر دیا ہے اور دریافت کرنے سے بھی کسی ایسی مسجد کا پتا نہیں چلا۔

عبدالغفور: میاں اسی وجہ سے تو میں کہتا تھا کہ گاؤں میں پڑے رہنے سے کام نہیں چلتا۔ ہر اخبار میں مسجد کی نسبت لمبے لمبے مضمون نکل چکے ہیں۔ مولویوں کے اس کی نسبت فتوے جاری ہوئے ہیں، شہر بھر میں عرصے تک اسی کے لیے شور مچا رہا ہے اور تم کہتے ہو کہ تم کو دریافت کرنے سے بھی نہیں ملی۔

حسام الدین: ملتی کیسے، تھی ہی نہیں۔ بھگوان ملز کے سامنے لوگ کسی کی زمین پر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ اب وہ وہاں مکانات بنوانا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے لوگوں کو وہاں جمع ہونے کی ممانعت کر دی۔ زمین اس کی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اسے لوگوں کو وہاں جمع ہونے سے روکنے کا حق ہے، چاہے وہ نماز پڑھنے کے لیے ہی کیوں نہ جمع ہوں۔

عبدالغفور: کون کہتا ہے کہ کسی کو اس کا حق ہے کہ مسلمانوں کو کہیں پر نماز پڑھنے کی ممانعت کر دے! ذرا ہوش میں آؤ، کیسی دنیا پرستوں کی سی باتیں کر رہے ہو؟

حسام الدین: میں نے پہلے یہ عرض کر دیا کہ خون ٹھنڈا ہو گیا ہے، اب مزاج میں گرمی نہیں رہی تو خواہ مخواہ عقل کو اپنے معاملوں میں زیادہ دخل دینے پر مجبور ہوں۔ میرے خیال میں اگر لوگ بھگوان ملز کے مالک کی تجویز منظور کر لیتے اور مل کے پچھواڑے جو زمین انھیں مفت

اور ہمیشہ کے لیے مل رہی تھی اسے حاصل کر لیتے تو فساد بھی نہ ہوتا اور اچھی خاصی زمین مل جاتی، جس پر بعد کو چاہتے تو مسجد بھی بنوا سکتے تھے۔

عبدالغفور : بھائی بس چھوڑو، چھوڑو۔ایک بات ہوتو کوئی سمجھائے بھی۔ یہاں تو سرے سے مقدمہ پیش کرنا ہے اور پھر جج صاحب بھی کچھ مخالف۔ میں تو اس امید میں تھا کہ تم سے کچھ تقویت حاصل کروں گا۔تم الٹے میری کمر توڑنے کی فکر میں ہو۔بس جاؤ اپنے گاؤں میں چین سے رہو۔مگر خبردار، میرے سامنے کبھی اپنے آپ کو مسلمان مت کہنا یا اگر یہ منظور نہیں تو پھر ذرا دل میں گرمی پیدا کرو، حیادار بنو، آبرو سے رہنے کا ڈھنگ سیکھو، اس طرح ادھر سے اُدھر ہنکادیا جانا مسلمانوں کی شان کے خلاف ہے۔کسی غیر مذہب والے کے حکم سے مسجد کا مقام بدل دینے سے اسلام کی صریحی توہین ہوتی ہے۔اور ہمارے حق میں بہر صورت یہی بہتر ہے کہ ہمارے دشمن ہم سے خائف رہیں نہ یہ کہ ہمارے عجز وانکسار سے ڈھیٹ ہو جائیں۔(خادم دروازے پر دکھائی دیتا ہے) کیوں کیا ہے؟

خادم:حضور! ایک صاحب آپ سے ملنے کو آئے ہیں۔

عبدالغفور: بلالاؤ بھائی، بلالاؤ۔(خادم چلا جاتا ہے، اور چند لمحوں کے بعد حشمت داخل ہوتا ہے) ارے بھائی حشمت، یہ تم کھڑے تھے باہر۔ اتنی گہری دوستی ہونے پر ایسا تکلف! مگر میری قسمت اچھی ہے تم بہت وقت سے آگئے۔ یہ دیکھو تمھارے پرانے یار حسام الدین داڑھی کھجا کھجا کر کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ذرا ان کو سمجھاؤ۔راہ راست پر لاؤ۔یہ تو گاؤں میں رہ کر سب کچھ بھول گئے، خیر ہم لوگوں کو بھول جاتے تو کوئی بات نہ تھی۔یہ اسلام سے بالکل بے گانگی برتنے پر آمادہ ہو گئے۔کیا گاؤں کی فضا میں کفر کی تاثیر ہوتی ہے۔

حشمت اللہ: (پہلے مسکراتا ہے پھر سنجیدہ چہرہ بنا کر) خیر! مگر میں تو آپ سے یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ اب بحث کا موقع نہیں رہا اور اب لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرنے کے بجائے کچھ عملی کاروائی شروع کرنا چاہیے۔میونسپلٹی نے اس زمین کے چاروں طرف مسلح

سپاہی کھڑے کرانے کا حکم جاری کردیا ہے اوراب جوکوئی وہاں جائے گا چاہے نماز ہی پڑھنے کیوں نہ جائے اس کی وہ خوب خبرلیں گے۔ مسلمانوں کا حال تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اگر آپ نے اس معاملہ کی طرف فوراً توجہ نہ کی تو ممکن ہے وہاں خون خرابہ ہوجائے۔

عبدالغفور: کیوں میاں حسام الدین سن لیا، یا اب بھی تمھارا خون ویسا ہی سرد ہے؟

حسام الدین: میں کل بھگوان ملز کی طرف شام کو ٹہلتا ہوا گیا تھا۔ وہاں ایک بوڑھا چپراسی بیٹھا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اب کئی ہفتوں سے اس زمین پر نہ کوئی خوانچے والا آتا ہے نہ کوئی نمازی۔

عبدالغفور: بھئی الٹی سیدھی باتیں کرنے کی کوئی انتہا بھی ہوتی ہے۔ میں کل حالات سے واقف ہوں۔ بھائی حشمت اللہ میونسپلٹی میں ایک اعلیٰ عہدے پر ہیں۔ میونسپلٹی کے کل معاملات وہ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ لیکن تم ہو کہ ہم دونوں کو جھوٹا سمجھتے ہو، اور ایک چپراسی کی بات کو بغیر جانچے پرتالے مان لیتے ہو۔ یہ آخر کیا اندھیر ہے؟ ہاں بھئی حشمت تو پھر بتاؤ میں کیا کروں۔ تم تو ایسی خبر لائے ہو کہ سنتے ہی خون اُبل پڑا۔

حشمت اللہ: جناب بندے کا خون کل شام جب سے میونسپلٹی میں ریزولیوشن پاس ہوئے تب ہی سے ابل رہا ہے۔ میں تو ملازم آدمی ہوں۔ میں تو کچھ کرسکتا نہیں۔ میرا فرض آپ کو ان لوگوں کی پوشیدہ کارروائیوں سے آگاہ کرنا تھا وہ میں نے ادا کردیا۔

عبدالغفور: اچھا تو بھائی سنو۔ تم جلدی سے مولوی عبدالرحمان صاحب، کرم علی صاحب اور دو تین لوگوں کو ٹیلی فون کرکے یہاں بلاؤ۔ میں اس درمیان میں کوئی تدبیر سوچوں گا اور تم گھبراؤ نہیں، انشاء اللہ آج شام تک ایک ایسا اعلان جنگ شائع ہوجائے گا کہ اسے سن کر ہی دشمن کانپ اٹھیں گے۔

حشمت اللہ: جی ہاں، اتنا تو کم از کم ہونا چاہیے۔ (اُٹھ کر چلا جاتا ہے)

عبدالغفور: اب فرمایئے حسام الدین صاحب، کیا ارادہ ہے؟ ہمارے ساتھ ہوں گے یا ہمارے دشمنوں کے؟ اتنا تو احسان کیجیے کہ اپنے ارادے سے مطلع کردیجیے تاکہ عین وقت پر مایوسی نہ ہو۔

حسام الدین: آپ کا کوئی دشمن نظر آتا تو سوچنے کا موقع بھی تھا کہ آپ کا ساتھ دوں یا اس کا، مگر بہر حال ساتھ تو آپ ہی کا ہوگا۔ میں لڑنے کے کام کا تو رہا نہیں، آپ کی جنگ میں جو زخمی ہوں گے، ان کی تیمارداری جہاں تک ہو سکی کروں گا!

عبدالغفور: (حسام الدین کی طرف تھوڑی دیر تک گھور کر) میاں خدا جانے کیا بہکی بہکی باتیں کرتے ہو! خیر اب جاؤ، مجھے اعلان کا مضمون سوچنا ہے۔ خدا تمھیں اتنی توفیق دے کہ اپنے بھائیوں کے درد کو محسوس کرو، اور اپنے دین کا حق ادا کرو۔ خدا حافظ

حسام الدین: خدا حافظ:

(پردہ)

دوسرا سین

(سڑک اور مکانات کے درمیان خالی جگہ پر مولا بخش لوہار، ایک مستری، اور دو مزدور بیٹھے ہیں۔ سگریٹ کا دور چل رہا ہے۔ اسٹیج کی پشت پر ایک دروازہ ہے جس سے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں داخل ہوتے ہیں)

مولا بخش: (مستری سے) بھائی ہم تو پڑھے لکھے آدمی ہیں نہیں، ہمیں تو شریعت کا کچھ حال معلوم نہیں، ہم کو تو وہی ماننا چاہیے جو عالم لوگ ہم سے کہیں اور اب تم غور کرو کہ آج جو اعلان چھپا ہے اس میں بڑے بڑے مولویوں کے دستخط ہیں، اور سب کا فتویٰ ہے کہ ہر سچے مسلمان کو جان دینے پر تیار ہو جانا چاہیے۔ اس میں تو اب کچھ کہنے سننے کی گنجایش ہی نہیں، ہمارے خدا اور رسول کا حکم تو صاف ظاہر ہے۔

مستری: (ذرا ہچکچا کر) ہاں یہ تو ہے۔

مولا بخش: بس ہم نے تو یہی دل میں ٹھان لی ہے۔ آج شام کو نہا دھو کر جو اوزار ملا ہاتھ میں لیے مولانا عبدالغفور صاحب کے مکان پر پہنچ جائیں گے، رستے میں کہیں پر موقع ملا تو وہیں بھڑ جائیں گے نہیں تو جیسا عبدالغفور صاحب کا حکم ہو، ہمیں جینے میں تو کوئی لطف آتا

نہیں......زندہ رہے تو بس یہی روز کی محنت، روز کی فکر ہے۔ اب شہید ہونے کا موقع ملا ہے اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے......(کچھ دیر خاموشی کے بعد) تو پھر مستری جی کیا رائے ہے؟

مستری: ہاں بھائی ٹھیک کہتے ہو۔ اب کچھ زمانہ ہی ایسا ہے۔ ہم کو ہی دیکھو۔ کام کرتے کرتے بیس برس ہو گئے۔ مگر اللہ قسم ابھی تک ایک کام نہ جی سے کیا ہے نہ کوئی کام کبھی جی پر پڑا ہے۔

پہلا مزدور: ہاں، سچ بات تو یہی ہے۔ اب جینے میں کوئی لطف ہی نہیں۔

مستری: ہم تو کام کرنے والے ہیں۔ جب کام کی کدر (قدر) کرنے والے ہی نہیں رہے تو پھر کس کے لیے کریں؟

دوسرا مزدور: اور کمائی بھی ایسی نہیں ہوتی کہ ایک وکھت (وقت) کا کھانا پیٹ بھر کر کھا سکیں۔

مولا بخش: (انگڑائی لے کر) بس چلو کہیں کٹ مریں۔ (سب کے چہروں پر ایک غمگین مسکراہٹ آجاتی ہے) ہمارا تو سچ مچ یہی جی چاہتا ہے......اب جھگڑا بھی ہو گیا ہے۔ مولویوں نے جہاد کا فتویٰ بھی دے دیا ہے۔

پہلا مزدور: سچ استاد، تم چلو تو ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں۔ ہمارے دل میں تو یہ بات اسی وکھت (وقت) سے بیٹھ گئی جب اس حرام زادے ہندو کوتوال نے ہمارے بڑے بھائی کو جیل خانے بھجوایا۔ ہم کو ذرا بھی کوئی اشارہ کر دے تو اس پر ہاتھ صاف کر دیں۔

دوسرا مزدور: ہم نے تو کوئی ایسی اڑتی کھبر (خبر) سنی تھی کہ میونسپلٹی والے کچھ پھساد (فساد) کر رہے ہیں۔ آج مولوی پھتوا (فتویٰ) بھی دینے والے ہیں۔

مولا بخش: (زور سے ہنس کر) واہ جی واہ۔ اتنا سب کہہ گئے اور ان کو کچھ خبر ہی نہیں۔ ارے میاں عقل مند پھساد (فساد) ہو گیا۔ مولویوں نے پھتوا (فتویٰ) بھی جاری کر دیا۔ اب بات سمجھ میں آئی ہو تو ہاتھ میں ڈنڈا لو، اور چلو......(لمبی سانس لے کر) خدا ہمارے عبدالغفور صاحب کو زندہ رکھے۔ انھوں نے اتنا تو کر دیا کہ ہمیں اس دنیا سے چھٹکارا بھی ملے اور شہید بھی کہلائیں (تیسرا مزدور داخل ہوتا ہے اور مولا بخش کو دیکھ کر پوچھتا ہے)

تیسرا مزدور: کہو استاد کیا خبر آئی؟ ہمارے گھر کے پاس بہت سے محلے والے جمع ہیں۔

مستری: ارے وہ اللہ دین کہاں بیٹھ رہا۔ وہ تو خبر لانے گیا تھا کہ آج کیا ہوا ہے۔

مولا بخش: ہاں دیکھو، بس آتا ہی ہوگا۔

(خاموشی)

(اللہ دین دوڑتا ہوا آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سرخ روشنائی سے چھپا ہوا اعلان ہے)

اللہ دین: ارے چچا آج تو معلوم ہوتا ہے شہر میں بلوہ ہوگا۔

(سب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

پہلا مزدور: کہاں؟

مستری: کیسا بلوہ؟

دوسرا مزدور: تجھ سے کس نے کہا؟

مولا بخش: لا، ذرا اعلان تو ادھر دے (اللہ دین کے ہاتھ سے اعلان لے کر ہجے کر کر کے پڑھتا ہے) مسلمانوں...... اٹھ کھڑے ہو...... دکھا...... دو کہ تم اپنی جان......اپنا مال...... نثار......کر سکتے ہو......آؤ شہادت ......کا شربت چکھو......دشمن کو بھی...... اس لام کی توہین کا مزہ چکھاؤ...... (سب مولا بخش کی رائے معلوم کرنے کے لیے اس کے منہ کو تکتے رہتے ہیں) بس چلو، ہماری امیدیں پوری ہوئی ہیں۔ عبدالغفور صاحب نے جہاد کا حکم دے دیا ہے۔ مولوی لوگ بھی یہی کہتے ہیں۔ سب کی رائے یہی ہے۔

مستری: اچھا تو یہ بھی کچھ لکھا ہے کہ کیا کریں۔

مولا بخش: اجی اب کرنا دھرنا کیا؟ میں تو بس نہا دھو کر ان ہی کے یہاں پہنچتا ہوں، کل جو کھمبیں بننے کو آئی تھیں وہی ہمارا ہتھیار ہوں گے (تیسرے مزدور سے) بس جی، تم جا کر سب سے کہہ دو کہ لڑنے کو تیار ہو جائیں...... میں یہاں سے بس تھوڑی دیر میں چلتا ہوں، جسے آنا ہو میرے ساتھ ہو لے۔ (تیسرا مزدور "اچھا استاد" کہہ کر دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے)

پہلا مزدور: چلو استاد، ہم بھی تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ ہمارے ہاتھ میں بھی کچھ دے دو!

اللہ دین: اور چچا ہم بھی۔

مستری: چلو عبدالغفور صاحب کے یہاں تک تو میں بھی چلتا ہوں۔

(مولا بخش اور اللہ دین کوٹھری کے اندر چلے جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے مزدوروں وغیرہ کی ایک خاصی تعداد جمع ہو جاتی ہے۔ ڈنڈوں اور لوہے کے مختلف اوزاروں کے زمین پر پٹکے جانے کی آواز آتی ہے۔ مولا بخش صاف کپڑے پہنے نکلتا ہے۔ اس کے پیچھے اللہ دین — ہر طرف سے 'چلو' 'چل کھڑے ہو' 'اللہ مالک ہے' کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔)

(پردہ)

تیسرا سین

(عبدالغفور کے مکان کا کمرہ۔ ار وہی ہے جو تیسرے ایکٹ، پہلے سین میں۔ عبدالغفور، مولوی عبدالرحمان، کرم علی اور حشمت اللہ سب بیٹھے ہیں۔ پردہ اٹھتے ہی حسام الدین داخل ہوتا ہے اور سب کو سلام کرتا ہے۔ عبدالغفور بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے سلام کا جواب دیتا ہے۔)

حسام الدین: حضور، آپ کے پاس ایک پیغام لایا ہوں۔

عبدالغفور: فرمایئے۔

حسام الدین: مجھے ڈر ہے، پیغامبر ہونے کی وجہ سے کہیں مجھ پر بھی غصہ نہ اتارا جائے اس لیے پہلے ہی عرض کیے دیتا ہوں کہ مجھے آپ بس ایک ٹیلی فون سمجھ لیجیے، جس نے دوسرے کی بات آپ کے کانوں تک پہنچائی ہے۔ اس سے میری اپنی رائے کو کوئی واسطہ نہیں۔

عبدالغفور: جی فرمایئے۔ فرمایئے!

حسام الدین: صاحب! بات یہ ہے کہ میں دلدار حسین صاحب کے یہاں کچھ روپیہ وصول کرنے کے لیے گیا تھا۔ انھوں نے زبردستی مجھے پیغام پہنچانے پر مجبور کیا اور کہا کہ جاؤ گے نہیں تو

تمھارا روپیہ مارا جائے گا۔

عبدالغفور: خیر بھائی، پیغام تو سناؤ۔

حسام الدین: (ذرا ہچکچا کر) صاحب انھوں نے کہا ہے کہ عبدالغفور صاحب سے دست بستہ عرض کردو کہ یہ نیا اعلانِ جنگ جو شائع ہوا ہے اس میں ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا ہے اور اس کے نتیجے کے وہ ذمہ دار نہیں ہیں۔

عبدالغفور: تو کیا دلدار حسین صاحب کا خیال ہے کہ میں ان کے بھروسے پر کام کرتا ہوں اور کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان ہی کی طرح میں بھی ہندوؤں کی خوش نودی کے لیے اپنے دین وایمان کو طاق پر رکھ دوں؟

حسام الدین: میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ میں صرف پیغام پہنچانے آیا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو باقی بھی عرض کر دوں۔

عبدالغفور: جی فرمایئے، ہمارے رئیس اعظم نے اور کیا ارشاد فرمایا ہے؟

حسام الدین: ان کا خیال ہے کہ میونسپلٹی مقدمہ چلانے والی ہے اور پولیس کی طرف سے بھی آپ کے خلاف کارروائی ہونے والی ہے۔ ان دونوں باتوں پر آپ غور کر لیجیے۔ بس اور کچھ نہیں۔

عبدالغفور: دیکھیے مولوی صاحب، عبرت حاصل کرنے کا موقع ہے۔ وہی لوگ جنھیں چاہیے تھا کہ قوم کے فدائیوں کے پشت پناہ بنیں، سب سے پہلے ہمارے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں، مگر خیر میں بھی ان سب سے سمجھ لوں گا۔ حسام الدین صاحب، اگر آپ......

حسام الدین: (ہاتھ جوڑ کر) حضور مجھے بس معاف فرمایئے، میں تو اپنے روپے کی غرض سے ایک مرتبہ پیغام بر بنا تھا۔ مجھے بس اب گاؤں جانے دیجیے۔ میں اور کسی کام کے لائق نہیں۔

عبدالغفور: خیر تو میں ابھی ٹیلی فون پر دلدار حسین صاحب کو ان کی حرکتوں کے نتیجے سے آگاہ کیے دیتا ہوں۔ مجھے مقدمے کی دھمکی پہلے بھی بہت دی جا چکی ہے، اور اس کا جواب جو میں پہلے دیا کرتا تھا وہ اب بھی دینے پر تیار ہوں۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں اور ان حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں میرے جیسے ہزاروں آدمی ہیں۔

(کمرے کے باہر سے عبدالغفور کے نوکر کی آواز آتی ہے)

نوکر کی آواز: ہیں کہاں گھسے چلے جا رہے ہو؟

مولا بخش کی آواز: عبدالغفور صاحب کے پاس اور کہاں؟

(اس کے بعد مولا بخش داخل ہوتا ہے اور السلام علیکم کہہ کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے، اس کے پیچھے مستری اور دونوں مزدور ہیں۔ اللہ دین دروازے سے جھانک کر باہر ہی کھڑا رہ جاتا ہے۔ سب کے پاس لوہے کی سلاخ، ڈنڈا یا ایسی کوئی چیز ہے۔ عبدالغفور انھیں دیکھ کر بہت پریشان ہو جاتا ہے)

عبدالغفور: وعلیکم السلام۔ کہو بھائی کیسے آئے؟

مولا بخش: ہم نے سنا تھا کہ آپ کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو اسلام کے لیے جان دینے پر تیار ہوں۔ اب ہم آئے ہیں چلیے۔ آپ جہاں لے جایئے وہاں ہم چلیں گے۔ جس کسی سے کہیے لڑ کر جان دینے پر تیار ہیں...... اور بہت سے آدمی بھی آپ کے دروازے پر کھڑے انتظار کر رہے ہیں۔

عبدالغفور: (مولوی عبدالرحمان سے مخاطب ہو کر) دیکھیے مولانا منہ سے بات نکلی نہیں اور یہ جاں باز آ کر کھڑے ہو گئے۔ اب بھی اس میں کوئی شک کر سکتا ہے کہ مسلمان ہمیشہ ہتھیلی پر جان لیے رہتا ہے، اور تم بھی ذرا اس پر غور کرو۔ میاں حسام الدین دیکھو مسلمان ایسے ہوتے ہیں (مولا بخش سے مخاطب ہو کر) ہاں بھائی اس وقت ہماری آبرو تمھارے ہی ہاتھ میں ہے۔ تم ہی سردار ہو مجھے جو حکم ہو، وہ میں کرنے پر راضی ہوں۔

مولا بخش: (اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر) صاحب ہم جاہل آدمی کیا جانیں، آپ ہی حکم دیجیے۔ ہم تو اسی امید میں آئے تھے کہ آپ ہمارے سردار بن کر......

عبدالغفور: ہاں بھائی، تمھاری ہمت اور تمھارے خلوص کو میں کبھی نہ بھولوں گا۔ سچ مانو، اس وقت تم نے ملت کی اور میری آبرو رکھ لی۔ اس میں تمھارا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تمھارا یوں آنا اور جاں نثاری پر اس سادگی سے آمادہ ہو جانا مجھے ہمیشہ ہمیشہ یاد رہے گا، اور تم یہ بھی نہ سمجھو کہ تمھارا یہ مبارک تحفہ مجھے منظور نہیں۔ میں ہمیشہ تم ہی لوگوں پر بھروسا کروں گا۔ جب ضرورت ہوگی تو تم ہی سے مدد مانگوں گا۔ اچھا اب اپنے اپنے گھر جاؤ، مگر سمجھ لو

کہ جان دینے کے لیے ہر سچے مسلمان کو ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ جس وقت ضرورت ہوگی تم کو فوراً معلوم ہو جائے گا۔

مولا بخش: صاحب میں تو اپنے گھر سے رخصت ہو کر آیا ہوں اور میرے پیچھے اور بہت سے لوگ آئے ہیں، اب میں جاؤں کہاں؟ آپ نے تو جہاد کا اعلان کیا تھا، ہم شہید ہونے آئے ہیں۔

(عبدالغفور ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ باقی سب اپنا سر جھکا لیتے ہیں۔)

(خاموشی)

تو صاحب، پھر کچھ حکم دیجیے کیا کریں؟

عبدالغفور: بھائی میں کیا بتاؤں، مجھے یہ تو نہیں معلوم تھا کہ تم اس طرح جان دینے پر آمادہ ہو کر آئے ہو۔ ابھی لڑائی کا موقع آیا نہیں۔

مولا بخش: واہ صاحب، ہم تو یہی سمجھ کر آئے تھے۔ نہیں تو ہمیں کیا پڑی تھی کہ اپنی جگ ہنسائی کرائیں۔ (خاموشی)

عبدالغفور: نہیں بھائی تم میرا مطلب غلط سمجھے۔ میں نے میونسپلٹی والوں کو دھمکی دی تھی کہ انھوں نے مسجد توڑ ڈالی تو یہاں کے مسلمان جہاد کر ڈالیں گے۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم لوگ گھربار بیچ کر یہاں آن کھڑے ہو اور ابھی جہاد کر ڈالو۔ اگر ضرورت ہوئی تو انشاء اللہ ایسا بھی کریں گے۔ اس کا میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، لیکن ابھی تو اس کا موقع نہیں ہے۔

مولا بخش: (ذرا گرم ہو کر) تو صاحب اگر آپ کو معلوم نہیں تھا کہ ہمارے جیسے جاہل اور بے وقوف جہاد کا نام سن کر جان دینے کو کھڑے ہو جاتے ہیں تو آپ نے جہاد کی دھوم کاہے کو مچائی، آپ کا تو کچھ جاتا نہیں، ہم آپ ہی آپ الو بنتے ہیں۔ بھلا یہ کون سی شرافت کی بات ہے؟

عبدالغفور: ہاں بھئی مجھ سے یہ قصور ضرور ہوا۔ میں سمجھتا تو تھا کہ مسلمان جہاد کا نام سن کر اٹھ کھڑے ہوں گے مگر ایسی مستعدی کا تو مجھے بھی گمان نہیں تھا۔ خیر ابھی تو ذرا صبر کرو، انشاء اللہ ایسا موقع بھی آئے گا کہ تم اپنے دین کے لیے جان دینے کی عزت حاصل کر سکو گے۔

مولا بخش: تو وہ وقت آخر کب آئے گا؟

عبدالغفور: یہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمھیں تیار رہنا چاہیے۔

مولا بخش: (داڑھی کھجا کر ذرا غصے سے) واہ صاحب، ہم کو تو آپ نے خوب ہی الو بنایا۔ ہم سمجھتے کہ آپ اسی طرح دھوکا دیں گے تو ہم کبھی نہ آتے (سر اٹھا کر) خیر صاحب ہم پر جو گزری سو گزری مگر یہ آپ نے جو ہمارے ایمان کا منہ چڑایا اس کا بدلہ خدا آپ سے لے گا۔ چلو بھائی مستری جی اب سے معلوم ہو گیا کہ یہ سب کے سب دھوکے باز ہیں، (کرم علی کی طرف دیکھ کر) کوئی مفت کام کرانا چاہتا ہے، کوئی مفت جان لینا۔

(سب کو آگے ڈھکیلتا ہوا چلا جاتا ہے)۔

حسام الدین: (مولوی عبدالرحمان کی بانہہ پکڑ کر) چلیے مولوی صاحب ورنہ غضب ہو جائے گا۔

مولوی عبدالرحمان: ارے بھائی میں کیا بنالوں گا؟

حسام الدین: آپ چلیے تو۔

(مولوی عبدالرحمان کو گھسیٹتا ہوا جلدی سے باہر چلا جاتا ہے۔ عبدالغفور اور حشمت اللہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔)

(پردہ)

چوتھا سین

(عبدالغفور کے مکان کا پھاٹک۔ مولا بخش اور اس کے ساتھی اندر کی طرف سے آتے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی پہلے تو مجمع سے ''کہو بھائی کیا ہوا؟ عبدالغفور صاحب نے کیا کہا؟ جلدی آؤ جی'' کی آوازیں آتی ہیں جنھیں سن کر مولا بخش سٹ پٹا جاتا ہے۔ وہ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہے کہ حسام الدین اور مولوی عبدالرحمان بھی اندر کی طرف آتے ہیں۔)

حسام الدین: او میاں خدائی فوج دار، ذرا بات تو سنو!

مولا بخش: (پہلے حسام الدین کی طرف گھور کر دیکھتا ہے، اس کے بعد منہ بنا کر) لو بھائی وہ تو کچھ نہیں تھا، مگر اب ایک صاحب واقعی جہاد کرانے آئے ہیں۔

حسام الدین: ارے میاں مجھ سے ایسی الٹی سیدھی باتیں کرو نہیں۔ میں تمھارا سب کچا چٹھا جانتا ہوں اور کہو تو اس وقت کھڑے کھڑے کچھ سنا بھی دوں۔

مولا بخش: (زمین پر لوہے کی سلاخ جو اس کے ہاتھ میں ہے مار کر) اچھا صاحب، سنائیے!

حسام الدین: سناؤں...... تم کاہل ہو، اور چاہتے ہو سب تمھاری عزت کریں۔ تم سے کام وام کچھ ہوتا نہیں۔ اِتنی محنت کرنا نہیں چاہتے کہ روٹی کما سکو، اور اب موقع ملا تو کھڑے ہو گئے جہاد

کرنے۔ بھلا تم جیسوں کی قسمت میں جہاد ہو سکتا ہے؟ تم نے دنیا میں چھوڑا کیا ہے کہ عاقبت میں اس کا بدلہ ملے؟

مولا بخش: (کچھ حیران ہو کر) صاحب ہم کیسے بھی ہوں، آپ ہم کو برا بھلا کہنے والے کون ہوتے ہیں؟

حسام الدین: ہوتے کیوں نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے اتنے آدمیوں کو لا کر کھڑے ہوتے ہو اور کہتے ہو، اسلام کے لیے جان دینے آئے ہیں۔ ہم کو دھوکے باز اور جھوٹا بناتے ہو، اور چاہتے ہو، ہم منہ سے کچھ کہیں بھی نہیں تم سے۔ آخر کس نے جہاد کرنے کو کہا تھا؟

مستری: ہم کیا جانیں صاحب، ہم نے تو بس اعلان پڑھا تھا۔

حسام الدین: اور ایک اعلان پڑھ کر تم نے طے کر لیا کہ بس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ بھائی ہم اتنے بھی بے وقوف نہیں ہیں کہ ایسے چکموں میں آجائیں۔ تم اگر کسی کام میں مصروف ہوتے، گھر بار کا ذمہ ہوتا، بیوی بچوں کی پرورش کا خیال ہوتا تو ہرگز اتنی جلدی جہاد کے لیے تیار نہ ہوتے، جہاد کو بھی تم نے کوئی ہنسی ٹھٹھا سمجھ لیا ہے؟ اپنا چونّی کا کام سلیقے سے ہوتا نہیں، خدا کا کام کرنے کو جھٹ تیار ہو گئے۔ تم کو بھی تو آخر خدا نے سمجھ دی ہے، حیا دی ہے۔ دنیا میں کسی مصرف کے نہیں تو خدا کے کس کام آسکتے ہو، اور ہمارے پاس آئے ہو تو ہم تم سے کرائیں کیا۔ تم نے اب تک کیا کر دکھایا ہے جو تمھارے اوپر کوئی بھروسا کرے؟ (مولا بخش خاموشی سے زمین کی طرف تکتا رہتا ہے اور کچھ نہیں کہتا) کیوں میاں...... خدائی فوج دار، اب بولتے کیوں نہیں؟ کہو تو کرم علی صاحب کو بلاؤں اور سارا قصہ پھر سے سنوا دوں۔ تمھارے جیسے بہتروں سے نپٹ چکا ہوں۔

پہلا مزدور: صاحب، ہم تو غریب آدمی ہیں......

حسام الدین: بس رہنے دو جی، ہم بھی جانتے ہیں کیسے غریب ہو (کچھ دیر خاموشی کے بعد) بس جاؤ اپنے گھر بیٹھو۔ جب دنیا میں کچھ آبرو حاصل کر لو، تب جہاد کی فکر کرنا۔ پھر ہم بھی جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے۔ (مجمع کی طرف مخاطب ہو کر) سن لیا آپ لوگوں نے، یہ کیسے لوگ ہیں جو جہاد کرنے چلے ہیں...... واقعی بڑی شرم کی بات ہے کہ آپ میں ایک بھی

ایسا نہ نکلا جوان لوگوں کو سمجھاتا، جو انھیں یاد دلاتا کہ ہمارے رسول نے بھی جہاد کیا تھا اور ہمیں بتا گئے ہیں کہ جہاد کب کرتے ہیں اور کیسے کرتے ہیں۔ آپ یہاں پر دکھانے کے لیے آئے ہیں کہ سب مسلمان ہیں اور مذہب کے لیے لڑنے پر تیار ہیں۔ بھلا آپ میں سے کسی کو یہ بھی یاد ہے کہ جہاد کرنے سے پہلے ہمارے رسول نے اپنے جانی دشمنوں کو دوست بنانے کی کتنی کوششیں کیں۔ لڑائی سے بچنے کے لیے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں، کیا کیا قربانیاں دیں اور اس پر بھی جب لڑے تو ان کو کتنا رنج ہوا؟...... آپ لوگ بھی لڑنے کو آئے ہیں، بھلا بتایئے آپ نے ان مصیبتوں کا آدھا، چوتھائی حصہ بھی جھیلا ہے جو رسول اللہ اور ان کے ساتھیوں پر گزریں، آپ میں سے کس نے نقصان اٹھایا ہے، کس نے قربانیاں دی ہیں...... آپ سمجھتے ہیں کہ آپ غریب ہیں، آپ کو دنیا میں کچھ نہیں ملا تو عاقبت کے لیے شہادت پا کر نجات کا سامان کرلیں، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی اتنا غریب نہیں جتنے ہمارے رسول تھے۔ کسی نے اتنے فاقے نہیں کیے ہیں جتنے ہمارے رسول نے کیے، کسی نے سوکھی روٹی کے ٹکڑے کے لیے اتنی محنت نہیں کی ہے جتنی ہمارے رسول نے کی۔ دنیا کی کون سی نعمت ہے جو انھیں نہیں مل سکتی تھی، لیکن انھوں نے ہر نعمت سے اپنے آپ کو محروم رکھا، اور کیوں؟ صرف اس لیے کہ خدا کے غریب بندوں کے لیے مثال بن سکیں۔ جایئے اپنی غریبی کی شان نہ کھویئے، اپنے رسول کی لاج رکھ لیجیے!

(حسام الدین مولوی عبدالرحمان کو ساتھ لے کر چلا جاتا ہے باقی سب خاموش کھڑے رہتے ہیں)

پہلا مزدور: چلو پھر استاد، اب یہاں کھڑے کھڑے کیا کریں گے؟

(سب سر جھکائے چلے جاتے ہیں۔ مولابخش ناک صاف کرتا ہے اور آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہے)

(پردہ)

چوتھا ایکٹ

پہلا سین

(دلدار حسین کے مکان کا کمرہ، وہی جو دوسرے ایکٹ پہلے سین میں تھا۔ مولوی عبدالرحمان ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ دلدار حسین داخل ہوتا ہے۔ صاحب سلامت کے بعد دلدار حسین قریب بیٹھ جاتا ہے۔)

دلدار حسین: معاف فرمائیے گا۔ مولانا آپ کو اس قدر تکلیف دی، لیکن طوفان گزر گیا ہے۔ آپ کو بھی کچھ سکون ہوگا۔ اس لیے میں نے بھی آپ کو زحمت دینے کی جرأت کی۔ عبدالغفور صاحب کو آپ نے میرا پیغام پہنچادیا ہوگا۔

مولوی عبدالرحمان: جی ہاں، میں نے آپ کا پیغام پہنچادیا اور آپ کی وہ تجویز غالباً منظور کرلیں گے۔ اس کی مصلحت ان کی سمجھ میں ایک واقعے کی وجہ سے بھی آگئی۔ آپ نے اسے سنا نہ ہوگا۔ اس لیے عرض کرتا ہوں: جس دن ان کا وہ مشہور اعلانِ جنگ شائع ہوا تھا، ان کے پاس ایک لوہار، ایک مستری اور کچھ مزدور ہتھیار باندھ کر پہنچے اور کہنے لگے کہ صاحب

چلیے ہم جہاد کرنے آئے ہیں۔ عبدالغفور صاحب ویسے خاصے بہادر آدمی ہیں، مگر ایسے بھی نہیں کہ چند آدمیوں کی فوج لے کر لڑنے کو کھڑے ہو جائیں۔ انھوں نے سمجھا بجھا کر اور پیٹھ ٹھونک کر ان لوگوں کو واپس گھر بھیجنا چاہا، مگر وہ سب تو گھر بیچ کر آئے تھے، خوب خفا ہوئے۔ خیر وہ لوگ تو خفا ہو کر باہر چلے گئے، مگر عبدالغفور صاحب کے دل پر اس کا بہت اثر ہوا۔ ان کی بھی بالکل نہیں تو کچھ کچھ سمجھ میں آ گیا ہے کہ موقع بے موقع ملت کی آبرو داؤ پر لگا دینا اور جہاد کا ڈنکا بجا دینا خطرناک ہے اور دوسروں سے زیادہ خود مسلمانوں کو بھی اس کی وجہ سے بہت دھوکا ہوتا ہے۔ مگر صاحب، اس لوہار کو جوان مجاہدوں کا سر کردہ تھا ہمارے حسام الدین نے بھی خوب ٹھیک کیا۔ اب میں نے سنا ہے کہ وہ حسام الدین کے گاؤں پہنچ گیا ہے اور اس کے ساتھ شاید ایک دو آدمی اور ہیں۔

دلدار حسین: جی ہاں، مولانا! کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میں خود اپنے تجربے سے جانتا ہوں کہ قومی اور ملی زندگی کی تعمیر کے لیے ہمارے پاس کافی سامان موجود ہے۔ اگر ہم صرف اسے کام میں لانے کا طریقہ سمجھ لیں۔ ہم پر ابھی دولت اور حکومت کا نشہ چڑھا ہے، اگرچہ دولت اور حکومت دونوں مدت ہوئی ہمارے ہاتھ سے نکل گئیں۔ اگر یہ نشہ جو ہمارے دماغ کو بے کار کیے ہوئے ہے، اتر جائے، ہم ہوش میں آئیں اور حقیقت سے آگاہ ہوں تو پھر ہم دنیا میں بڑی حیثیت پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مسلمانوں کو نشے سے چور رکھنا چاہتے ہیں اور اسی میں سمجھتے ہیں کہ قوم کی عزت اور آبرو ہے۔ ہم مسلمان کیا ہیں گویا کائنات کے سارے کارخانے کا دارومدار ہمارے ہی اوپر ہے۔ ہم نے کلمہ کیا پڑھ لیا ہے کہ ہر عیب سے پاک اور ہر بلا سے محفوظ ہو گئے۔ خود پرستی اور تکبر نے ہماری عقل پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ اپنی رسوائی کی بھی ہم کو خبر نہیں اور ہم اس مہلک خبط میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ہم چاہے جیسے نانہجار کیوں نہ ہو جائیں، ایک نعرۂ تکبیر ہمیں پھر انسان اور مسلمان بنا دے گا۔ مجھے نعرۂ تکبیر کے جادو میں کوئی شک نہیں۔ شک ہے تو اس میں کہ ہمارے دل اس کا اثر قبول کر سکیں گے یا نہیں، مگر کیا کہوں، مولانا منہ کھولتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ہم نے فرض کر لیا ہے کہ بیداری کے معنی

دوسروں سے لڑنا جھگڑنا ہے۔ کوئی سچی نیت سے بھی مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کرے تو اس پر فوراً الزام لگتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو ہندوؤں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔

مولوی عبدالرحمان: جی ہاں آپ بجا فرماتے ہیں۔

(خاموشی)

دلدار حسین: خیر مولانا، ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ بھگوان داس صاحب، مل کے کارکنوں کے بچوں کے لیے ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام انھوں نے میرے سپرد کیا ہے۔ آپ غالباً یتیم خانے سے دو چار طالب علم تو ایسے دے سکیں گے جو اس میں پڑھا سکیں، اس کے علاوہ اگر آپ اس کی نگرانی بھی اپنے ذمہ لے لیں تو بڑی عنایت ہوگی۔

مولوی عبدالرحمان: جی ہاں، بہت خوشی سے۔

دلدار حسین: مدرسہ کے اخراجات تو زیادہ نہ ہوں گے۔ اور بھگوان داس صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ آدھا خرچ وہ دیں گے۔ لیکن اگر آپ نگرانی کا ذمہ لیں تو میں سرمایہ فراہم کرنے کو تیار ہوں، اور آپ کو اس کا بھی حق ہوگا کہ تعلیمی ضرورتیں دیکھ کر خرچ کو بڑھا دیں۔ مل میں قریب ایک ہزار ملازم ہیں اور آپ کے اسکول میں تین چار سو لڑکے ضرور ہوں گے۔

مولوی عبدالرحمان: معاف فرمائیے گا۔ میں ابھی اچھی طرح سے سمجھا نہیں۔ آپ جو رقم ضروری ہوگی وہ خود ماہوار یا سالانہ دیں گے یا اتنا جمع کر دیں گے کہ اس سے کام چلتا رہے۔

دلدار حسین: اتنا تو شاید میں فی الحال نہ دے سکوں کہ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں مگر آپ مطمئن رہیں۔ آپ نے جس ہمت اور استقلال سے اپنے یتیم خانے کا کام چلایا ہے، اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ پر دولت نثار ہوتی رہے گی۔ آپ کو انشاء اللہ میرے جیسے ہزاروں مل جائیں گے۔

مولوی عبدالرحمان: جہاں تک روپے کا تعلق ہے آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ کام کرنے والے پر دولت نثار ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں صرف کام کرنے والوں کی کمی نہیں قدردانوں کی اس سے زیادہ کمی ہے۔ شروع میں میرے کئی سال لوگوں کو محض یہ سمجھانے

میں لگے کہ یتیم خانے پر اتنی محنت اور توجہ صرف کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ یتیموں کو عید بقرعید یا شادی بیاہ کے موقعوں پر پیٹ بھر کے کھانا کھلانا تو سب ثواب کا کام سمجھتے ہیں مگر انھیں اچھی تعلیم دینا سب کو بے کار کی دردسری معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں شہرت اور اثر حاصل کرنے کا موقع نہیں۔ جو لوگ اس کام کو اچھا سمجھتے ہیں انھیں بھی ناگوار ہوتا ہے۔ اگر کوئی سلیقے کا آدمی اسے اپنے ذمے لے لے۔ آپ کے اور حسام الدین کے سوا مجھے ابھی تک کوئی ایسا نہیں ملا ہے جس نے اس کام کو توجہ کے قابل سمجھا ہو، اور مجھے اسی میں لگے رہنے کا مشورہ دیا ہو۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

دلدار حسین: (مسکرا کر) جی ہاں، حسام الدین کے تو آپ ہر وقت گن گایا کرتے ہیں۔ حسام الدین کے کیا کہنے ہیں (خادم سے مخاطب ہو کر) کیوں کیا ہے؟

خادم: حضور! حشمت اللہ صاحب تشریف لائے ہیں۔

دلدار حسین: بلا لاؤ۔ دیکھیے مولانا، قوم کے ایک بڑے خیر خواہ تشریف لائے ہیں۔ یہ حضرت جاسوسی نہ کرتے تو عبدالغفور صاحب بیچارے کو کبھی جہاد کا خیال بھی نہ ہوتا (حشمت اللہ مسکراتا ہوا داخل ہوتا ہے اور جھک کر سلام کر کے ایک طرف بیٹھ جاتا ہے، دلدار حسین اور مولوی عبدالرحمان سلام کا جواب دیتے ہیں) کہیے جناب جی بھر کر فساد کرا لیا، یا ابھی کوئی کسر باقی ہے؟

حشمت اللہ: (نہایت سنجیدہ چہرہ بنا کر اور سر جھکا کر) آپ بزرگ ہیں، جو جی چاہے کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی اوروں کی طرح دھوکا ہوا ہے اور میں نے بھی دھوکا کھا کر نقصان ہی اٹھایا ہے۔

دلدار حسین: خیر یہ تو آپ جانیے اور آپ کا خدا جانے، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ آپ اسی طرح دھوکے کھاتے رہے تو آپ کی نوکری جائے گی۔ میونسپلٹی والوں نے آپ کے خلاف کارروائی شروع کی تھی، مگر اس مرتبہ کسی وجہ سے رہ گئے۔ آئندہ ذرا وہ زیادہ سختی کریں گے اور کیا معلوم بورڈ میں جو مسلمان ممبر ہوں، ان میں اتنا ملی جوش ہو، یا نہ ہو کہ آپ کو بچالیں۔

حشمت اللہ: (نہایت نیاز مندانہ لہجے میں) جناب والا، میں تو دولت خانے پر اسی کا شکریہ بجالانے حاضر ہوا ہوں کہ آپ نے میرے اوپر بہت بڑا احسان کیا، اور مجھے ایک مصیبت سے بچالیا۔ اب آئندہ انشاءاللہ زیادہ احتیاط کروں گا......

دلدار حسین: خیر تو پھر بہت اچھا ہے...... پھر فرمایئے مولانا۔ بھگوان داس سے کب ملاقات کراؤں؟

مولوی عبدالرحمان: جب آپ کو فرصت ہو، میں تو ہر وقت حاضر ہوں۔

دلدار حسین: بہت اچھا تو پھر میں ان سے طے کرلوں گا بلکہ بہتر ترکیب یہ ہے کہ حشمت اللہ صاحب کل ہی ان سے مل لیں اور اگر ہو سکے تو انھیں میونسپلٹی سے بھی کچھ وصول کرنے پر آمادہ کرلیں۔ انھیں بھی تو آخر قوم کی کچھ خدمت کرنا چاہیے۔

(حشمت اللہ سر جھکا لیتا ہے۔ دونوں اس کی طرف کچھ دیر دیکھتے ہیں، دلدار حسین مسکراتا ہے)

(پردہ)

دوسرا سین

(حسام الدین کے مکان کے سامنے پھلواری، جیسے پہلے ایکٹ پہلے سین میں۔ حسام الدین ایک میز کے پاس کھڑا پھولوں کا ایک گلدستہ بنا رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولا بخش اور اس کا بھتیجا داخل ہوتے ہیں۔ دونوں صاف کپڑا پہنے ہیں۔ مولا بخش نے داڑھی میں کنگھی کی ہے، اور پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ تندرست معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلی لٹکی ہوئی ہے۔ دونوں حسام الدین کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور جب وہ سر اٹھاتا ہے تو تپاک سے جھک کر سلام کرتے ہیں۔)

حسام الدین: وعلیکم السلام! کہیے جناب، کیا حال ہے؟ اور کام کیسا چل رہا ہے؟

مولا بخش: آپ کی دعا ہے۔

حسام الدین: ہاں، کمر میں لوچ آ گئی ہے۔ پہلے تو کبھی تمھیں ایسے لچک کر سلام کرتے دیکھا نہیں...... خیر تو معاملے کی بات سناؤ۔

مولا بخش: صاحب، وہ لوہے کہ پہیے اور زنجیر تیار کر لایا ہوں۔ وہ تکلے جو آپ نے سیدھے کرنے کو

دیے تھے وہ بھی ٹھیک کر دیے، کہیں تو دکھادوں؟

دلدار حسین: اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔

(مولا بخش تھیلی زمین پر رکھ دیتا ہے اور اس میں سے یہ سب چیزیں نکال کر حسام الدین کو دکھاتا ہے۔ حسام الدین انھیں غور سے دیکھتا ہے، اور بہت مطمئن معلوم ہوتا ہے۔)

حسام الدین: ہاں چیزیں بہت ٹھیک ہیں۔ اچھا اب اس کا معاوضہ کیا پیش کیا جائے؟

مولا بخش: مجھے معاوضے کی ضرورت نہیں، آپ کی دعا سے اب کھانے کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔

حسام الدین: تو مجھے آپ کی چیزوں کی ضرورت نہیں۔ خدا کے فضل سے بہت ایسے لوہار ہیں جو مجھ پر بغیر احسان رکھے میرا کام کر دیں گے۔

مولا بخش: (ہنس کر) اچھا صاحب تو پھر ڈھائی روپے دے دیجیے۔

حسام الدین: ابھی حاضر کروں؟

مولا بخش: جب مناسب ہو۔

حسام الدین: تو ابھی لے لو۔

(جیب میں ہاتھ ڈال کر ریزگاری نکالتا ہے اور گن کر مولا بخش کو دے دیتا ہے۔ مولا بخش دام پھینٹ میں رکھ کر اکڑوں زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

مولا بخش صاحب کچھ دنیا کی خبر سنائیے۔

حسام الدین: کیا سناؤں بھائی، سب خیریت ہے۔

مولا بخش: ارے صاحب (ہاتھ سے اشارہ کر کے) کچھ اپنے مسلمان بھائیوں کی خبر، کیا حال ہے کیا ہو رہا ہے؟

حسام الدین: (ٹھنڈی سانس بھر کر۔ پھولوں اور پتیوں کو درست کرتے ہوئے) اچھا حال ہے۔ سب اپنی اپنی کھیتی میں مشغول ہیں اور خدا ان کے کام میں برکت دے رہا ہے۔ بس ایک ہم ہی ہیں کہ فصلوں کا حساب تک بھول گئے ہیں۔ اصل بات تو یہی ہے کہ آدمی اپنی

کھیتی میں لگا رہے۔ اگر ہم اس لائق نہیں ہیں کہ اپنا پیٹ پال سکیں، ایسے محتاج رہتے ہیں کہ کوئی دوسرا خیرات دے یا قرض دے تو کام چلائیں، تو ہم دنیا میں کسی کا کیا بھلا کر سکتے ہیں اور ہمارے مسلمان بھائی بھی ہمیں کیوں آنکھ اٹھا کر دیکھنے لگے۔ ہم کو اپنے دین پر فخر ہے، فخر ہونا بھی چاہیے مگر ہم اپنے ہمسایوں سے نباہ نہ کر سکے، اس سے وہ سلوک نہ کر سکے جو ہمارا مذہب ہمیں سکھاتا ہے، تو ہم دوسروں کے بھائی بن کر انھیں کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ بے تمیز اور نالائق کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ محتاج اور دست نگر کی کہیں عزت نہیں ہوتی، اگر ہم تم مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ سب سے پہلے اپنے ہمسایوں اور ہم وطنوں کی خدمت کریں۔ ان کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کریں۔ ان کی نظروں میں عزت حاصل کریں، پھر ہم اس لائق بھی ہوجائیں گے کہ ہندوستان کے باہر بھی اپنے مسلمان بھائیوں سے راہ ورسم پیدا کریں...... کچھ سمجھے؟

مولا بخش: ہاں صاحب ہماری حالت تو واقعی بہت خراب ہے، اب آپ دیکھیے......

حسام الدین: ہاں صاحب تو سب سے پہلے آپ محنت کرنا اور کمانا سیکھیے، فضول خرچی چھوڑیے، ٹھاٹھ کرنا چھوڑیے، ہر وقت، ہر بات پر اینٹھنا چھوڑیے، سر پر غرور کا جو شیطان سوار ہے اسے نکال بھگائیے۔ آنکھیں کھول کر اپنی حالت کو اچھی طرح دیکھیے۔ آپ کے مر مٹنے سے خدا کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، اس نے آپ کی حیثیت قائم رکھنے کا کوئی ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ ہمارے مسلمان ہونے سے دنیا کے قاعدے قانون میں کوئی فرق نہیں آسکتا، جو جیسا کرے گا ویسا ہی پائے گا۔ ہم اس لائق نہ رہے کہ اسلام کی شان قائم رکھ سکیں، تو خدا ہم سے بہتر بندے پیدا کر سکتا ہے اور ہم پھر وہی خاک ہوجائیں گے جو پہلے تھے...... تو صاحب اگر آپ کو پھر جہاد کا شوق ہو تو ڈنڈا ہاتھ میں لینے سے پہلے آپ یہ سوچ لیجیے کہ جن لوگوں سے آپ لڑنے جا رہے ہیں ان کے ساتھ آپ نے سلوک کیسا کیا ہے۔ پہلے ان کی خدمت کیجیے، ان کی محبت حاصل کرنے کے لیے قربانیاں دیجیے، وہ زیادتیاں بھی کریں تو انھیں سہ لیجیے اس لیے کہ جہاد خدا کے لیے ہوتا

ہے، اپنا غصہ اتارنے کے لیے نہیں...... خدا نے جس زمین پر تمھیں بسا دیا ہے، جس ملک کو تمھارا دیس بنایا ہے، جن لوگوں کے ساتھ تمھیں رکھا ہے، اس میں اس کی کوئی مصلحت ہوگی۔ اپنی کھیتی کرو، ہم وطنوں سے بھائی چارہ کرو، ہمسائیگی کا حق ادا کرو۔ خدا اور رسول نے جو بتایا ہے اس پر عمل کرو۔ خدا کو اپنے بندوں کی تم سے زیادہ فکر ہے۔ تم اپنا فرض ادا کرتے رہو، باقی سب اس کے ہاتھ میں رہنے دو۔ وہ اپنا کام تم سے بہتر جانتا ہے......

(حسام الدین نے گلدستہ تیار کرلیا ہے۔ اسے وہ گل دان میں رکھتا ہے۔ اسی وقت مغرب کی اذان ہوتی ہے۔)

(پردہ)

انجام

کردار (اشخاص)

شیخ نجم الدین	:	ایک سابق حاکم عدالت
رکن الدین	:	اس کا لڑکا (ضعیف العقل)
مختار علی	:	مصاحب
مولانا عبداللہ	:	
شاہ نور محمد	:	درگاہ کا مجاور
شکر اللہ	:	بے روزگار نوجوان، شیخ نجم الدین کا بھانجا
ایک فقیر	:	بوڑھا اور اندھا
معروف	:	نجم الدین کا ملازم
مجاور	:	
فقیر	:	
برقعہ پوش عورتیں	:	
سیاہ فام آدمی	:	

پہلا ایکٹ

پہلا منظر

(شیخ نجم الدین کے مکان کا کمرہ فیشن کا خیال رکھتے ہوئے آراستہ کیا گیا ہے۔ دری اور اس پر قالین بیچ میں، میز اور اس کے گرد پانچ چھ کرسیاں۔ میز پر کاغذ کے پھولوں کا گلدستہ۔ دائیں طرف ایک آرام کرسی۔ داخلے کا ایک دروازہ دائیں، دوسرا بائیں جانب۔ شکر اللہ ایک کرسی پر بیٹھا کسی رسالے کے ورق الٹ رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں شیخ نجم الدین اچکن ٹوپی پہنے، ہاتھ میں چھڑی لیے دائیں دروازے سے اندر آتے ہیں۔ شکر اللہ کھڑا ہو کر سلام کرتا ہے۔ شیخ صاحب اطمینان سے اچکن ٹوپی اتار کر معروف کو دے دیتے ہیں، جو ان کے پیچھے اندر آیا ہے۔)

(خاموشی)

شیخ نجم الدین: دیکھو، شکر اللہ، تم اور رکنو دونوں آج فجر کی نماز کے لیے پھر نہیں اٹھے۔

(شکر اللہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے)

شیخ نجم الدین: مجھے تم سے بار بار کہتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہوتا، مگر یہ بات بہت بری ہے۔ صبح کو اٹھنا کچھ ایسا دشوار نہیں ہے، جب تم رات کو وقت سے سو جاتے ہو۔ میرے خیال میں تم تہجد کے لیے بھی چاہو تو اٹھ سکتے ہو۔ بندے خدا کو خوش کرنے کے لیے جتنی بھی تکلیف اٹھائیں وہ کم ہے، اور جن فرائض کو ہم بغیر تکلیف اٹھائے ادا کر سکیں ان میں تو کبھی غفلت کرنا ہی نہ چاہیے یہ تو مفت میں خدا کو ناراض کرنا ہے..... کیوں، کچھ بولتے کیوں نہیں؟

شکر اللہ: جی ہاں، آپ بجا فرماتے ہیں۔

شیخ نجم الدین: اچھا، تو پھر دیکھو، آج سے ناغہ نہ ہونے پائے۔ رکنو سے بھی کہہ دینا۔

شکر اللہ: بہت اچھا۔

(خاموشی)

شیخ نجم الدین: معروف!

معروف: جی حضور!

شیخ نجم الدین: دیکھو، میرے حجرے میں وہ بڑا ہزارہ رکھ دو۔ آج لمبے وظیفے کا دن ہے۔

معروف: بہت اچھا، حضور۔

شیخ نجم الدین: اور سنو! تمھارے پاس وہ پرچے ہیں جن پر نیا وظیفہ لکھا ہے۔ وہ جانماز پر رکھ دینا اور وہ تعویذ سرہانے رکھ دیا ہے نا؟

معروف: جی حضور۔

شیخ نجم الدین: اور گلے میں باندھنے کے جو تعویذ ہیں انھیں اندر دے دیا ہے؟

معروف: جی حضور۔ بٹیا صاحبہ نے کہا ہے ایک گھنٹے کے اندر تیار کر دیں گی۔

شیخ نجم الدین: اچھا تو غسل خانے میں پانی رکھ دو۔

(اٹھ کر اندر چلے جاتے ہیں۔ شکر اللہ پہلے کی طرح رسالے کے ورق الٹنے

لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد معروف آتا ہے اور کرسیاں جھاڑنے لگتا ہے۔)

معروف: (ٹھنڈی سانس بھر کر) بزرگوں کی بھی باتیں عجیب ہوتی ہیں۔

شکراللہ: کیوں، کیا ہوا؟

معروف: کیا بتاؤں صاحب، کہنے کی بات نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہیں ہم لوگ جاہل ہیں، نماز اماز آپ لوگوں کے سکھانے سے پڑھنے لگے ہیں، نہیں تو ہم کو کیا تمیز تھی۔

شکراللہ: اچھا تو؟

معروف: کیا کہوں صاحب۔ یہاں ایک اندھے فقیر ہیں، وہ روز بھیک مانگنے ادھر سے نکلتے ہیں مگر ہمارے یہاں سے کچھ نہیں لیتے۔ کہتے ہیں، بڑے پاپی کا گھر ہے، مجھے معاف کرو، میں یہاں سے کچھ نہیں لے سکتا۔ میں نے بہت خوشامد کی۔ یہ بھی کہا کہ شاہ صاحب، ہمارے یہاں تو سب نمازی ہیں، مگر وہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں نا بابا۔ یہ تو بڑے پاپی کا گھر ہے۔ میں کچھ نہیں لیتا۔

شکراللہ: تو یہ تو ان کی عنایت ہے۔ اس میں شکایت کی کیا بات ہے؟

معروف: صاحب آپ تو تالیم آفتہ (تعلیم یافتہ) ہیں، آپ ایسے لوگوں کو مانتے نہیں۔ ہم جاہل لوگ انھیں بڑا اولی اللہ سمجھتے ہیں۔ اب تو وہ اندھے ہو گئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں پہلے بڑے عالم تھے۔ ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔ اب بھی کوئی مولوی اولوی ان کے سامنے منھ نہیں کھول سکتا۔ مگر وہ بھیک مانگتے پھرتے ہیں، اس لیے کوئی انھیں پوچھتا نہیں...... میں تو انھیں بہت بڑا آدمی سمجھتا ہوں، اور میری جان پہچان کے جتنے لوگ ہیں سب انھیں شاہ صاحب، شاہ صاحب، کہہ کر پکارتے ہیں اور انھیں یہاں تک مانتے ہیں کہ ان کے لیے جان دینے کو تیار ہیں۔

شکراللہ: اچھا!

معروف: جی ہاں صاحب، اس میں کیا شک ہے اور میں تو سمجھتا ہوں کہ میاں مولوی صاحب کی جگہ ان کے پاس جایا کریں تو بہت اچھا ہو۔ مگر ان سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ آپ کہہ دیں تو شاید مان بھی جائیں۔

شکر اللہ: معاف کرو، بھائی، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ تمھیں ان سے کہو۔ دو چار کرامات، بھی بیان کر دو تو ماموں جان جلدی سے راضی ہو جائیں گے۔

معروف: نہیں صاحب، میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں۔

(رکن الدین داخل ہوتا ہے۔ چپکے سے شکر اللہ کے پاس بیٹھ جاتا ہے)

رکن الدین: کہو، کیسی ڈانٹ پڑی؟

شکر اللہ: کہیں بھی نہیں۔ تم کو البتہ کہا تھا کہ نہ اٹھیں تو لوٹا بھر ٹھنڈا پانی انڈیل دو۔ تب ضرور اٹھیں گے۔

رکن الدین: جی ہاں!

شکر اللہ: اچھا نہ مانو، کل صبح کو دیکھ لینا۔

(پردہ)

دوسرا منظر

(شیخ نجم الدین کے مکان کا کمرہ، آرائش وہی جو پہلے منظر میں۔ شکراللہ ایک کرسی پر بیٹھا ہے، اس کی قبا نما ترکی ٹوپی میز پر رکھی ہے۔ ٹوپی کا پھندنا گر گیا ہے، تسمہ بالکل سیدھا کھڑا ہے۔ شکراللہ کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت دیر سے بیٹھا ہے۔ تھوڑی دیر میں باہر سے پیروں کی آہٹ اور کھنکھار کی آواز سنائی دیتی ہے۔)

شکراللہ: یہ لیجیے، کوئی مولوی یا مجاور آ گیا۔

(مولانا عبداللہ داخل ہوتے ہیں۔ شکراللہ اٹھ کر انھیں ادب سے سلام کرتا ہے۔ وہ بے پروائی سے جواب دیتے ہیں اور جوتے اتار کر آرام کرسی پر پیر رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ شکراللہ ان کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ مگر وہ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوتے۔)

مولانا عبداللہ: ارے میاں معروف!

(معروف فوراً نمودار ہوتا ہے اور جھک کر سلام کرتا ہے)

مولانا عبداللہ: بھئی ذرا پیاس لگی ہے، ایک بوتل لمبلیٹ پلاتے۔

معروف: بہت اچھا، حضور۔

مولانا عبداللہ: اور دیکھو، ذرا شیخ صاحب کو بھی اطلاع کر دینا کہ ہم آئے ہیں۔ مگر پہلے بوتل پلا دو۔

(معروف چلا جاتا ہے اور بہت جلد ایک گلاس میں لیمنڈ لے کر آ جاتا ہے۔
مولانا اسے دیکھتے ہی بے صبری سے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ اور گلاس کو ہلا کر
خوب مزہ لے لے کر ایک دو گھونٹ پیتے ہیں۔)

مولانا عبداللہ: الحمدللہ۔ ان انگریزوں نے بھی کیا قیامت کی چیز ایجاد کی ہے۔

شکراللہ: جی مولانا عجیب چیز ہے۔ منہ میں پانی، پیٹ میں ہوا۔

مولانا عبداللہ۔ جس قدر بھی پیتا چلا جاؤں، سیری نہیں ہوتی۔

شکراللہ: خیر مولانا، آپ کو کیا فکر ہے۔ معروف پلاتا رہے گا۔

(مولانا عبداللہ شکراللہ کو گھور کر دیکھتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں، اور پھر شکراللہ سے مخاطب نہیں ہوتے، اپنا لیمنڈ کا گلاس خالی کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اندر سے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے تو وہ اور جلدی جلدی پینے لگتے ہیں۔ گلاس کو خالی کر کے پھرتی سے چھپا دیتے ہیں اور زہد اور منہ پونچھ کر چہرے اور ڈاڑھی پر پھیرتے ہیں۔ اب ان کی صورت سے زہد اور ریاضت کے آثار نمایاں ہیں۔ شیخ نجم الدین کے داخل ہوتے ہی وہ اپنا رومال اور عصا سنبھال کر آدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

شیخ نجم الدین: آداب عرض کرتا ہوں۔

مولانا عبداللہ: السلام علیکم۔

(دونوں مصافحہ کرتے ہیں۔ شیخ نجم الدین ادب سے مولانا کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ شکراللہ بھی شیخ نجم الدین کو سلام کرتا ہے، مگر وہ اس کی طرف رخ ہی نہیں کرتے۔)

شیخ نجم الدین: مزاج اقدس۔

مولانا عبداللہ: الحمدللہ۔ میں تو پرانی وضع کا آدمی ہوں نہ آج کل کے فیشن سے دلچسپی رکھتا ہوں نہ بیماریوں سے۔

شیخ نجم الدین: مولانا، بیماریاں تو ہم دنیاداروں کے گناہوں کی سزا ہیں۔ آپ کے پاس تو کوئی بیماری پھٹکنے نہ پاتی ہوگی۔ آپ کی تمام عمر عبادت اور ریاضت میں گزری ہے، دنیا سے آپ کو ذرا بھی لگاؤ نہیں۔

مولانا عبداللہ: (انکسار کے ساتھ مسکرا کر) یہ تو آپ کی قدردانی ہے۔ میں تو اپنے آپ کو ایک گنہگار بندہ سمجھتا ہوں۔

شکراللہ: مولانا کیا گنہگار سچے دل سے اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے ہیں؟

(اس پر مولانا اور شیخ نجم الدین دونوں خفا سے ہو جاتے ہیں اور شیخ نجم الدین شکراللہ کو بہت گھور کر دیکھتے ہیں۔ شکراللہ کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا۔)

شکراللہ: مولانا، اگر میں نے گستاخی کی ہے تو معافی چاہتا ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں آج کل مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کس طرح ہوتی ہے۔ میں نے کئی سال دینیات پڑھی، امتحانوں میں پاس ہوتا رہا۔ مگر مجھے یہ صحیح طور پر نہیں معلوم کہ گناہ کس کو کہتے ہیں اور گنہگار کیسے ہوتے ہیں۔

شیخ نجم الدین: میاں صاحب زادے، اگر کئی سال دینیات پڑھنے کے بعد بھی ایسی بات تمھاری سمجھ میں نہ آئی تو اب تمھیں کوئی کیا سمجھا سکتا ہے۔

شکراللہ: جی ہاں، اس میں کچھ قصور میری سمجھ کا ضرور ہوگا۔ لیکن......

شیخ نجم الدین: لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم لوگ دینی مسائل کو مذاق سمجھتے ہو۔ میں خوب جانتا ہوں۔

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

مولانا عبداللہ: کیا بتاؤں شیخ صاحب، آج کل کے نوجوان مسلمانوں کو دیکھ کر دل کو کتنا صدمہ ہوتا ہے۔ ان سے زیادہ گستاخ اور بے تمیز تو شہر کے شہدے بھی نہیں ہوتے۔ جسے دیکھیے وہ مذہب کی بیخ کنی کی فکر میں ہے۔ کوئی دہریہ بن کر عقائد کو مٹانا چاہتا ہے، کوئی صاحب

بہادر بن کر احکام کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے۔ غرض دین کی اور دین داروں کی ہر طرح توہین کی جاتی ہے۔ اب جو کچھ ہے وہ یا تو بناوٹی فلسفہ یا کوٹ پتلون، سگریٹ اور بیہودہ مسخراپن۔

شکر اللہ: مولانا، آپ کی خطابت کی داد دیتا ہوں۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، میں کوٹ پتلون نہیں پہنے ہوں اور اگر دہریہ ہوں تو ناواقفیت کی وجہ سے۔ فلسفہ سے مجھے کوئی واسطہ نہیں۔ میں کوئی خدائی فوجدار نہیں ہوں، نہ زبردستی کسی کی ڈاڑھی منڈوانا چاہتا ہوں، نہ کسی کو مشرک منافق ثابت کر کے سنگسار کرانا۔

شیخ نجم الدین: (بگڑ کر) توبہ توبہ، بدتمیزی کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ تم کو کیا حق ہے کہ میرے گھر میں میرے معزز مہمان کی توہین کرو؟

مولانا عبداللہ: (مسکرا کر) خیر، یہ تو پھر بھی غنیمت ہیں۔ میں ان سے بہت زیادہ بے ادب لوگوں کی باتیں سن چکا ہوں۔ ابھی ایک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، کوئی پچاس سال کی عمر ہوگی، خدا نے عزت اور مرتبہ دیا ہے، سنتا ہوں کسی ضلع کے کمشنر ہیں، مگر مجھ سے ملتے ہی پوچھا فرمایئے حضرت، یہ خدا اور رسول کا ڈھونگ کب تک چلتا رہے گا۔ میں نے مارے شرمندگی کے سر جھکا لیا اور پھر وہ کسی اور سے اسی انداز میں گفتگو کرنے لگے۔

شیخ نجم الدین: توبہ توبہ، نعوذ باللہ۔

مولانا عبداللہ: شیخ صاحب! بس کیا بتاؤں۔ ایسی باتیں سن کر تو یہ دعا مانگنے کو جی چاہتا ہے کہ موت نہ آئے تو کم از کم بہرا اور اندھا ہو جاؤں۔ جب مسلمان خدا اور رسول کی اس طرح بے ادبی کرتے ہوں تو ہم جیسوں کو مر جانا ہی بہتر ہے۔

شکر اللہ: مولانا، گستاخی معاف ہو، مرنے سے تو کوئی مسئلہ طے نہیں ہوتا۔ آپ کا فرض ہے کہ ہم گمراہوں کو راہ راست پر لایئے۔

شیخ نجم الدین: ارے میاں تم کسی طرح سے چپ بیٹھو گے یا نہیں۔

مولانا عبداللہ: گمراہ راہ راست کی تلاش میں ہو تو اس کی رہبری ممکن ہے۔ جو اپنی گمراہی پر ناز کرتا ہو اس کی ہدایت کون کر سکتا ہے۔

شکراللہ: معاف فرمایئے گا مولانا، ایسا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ آپ جسے گمراہی کہتے ہیں وہ محض ایک طرح کی ضد ہے۔ جب سمجھدار آدمیوں سے کہا جاتا ہے کہ مذہبی مسائل میں اپنی سمجھ سے کام نہ لو، جو کچھ تم سے کہا جائے اسے بغیر کسی حجت کے مان لو، تو وہ ضد میں آ کر خود مذہب کا تختہ الٹ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ دوسروں کے شک کی عزت کیجیے، دوسرے آپ کے ایمان کی عزت کریں گے۔

شیخ نجم الدین: اچھی کہی، شک کی عزت کرو، شک نہ ہوا کوئی گزیٹڈ آفیسر ہو گیا۔ بس اب تم اپنی لیاقت زیادہ نہ دکھاؤ تو بہتر ہے۔

(رکن الدین چپکے سے داخل ہوتا ہے اور سب کو اس طرح سلام کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے منہ پر سے مکھیاں اڑا رہا ہے۔ سلام کرنے کے بعد وہ شکراللہ کے قریب بیٹھ جاتا ہے)

شیخ نجم الدین: ملاحظہ فرمایئے مولانا یہ بھی نئی پود کا ایک نمونہ ہے۔ باپ کی پنشن ہو گئی ہے، ماں بوڑھی ہے، مگر کیا مجال ہے جو لڑکا ذرا بھی محنت مشقت گوارا کرے۔ میٹرک میں فیل ہونے کے بعد اس نے سمجھ لیا کہ اب دنیا کے سارے فرائض سے سبک دوش ہو گیا ہوں، اور اب لاکھ سمجھاؤ کچھ نہیں سمجھتا، بس احمقوں کی طرح ہنسنے پر ہر وقت تیار رہتا ہے۔ ہائے ہمارا بھی کیا انجام ہوا۔ اور دیکھیے ابھی قسمت میں کیا لکھا ہے...... جاؤ شکراللہ، اب تم بھی ذرا دیر کے لیے رکنو سے باتیں کرو میں مولانا سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

(شکراللہ اور رکن الدین اٹھ کر باہر چلے جاتے ہیں۔ مولانا اور شیخ نجم الدین کچھ دیر خاموش رہتے ہیں۔)

شیخ نجم الدین: (چونک کر) مولانا معاف فرمایئے گا ان صاحب زادے کی باتوں میں مجھے خیال نہیں رہا۔ آپ چائے تو نہیں پییں گے۔

مولانا عبداللہ: (مسکرا کر) جی نہیں شکریہ۔

شیخ نجم الدین: خیر تو اور کچھ، شربت، لیمنڈ۔

(مولانا سر سے ایسا اشارہ کرتے ہیں جس کے معنی ہیں خیر آپ کی خاطر پی

لوں گا۔ شیخ نجم الدین معروف کو آواز دیتے ہیں اور اسے لیمنڈ پلانے کا حکم دیتے ہیں۔ جب معروف چلا جاتا ہے تو وہ جلدی سے ادھر ادھر دیکھ کر ٹھنڈی سانس لیتے ہیں اور دبی آواز سے گفتگو شروع کرتے ہیں۔)

شیخ نجم الدین: مولانا، آپ کو یاد ہوگا آپ سے پچھلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی تو میں نے عرض کیا تھا کہ میری طبیعت بہت بے چین رہتی ہے اور کبھی کبھی دل پر ایسا خوف طاری ہوتا ہے کہ ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور اس طرح دم گھٹنے لگتا ہے کہ جیسے کوئی گلا دبا رہا ہو۔ آپ نے مجھے سونے سے پہلے ایک دعا ہزار دفعہ پڑھنے کو بتائی تھی اور ایک اور دعا بتائی تھی کہ جب خوف زیادہ معلوم ہو تو پڑھ کر سینے پر دم کر لیا کرو۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور اس سے کچھ دنوں سکون رہا۔ مگر اب تین چار روز سے پھر کچھ وحشت سی معلوم ہوتی ہے، نماز اور وظیفے میں جی نہیں لگتا، اور بدن میں ایسی سنسنی اٹھتی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔ خیال ہوتا ہے کہ روح جسم سے نکلنا چاہتی ہے اور نکلتے ہوئے ڈرتی ہے۔

مولانا عبداللہ: جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔ یہ ایک خاص کیفیت ہے۔ مگر آپ وہ وظیفہ پڑھتے رہیے، انشاء اللہ آپ کو پورا سکون ہو جائے گا۔ مجھے یاد ہے میرے استاد مرحوم کے پاس ایک شخص یہی شکایت لے کر آیا تھا۔ استاد مرحوم نے اسے یہی وظیفہ بتایا جو میں نے آپ سے عرض کیا ہے۔ اور کوئی ایک مہینے کے اندر اس شخص کی شکایت دور ہو گئی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ وظیفہ اس قسم کے تمام امراض کا شرطیہ علاج کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

شیخ نجم الدین: جی ہاں، مولانا، اس میں کیا شک ہے...... (ادھر ادھر دیکھ کر) اب مشکل یہ ہو گئی کہ میں رات کو عجیب عجیب، بھیانک خواب دیکھتا ہوں۔

مولانا عبداللہ: ایسی حالت کے لیے بھی مجھے ایک دعا معلوم ہے، آپ کو لکھ کر دے دوں گا۔ آپ اسے اور وظائف کے ساتھ سوتے وقت سو مرتبہ پڑھ لیا کیجیے۔ اور رات کو خدانخواستہ طبیعت پریشان ہو تب بھی۔ یہ ایک طرح کا جادو ہے۔ جو شیطان ہم پر کرتا ہے اور اس سے ایک زہر ہمارے جسم و جان میں پھیل جاتا ہے۔ مگر ہمارے بزرگوں نے اس ملعون

کی تمام چالیں سمجھ لی ہیں، انھوں نے ہمیں جادو کا توڑ، ہر زہر کا تریاق بتا دیا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ انسان کا عقیدہ درست رہے لہٰذا اسے صحیح ہدایت کرنے والا مل جائے۔

شیخ نجم الدین: مولانا، میرے عقیدے کی درستی کے تو آپ خود شاہد ہیں، اور ہدایت کرنے والا آپ سے بہتر کون ہوگا۔ مگر کیا بتاؤں مولانا، میرے خوف کی تو یہ شدت ہوتی ہے کہ نجات کی امید ہی نہیں رہتی۔ اب خدا کے لیے مجھے اس مصیبت سے کسی طرح جلد بچائیے، نہیں تو زندگی کاٹے نہ کٹے گی۔

مولانا عبداللہ: آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ انشاءاللہ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کو کامل سکون ہو جائے گا۔ میں...... (معروف لیمنڈ لے کر آتا ہے۔ مولانا اسے دیکھتے ہی فوراً ہاتھ بڑھاتے ہیں اور گلاس لے کر بہت شوق سے پیتے ہیں)...... میں دو ایک روز میں پھر حاضر ہوں گا۔ آپ فرمائیں تو آپ کے ساتھ رات رات بھر بیٹھنے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اب آپ کو اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ انشاءاللہ!

شیخ نجم الدین: مولانا، بڑھاپا آ گیا ہے، اب نہ میں دنیا کے کام کا رہا نہ دنیا میرے کام کی۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ باقی عمر عبادت میں صرف کر دوں، اور خدا کے حضور میں جانے سے پہلے گناہوں کا بوجھ کچھ ہلکا کر لوں۔ اگر یہ خوف اور وحشت کے دورے نہ ہوا کرتے تو میں بہت یکسوئی اور دل جمعی سے عبادت میں مشغول ہو جاتا۔ سچ پوچھیے تو مولانا یہ خوف...... مجھے گمراہ کیے دیتا ہے!

مولانا عبداللہ: (مسکرا کر) دیکھیے نا، میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا۔ عقیدے کا درست رہنا ہر حالت میں شرط ہے۔

شیخ نجم الدین: معاف فرمایئے گا مولانا، آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں نعوذ باللہ آج کل کے نوجوانوں کی طرح دہریہ نہیں ہوں، مجھ میں اتنا تکبر نہیں ہے کہ اپنی عقل کے سوا کسی کی نہ مانوں، مگر...... مگر یہ خوف کبھی کبھی ایسا شدید ہوتا ہے کہ میں سمجھ نہیں سکتا کہ ایمان کا اس دل میں گزر کیسے ہو سکتا ہے جس میں خوف کی یہ کیفیت ہو۔

مولانا عبداللہ: شیخ صاحب دینا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کے کندھے گناہوں کے بوجھ سے نہ

جھکے ہوں۔ آپ جانتے ہیں، میرا وقت بیشتر عبادت و ریاضت میں گزرتا ہے، لیکن شیطان کے فریب سے، نفس کی دغابازیوں سے کون محفوظ رہ سکتا ہے۔ میں ہر وقت اپنے دل کو برے خیالات اور بری خواہشوں سے پاک کرتا رہتا ہوں، نفس کو ہر طرح مارتا ہوں، اکل و شرب میں انتہائی پرہیز کرتا ہوں، ہر طرح کے آرام کو، یہاں تک کہ نیند کو بھی گناہ سمجھ کر اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بزرگوں نے قلب اور نیت کی صفائی کے لیے جو دعائیں اور وظیفے بتائے ہیں وہ ہر وقت میری زبان پر رہتے ہیں مگر کیا آپ سمجھتے ہیں مجھے کسی قسم کا اطمینان حاصل ہے؟ ہرگز نہیں۔

شیخ نجم الدین: مولانا، یہ آپ کا انکسار ہے۔ ہزاروں مسلمان آپ کی دین داری اور روحانی عظمت کی قسمیں کھاتے ہیں، مجھ جیسے ہزاروں دنیاداروں کا آپ سہارا ہیں، آپ کی بے چینی تو قرب الٰہی کی دلیل ہے۔

مولانا عبداللہ: یہ آپ کی قدر دانی ہے۔ میں تو اپنے آپ کو ایک معمولی گنہگار بندہ سمجھتا ہوں۔ لوگ میرے پاس آتے ہیں، تعویذ لکھواتے ہیں، دعائیں مانگنے کو کہتے ہیں، پانی پھنکواتے ہیں، اور خدا کے فضل سے ان کی آرزوئیں پوری ہو جاتی ہیں، ان کی شکایتیں رفع ہو جاتی ہیں۔ اس بنا پر لوگ مجھے بزرگ ماننے لگے ہیں۔ لیکن اپنے دل کا حال میں ہی جانتا ہوں۔ یوم الحساب کا جو خوف میرے دل میں ہے وہ صاف اس کی شہادت دیتا ہے کہ میں ایک بہت ہی گنہگار بندہ ہوں۔ بے گناہوں کو خوف نہیں ہوتا، خوف مجرموں اور گنہگاروں کو ہوتا ہے۔ (شیخ نجم الدین یہ باتیں سن کر بہت پریشان ہو جاتے ہیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔) اور خدا چاہتا بھی یہی ہے کہ ہم اس سے ڈریں۔

شیخ نجم الدین: جی ہاں، یہ تو میں بھی جانتا ہوں...... مگر وہ خوف اور ہوتا ہے۔

مولانا عبداللہ: خیر آپ اس مسئلے پر زیادہ غور نہ کیجیے۔ اس سے آپ کی پریشانی اور بڑھے گی۔ میں آپ کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں، اور میرے خیال میں جو وظیفہ میں نے تجویز کیا ہے وہ بہت مفید ثابت ہوگا...... اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ مسجد میں وقت سے پہنچنا ہے۔

شیخ نجم الدین: (اٹھ کر) بہت بہتر ہے۔ میرا جی تو نہیں چاہتا کہ آپ کو جانے دوں...... آپ تشریف

لاتے ہیں تو دل کو بہت اطمینان ہو جاتا ہے۔

مولانا عبداللہ: میں پھر انشاء اللہ بہت جلد حاضر ہوں گا۔

شیخ نجم الدین: میں تو یہی دعا مانگتا رہتا ہوں کہ آپ آئیں اور بہت جلد آئیں۔

(مولانا 'السلام علیکم، خدا حافظ' کہہ کر چلے جاتے ہیں۔ شیخ نجم الدین اندر کو جانا چاہتے ہیں مگر شکر اللہ انھیں پیچھے سے پکار کر روک لیتا ہے۔)

شکر اللہ: ماموں جان! آپ نے فرمایا تھا کہ کانپور میں کسی صاحب کو لکھ کر مجھے ایک کارخانہ میں ملازم رکھوا دیں گے۔ اب اگر فرصت ہو تو کسی وقت لکھ دیجیے۔ میں بالکل بے کار ہوں۔

شیخ نجم الدین: بھئی میرا ارادہ تو تھا کہ تمھارے لیے کوشش کروں، مگر مجھے ڈر ہے کہ تم کارخانہ میں پہنچ کر فساد برپا کرو گے اور مجھے شرمندگی ہوگی۔ اور پھر تمھیں بحث مباحثہ کا ایسا شوق ہو گیا ہے کہ تمھیں کام کرنے کی فرصت کب ملے گی؟

شکر اللہ: میں تو محض بے کاری کی وجہ سے بک بک کیا کرتا ہوں۔ کام ہوگا تو میں اس طرح اپنا وقت نہیں ضائع کروں گا۔

شیخ نجم الدین: کیا معلوم!

شکر اللہ: آپ تو جانتے ہیں میں جھوٹ نہیں بولتا اور ریا کار بھی نہیں ہوں۔ آپ سے جو وعدہ کر کے جاؤں گا وہ پورا کر دکھاؤں گا۔

شیخ نجم الدین: مگر میاں تمھارے خیالات جو اس قدر بگڑ گئے ہیں...... تم تو پورے مشرک و ملحد ہو۔ خدا کو تم نہیں مانتے، رسول کو تم نہیں مانتے، امیروں کے تم دشمن، زمینداروں کے خون کے پیاسے ہو۔ تمھاری کوئی مدد کرے تو کیسے کرے۔ مجھے تو تمھاری صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں میرے جوتا پھینک کر نہ مارو۔ میں تمھیں ایسے شخص کے نام خط دینے والا تھا جو تم سے توقع کرے گا کہ اس کا ادب کرو، اس کی کبھی کبھی ذرا سی خوشامد کر لو، اور خوشامد نہ سہی تو کم از کم اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہو۔ مگر تم تو شاید جاتے ہی اس کی ہر بات کو غلط اور ہر خیال کو بے بنیاد ثابت کرنے لگو گے۔ وہ تمھارے اوپر احسان کرے گا تم کہو گے کہ میں آپ کا اور آپ جیسے تمام کھوسٹ قدامت پسندوں کا دشمن ہوں۔ مجھے تو یہ

ہرگز گوارا نہیں ہوسکتا۔

شکراللہ: جی نہیں، آپ کا خیال غلط ہے۔ میں کسی سے کیوں جھگڑنے لگا۔

شیخ نجم الدین: یہ لیجیے۔ آپ کی تمیز کا یہ حال ہے کہ چھوٹتے ہی کہہ دیا۔ 'آپ کا خیال غلط ہے' اور کچھ بولا تو فرمائیں گے آپ کا دماغ خراب ہے۔

شکراللہ: آپ مجھے ڈانٹنا چاہتے ہیں تو کسی بہانے کی ضرورت نہیں، آپ بزرگ ہیں، مگر......

شیخ نجم الدین: مگر۔ ہاں مگر؟......میاں مجھے کیا پڑی ہے جو میں تمھیں خواہ مخواہ ڈانٹنے لگوں۔ میں بس یہ جانتا ہوں کہ جو شخص خدا سے نہیں ڈرتا اس سے سب کو ڈرنا چاہیے۔

شکراللہ: میں نے کوئی قصور کیا ہوتا تو آپ سے بھی ڈرتا اور خدا سے بھی ڈرتا۔ اس وقت تو مجھے ڈرنے کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

(رکن الدین اندر داخل ہوتا ہے۔)

رکن الدین: مختار علی صاحب تشریف لائے ہیں۔

شیخ نجم الدین: (کرسی پر بیٹھ کر) اچھا، انھیں بلا لو۔

(رکن الدین باہر چلا جاتا ہے اور اسی کے پیچھے شکراللہ بھی۔ مختار علی اندر آتا ہے اور فرشی سلام کرتا ہے۔)

مختار علی: آداب بجا لاتا ہوں......مزاج مبارک؟

شیخ نجم الدین: الحمدللہ۔ فرمائیے کیسے آنا ہوا؟

مختار علی: یوں ہی سلام کرنے کو حاضر ہوا تھا۔ کچھ اڑتی ہوئی خبر سنی تھی کہ دشمنوں کا مزاج ناساز ہے۔

شیخ نجم الدین: جی نہیں۔ میری طبیعت تو خدا کے فضل سے اچھی ہے۔

مختار علی: خیر، خدا کا شکر ہے۔ کل مولانا عبداللہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کچھ فرما رہے تھے کہ آپ کو خدانخواستہ اختلاج اور نیند کی کمی کی شکایت ہوگئی ہے، اس لیے میں نے کہا کہ نیاز حاصل کرلوں اور مزاج پرسی بھی کرلوں۔

شیخ نجم الدین: اختلاج کی کیا شکایت کروں۔ موت کا دن قریب آتا ہے تو سبھی کو اختلاج ہونے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے نیند بھی کم آتی ہے۔

مختار علی: مگر اب تو ضرور افاقہ ہوگا۔

شیخ نجم الدین: جی، افاقہ کیا ہوگا۔ یہ شکایت تو جیتے جی میرا پیچھا چھوڑتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔

مختار علی: اجی توبہ کیجیے، حضور، یہ کوئی ایسا مرض نہیں ہے۔ آپ کے قویٰ ماشاء اللہ ابھی بہت اچھی حالت میں ہیں۔ یہ پریشانی تو بس ایک قسم کا تکان ہے جو رفتہ رفتہ اتر جائے گا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ آپ نے ملازمت کے زمانے میں انتہائی تن دہی سے کام کیا ہے اور اس کام کے آگے آرام کا کوئی خیال نہیں کیا ہے۔ پہلے آپ دن رات مصروف رہتے تھے۔ اس لیے کچھ پروا نہیں ہوتی تھی۔ اب محنت کم کرنی پڑتی ہے تو کچھیے عمر بھر کا تکان یک بارگی محسوس ہونے لگا ہے۔

شیخ نجم الدین: ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو۔ پچھلے چند سال میں مجھ پر واقعی بہت بار پڑ گیا تھا۔ شاید اسی سبب میرے اعصاب بہت کمزور ہو گئے۔ مگر میری کیفیت تکان کا نتیجہ ہے تب بھی اس کا کچھ نہ کچھ علاج تو کرنا چاہیے۔

مختار علی: جی، بجا ہے۔ اس میں کیا شک ہے۔

شیخ نجم الدین: میں نے مولانا عبداللہ صاحب سے اپنی پوری کیفیت تفصیل سے بیان کی ہے۔ انھوں نے بہت غور سے سنا اور چند وظیفے بتا دیے جن سے وہ کہتے ہیں اس کیفیت کو دور کرنے کی کوئی بہتر ترکیب نہیں۔

مختار علی: اور ان سے آپ کو یقیناً فائدہ بھی ہوا ہوگا؟

شیخ نجم الدین: جی ہاں، کچھ یوں ہی سا فائدہ ہوا۔ آج شاید آپ کو معلوم ہوگا مولانا پھر تشریف لائے تھے، وہ فرما گئے ہیں کہ وظیفے کو جاری رکھیے اور اس کے علاوہ کچھ اور دعائیں بھی بتا گئے ہیں۔

مختار علی: جی ہاں، آپ ضرور وظیفہ کو جاری رکھیے، اگر آپ کو اس سے فائدہ محسوس ہو رہا ہو۔ لیکن یہ وظیفہ کوئی طبیب کا نسخہ تو ہے نہیں کہ اس کے سوا اور کوئی دوا استعمال نہ کی جائے۔ اگر گستاخی معاف ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں۔

شیخ نجم الدین: ضرور فرمائیے۔

مختار علی: حضور، اصل بات یہ ہے کہ جیسی شکایت ہو ویسا ہی علاج کرنا چاہیے۔ بعض شکایتیں لے کر آدمی وکیل اور قانون داں کے پاس جاتا ہے، بعض کے لیے طبیب کے پاس، بعض صرف دوست اور ہمدرد کو سنائی جاتی ہیں۔ ہمارے یہاں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ شرعی مسائل مفتی اور مولوی سے پوچھے جاتے ہیں، اور روحانی شکایتیں مرشد اور ولی کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ جو شخص ایک کے پاس جائے وہ دوسرے سے مدد نہ مانگے۔ مفتی اور مرشد دونوں کی ہماری ہدایت کے لیے ضرورت ہے، اور کوئی وجہ نہیں کہ جب دونوں موجود ہیں تو آپ دونوں سے فیض نہ اٹھائیں۔

شیخ نجم الدین: جی ہاں، مجھے صوفیائے کرام سے ہمیشہ بہت عقیدت رہی ہے، اور یہ محض اتفاق کی بات ہے جو میں اب تک کسی کا مرید نہیں ہوا۔ بات یہ تھی کہ جیسا آپ نے فرمایا، میرے پاس کام کی بہت کثرت تھی اور میں دنیا میں ایسا پھنس گیا کہ عاقبت کی فکر کرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں اسی سوچ میں ہوں کہ کسی بزرگ کو اپنا دستگیر بناؤں، مگر بدقسمتی سے کوئی نہیں ملا۔ سنتا ہوں۔ یہاں کی درگاہیں......

مختار علی: جی ہاں، میں یہی عرض کرنے والا تھا۔ درگاہ کے سجادہ نشیں تو مریدوں کی طرف کچھ زیادہ التفات نہیں کرتے، لیکن درگاہ کے ایک مجاور شاہ نور محمد صاحب ہیں جو خود ایک بہت بڑے بزرگ کے خلیفہ ہیں اور ان کے مرید ان کے روحانی کمالات سے پورا فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ اگر فرمائیں تو میں ان سے آپ کا تعارف کرا دوں۔ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ ان سے مل کر آپ کو بہت تسکین ہوگی۔

شیخ نجم الدین: پھر تو ضرور میرا تعارف کرا دیجیے۔

مختار علی: اور لطف یہ ہے کہ شاہ صاحب ایسے آدمی نہیں ہیں جن کے سامنے ادب سے دو زانو ہو کر بیٹھنا پڑے۔ بالکل دوست کی طرح ملتے ہیں، بے تکلفی سے باتیں کرتے ہیں۔ مگر حضور غضب کے مردم شناس ہیں۔ آدمی کو دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں، اس کا سارا حال احوال ان کو ایک نظر میں معلوم ہو جاتا ہے، اور پھر ممکن نہیں کہ آدمی جو شکایت لے کر ان کے پاس جائے وہ رفع نہ ہو، جو آرزو کرے وہ پوری نہ ہو۔ آپ کو

یہ سن کر بھی تعجب ہوگا کہ وہ بڑے پایہ کے طبیب بھی ہیں۔ باقاعدہ مطب تو نہیں کرتے مگر جسے دوا دیتے ہیں وہ خدا کے فضل سے اچھا ہی ہو کر رہتا ہے۔ یہاں تو ایک زمانے میں ان کا بہت چرچا تھا، جسے دیکھیے وہ ان کے پاس بھاگا چلا جارہا ہے۔ اسی سے مجبور ہو کر کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو گئے۔ اب بھی جب لوگ بہت ستاتے ہیں تو وہ غائب ہو جایا کرتے ہیں۔

شیخ نجم الدین: مگر آج کل تو وہ یہیں ہوں گے۔

مختار علی: جی حضور، وہ یہیں ہیں، اور میرے خیال میں آپ کو ان سے بہتر کوئی رہبر، طبیب اور غم گسار نہیں ملے گا۔ آپ کسی سے فرمائیں نہیں، مولانا عبداللہ صاحب بھی اکثر ان کے پاس جایا کرتے ہیں۔

شیخ نجم الدّین: ہاں؟

مختار علی: جی حضور، اس میں کیا شک ہے۔ مجھے تعجب نہ ہوگا اگر مولانا نے جو وظیفے آپ کو بتائے ہیں وہ دراصل شاہ صاحب کے بتائے ہوئے ہوں۔ مولانا نے تو بہت معمولی تعلیم پائی ہے۔

شیخ نجم الدین: جی، مجھے ابھی یاد آیا۔ انھوں نے شاید فرمایا بھی تھا کہ وظیفے ان کے استاد کے بتائے ہوئے ہیں۔

مختار علی: حضور، بس اب آپ سمجھ لیجیے۔

شیخ نجم الدین: اچھا، تو یہ بات ہے۔

مختار علی: جی ہاں، اور پھر آدمی آدمی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہادی کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بے غرض ہو۔ مولانا عبداللہ صاحب بہت نیک آدمی ہیں، لیکن انھیں ہر وقت کوئی نہ کوئی فکر رہتی ہے۔ وہ روپیہ کمانا چاہتے ہیں، کسی امیر گھرانے کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں، اچھا کھانے کا شوق ہے۔ اس سے آپ یہ خیال فرمائیں کہ انھوں نے جو وظیفہ بتایا ہے اس کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ہی کے شہر میں اور لوگ بھی موجود ہیں جن سے آپ کو، میری ناقص رائے میں، زیادہ تشفی حاصل ہو سکتی ہے۔

شیخ نجم الدین: (کچھ دیر سوچ کر) ہاں بہت اچھا، تو پھر میرا شاہ صاحب سے تعارف کرا دیجیے۔ آپ کو کب فرصت ہوگی؟

مختار علی: حضور، میں آپ کا خادم ہوں، جب فرمائیں چلنے کو حاضر ہوں۔

شیخ نجم الدین: اچھا تو کل سہی۔ میں واقعی اپنی حالت سے بہت پریشان ہو گیا ہوں، ورنہ اتنی جلدی نہ کرتا۔ آپ اگر ہو سکے تو شاہ صاحب سے مل لیجیے اور جس وقت وہ فرمائیں میرے ساتھ چلے چلیے۔

مختار علی: میں پہلے سے وقت مقرر کر سکتا ہوں، مگر میرے خیال میں آپ بغیر اطلاع کے تشریف لے چلیں تو بہتر ہوگا۔ تبھی آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ شاہ صاحب کیسے صاحب کرامت ہیں۔

شیخ نجم الدین: بہت اچھا، تو یونہی سہی۔ کل دس بجے چلیں گے۔

مختار علی: جب حضور مناسب سمجھیں۔ اور کوئی کام میرے لائق ہو تو فرما دیجیے۔

شیخ نجم الدین: آپ کی عنایت ہے۔

مختار علی: تو اب اجازت چاہتا ہوں، کل انشاء اللہ وقت پر حاضر ہو جاؤں گا۔ (جھک کر) آداب بجالاتا ہوں۔

شیخ نجم الدین: آداب عرض۔

(مختار علی چلا جاتا ہے۔ شیخ صاحب ہاتھ پر سر رکھ کر سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ شکر اللہ اچانک داخل ہوتا ہے تو وہ ڈر جاتے ہیں اور چلا اٹھتے ہیں۔ خوف سے ان کی صورت بہت بھیانک ہو جاتی ہے، آنکھیں باہر کو نکل آتی ہیں، منہ کھل جاتا ہے، اور وہ تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ شکر اللہ کو پہچان لیتے ہیں تو کسی قدر سکون ہو جاتا ہے اور رومال سے منہ پونچھتے ہیں۔ شکر اللہ بھی ان کی حالت دیکھ کر کچھ گھبرا جاتا ہے اور تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا رہتا ہے۔)

شکر اللہ: ماموں جان، آپ نے بتایا نہیں کہ خط کب دیں گے۔

شیخ نجم الدین: (غصے میں) دور ہو یہاں سے، نہیں دیتا خط وط! یہ لڑکا تو میری جان کھائے جاتا ہے۔

(شیخ نجم الدین اٹھ کر اندر چلے جاتے ہیں۔ شکراللہ کچھ دیر چپ کھڑا رہتا ہے۔ رکن الدین باہر کی طرف سے آ کر اس کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔)

(خاموشی)

شکراللہ: کیوں جی، یہ ماموں کو کیا ہو گیا ہے، آپ ہی آپ بگڑ جاتے ہیں۔

رکن الدین: اجی وہ ایسے ہی ہیں۔ مجھے ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔

(خاموشی)

(تھوڑی دیر بعد دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ رکن الدین جیب سے دیا سلائی نکال کر جلاتا ہے، اور اسے بڑے غور سے تکتا رہتا ہے۔)

رکن الدین: اچھا یہ تو بتایئے کہ دیا سلائی کہاں کی سب سے اچھی ہوتی ہے، ہندوستان کی یا جاپان کی یا سویڈن کی یا..... کیا نام ہے جی اس جگہ کا؟

شکراللہ: کون سی جگہ؟

رکن الدین: اجی وہی۔ (ٹوپی اتار کر سر کھجاتا ہے)

شکراللہ: مجھے نہیں معلوم۔ آخر آپ کو دیا سلائیوں سے کیا دلچسپی ہے؟

رکن الدین: کچھ نہیں، میں نے ایسے ہی پوچھا تھا۔

(رکن الدین پھر ایک دیا سلائی جلاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ پوری دیا سلائی ہاتھ میں لیے ہوئے جلا دے۔ اسی کوشش میں اس کی انگلی جل جاتی ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اسے جھٹکنے لگتا ہے۔ شکراللہ بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔)

(پردہ)

تیسرا منظر

(درگاہ کا صحن۔ داخلے کا دروازہ دائیں کو ہے۔ سامنے مزار ہے، اور اس کے اور بائیں طرف کی دیوار کے بیچ میں ایک راستہ ہے۔ مزار ایک نیچی چوکور عمارت ہے، جس کے اوپر ایک گنبد ہے۔ عمارت کے چار دروازے ہیں، سامنے والے سے اندر قبر دکھائی دیتی ہے۔ اس پر ایک سرخ چادر پڑی ہے۔ داخلے کے دروازے اور مزار کے درمیاں ایک فقیر گیروے کپڑے پہنے دست بدعا بیٹھا ہے۔ پچھلی طرف کی بائیں اور دائیں دیوار سے ملے ہوئے بہت سے مرد اور عورتیں ہاتھ پھیلائے صدائیں لگا رہی ہیں۔ مزار کے اندر بھی کچھ لوگ عبائیں پہنے اور ہاتھ میں تسبیح لیے دکھائی دیتے ہیں۔)

ایک فقیر: نہ ملا، نہ ملا، ہائے وہ مرد مسلمان نہ ملا۔ بچوں کا پیارا، جوانوں کا دوست، بڈھوں کا سہارا، نہ ملا، نہ ملا، غریب کا داتا، دکھی کا مددگار، بھوکے کو کھلانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کہاں ہے وہ سخی، وہ خدا رسول کا پیارا، اندھے محتاج پر رحم کھانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کوئی مرد مسلماں نہ ملا۔

(شیخ نجم الدین، مختار علی، شکر اللہ اور رکن الدین داخل ہوتے ہیں۔
مختار علی 'آپ یہیں تشریف رکھیے۔' کہہ کر مزار کے بائیں طرف جو راستہ
ہے اس سے چلا جاتا ہے۔ شیخ نجم الدین، شکر اللہ اور رکن الدین کھڑے
رہ جاتے ہیں۔)

فقیر: نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے وہ مرد مسلمان نہ ملا۔ بچوں کا پیارا، جوانوں کا دوست، بڈھوں کا سہارا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، غریب کا داتا، دکھی کا مددگار، بھوکے کو کھلانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کہاں ہے وہ سخی، وہ خدا رسول کا پیارا، اندھے محتاج پر رحم کھانے والا نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کوئی مرد مسلماں نہ ملا۔

شکر اللہ: ارے بڑے میاں خیر تو ہے، تم تو آسمان ڈھائے دیتے ہو۔

فقیر: اجی غصہ کاہے کو کرتے ہو۔ کچھ دینا ہو تو دے دو، حاجت مند نہ ہوتا تو بھیک کیوں مانگتا۔

شکر اللہ: کچھ مل جائے تو پھر تو نہیں چلاؤ گے۔

فقیر: اتنا مل جائے کہ عمر بھر کھا سکوں تو پھر نہیں چلاؤں گا۔

شکر اللہ: اتنا تو ہم دینے سے رہے۔

فقیر: واہ جی واہ، ٹکا پاس نہیں، مزاج لاٹ صاحب کا۔

(اس عرصہ میں چار مجاوروں نے مزار کے اندر سے نکل کر شیخ نجم الدین
کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔)

پہلا مجاور: حضور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

دوسرا مجاور: اماں جانتے نہیں ہو یہ شیخ نجم الدین صاحب ہیں جو ابھی حال میں یہاں تشریف لائے ہیں۔ چھاؤنی کی سڑک پر آپ کی عالیشان کوٹھی ہے۔

فقیر: ہائے، نہ ملا۔

پہلا مجاور: بھائی تم تو جانتے ہو میں درگاہ کے باہر کبھی جاتا نہیں، منت مانی ہے۔ پھر تم کیوں ایسے بے تکے پن سے ٹوکتے ہو۔ کچھ تمھارا ہی حق تھوڑی ہے۔

دوسرا مجاور: میں نے ٹوکا تو تھا نہیں، تمھیں بات بتائی تھی۔ تم خود جانتے ہو کہ بڑے آدمیوں سے

پریشان رہتا ہے۔ میرے پاس بہت سے لوگ آتے ہیں جو آپ ہی کی سی زندگی بسر کر چکے ہوتے ہیں اور انھیں شکایتیں بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ میں اس کیفیت کو آدمی کی صورت دیکھتے ہی پہچان لیتا ہوں۔

شیخ نجم الدین: آپ کی مردم شناسی اور بصیرت کی تو ہر شخص تعریف کرتا ہے۔

فقیر: نہ ملا، ہائے نہ ملا۔

شاہ نور محمد: مجھے کسی کی تعریف درکار نہیں، میں تو اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔ اچھا فرمایئے آپ فاتحہ تو پڑھ چکے ہیں نا؟

شیخ نجم الدین: (ادھر ادھر دیکھ کر) جی ہاں۔

شاہ نور محمد: (شیخ صاحب کو ذرا گھور کر) میرے خیال میں آپ ایک مرتبہ اور پڑھ لیں تو کچھ ہرج نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کے مشورے، دواؤں اور تبرکات میں جو تاثیر ہے وہ درگاہ کی برکت سے ہوتی ہے۔ آپ یہاں حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کے مہمان ہیں، انھیں کی دعا سے آپ کو شفا کی امید رکھنا چاہیے۔

(شیخ نجم الدین کچھ شرمندہ ہو کر مزار کی طرف جاتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے لگتے ہیں۔)

فقیر: نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے وہ مرد مسلمان نہ ملا۔ بچوں کا پیارا، جوانوں کا دوست، بڈھوں کا سہارا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، غریب کا داتا، دکھی کا مددگار، بھوکے کو کھلانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کہاں ہے وہ سخی، وہ خدا رسول کا پیارا، اندھے محتاج پر رحم کھانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کوئی مرد مسلماں نہ ملا۔

(مختار علی، رکن الدین اور شکر اللہ کو بلا کر شاہ صاحب سے ان کا تعارف کراتا ہے)

مختار علی: آپ کا اسم شریف رکن الدین ہے اور شیخ صاحب کے فرزند ہیں۔ آپ کا اسم شریف شکر اللہ ہے۔ آپ بھانجے ہیں۔

شاہ نور محمد: بہت خوب، آپ کا شغل کیا رہتا ہے؟

شکراللہ: آپ کو دیا سلائیاں جلانے کا شوق ہے، مجھے آوارہ گردی اور بحث مباحثے کا۔

شاہ نور محمد: (مسکرا کر) بہت خوب۔ افسوس ہے مجھے بحث کرنے کا شوق نہیں، لیکن آپ کے خیالات معلوم کرنے کا اشتیاق ضرور ہے۔

شکراللہ: وہ تو میری صورت دیکھتے ہی آپ کو معلوم ہو گئے ہوں گے۔

شاہ نور محمد: جی ہاں، کچھ نہ کچھ پتا تو چل ہی گیا۔ مگر میں نے عرض کر دیا ہے کہ مجھے بحث کرنے کا شوق نہیں۔

شکراللہ: میں بھی ایسا خبطی نہیں ہوں کہ ہر ایک سے خواہ مخواہ الجھ جاؤں۔

(شکراللہ منہ پھیر کر بڑی لاپروائی سے صحن میں ٹہلنے لگتا ہے۔ رکن الدین بھی شاہ صاحب سے کچھ الگ ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شیخ نجم الدین فاتحہ پڑھ کر واپس آتے ہیں۔)

فقیر: نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے وہ مرد مسلمان نہ ملا۔ بچوں کا پیارا، جوانوں کا دوست، بڈھوں کا سہارا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، غریب کا داتا، دکھی کا مددگار، بھوکے کو کھلانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کہاں ہے وہ سخی، وہ خدا رسول کا پیارا، اندھے محتاج پر رحم کھانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کوئی مرد مسلماں نہ ملا۔

شاہ نور محمد: (شیخ نجم الدین کو غور سے دیکھ کر) واہ شیخ صاحب، آپ فاتحہ کیا پڑھنے گئے تھے آپ کی تو کایا پلٹ ہو گئی۔ میں نے تو پہلی نظر میں آپ کو اچھی طرح پہچانا نہیں۔

(شیخ نجم الدین یہ سن کر بہت خوش اور متحیر ہوتے ہیں)

شاہ نور محمد: لوگ پہلے پہلے اسے ماننے میں تامل کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس درگاہ میں آنے سے فوراً ہر شخص کی صورت اور سیرت پر ایک حیرت انگیز اثر پڑتا ہے۔ کوئی چار پانچ برس ہوئے ایک مجرم جس کی پولیس والے تلاش میں تھے۔ یہاں رات کو چھپ کر آیا اور کئی گھنٹے ہاتھ باندھے مزار مبارک کے پاس کھڑا رہا۔ دوسرے دن پولیس والے اس کی کھوج میں یہاں پہنچے مگر اس مجرم کی صورت میں کچھ ایسی تبدیلی ہو گئی تھی کہ وہ اسے پہچان ہی نہ سکے، اگر وہ ان سے کہتا بھی کہ میں ہی مجرم ہوں جس کی تلاش میں تم آئے ہو وہ سمجھتے کہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔ آخر میں وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔ مجرم حیران کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

پوچھا جائے کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے تشریف لائے ہیں، تو وہ برا مانتے ہیں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے کہ انھیں دیکھتے ہی پہچان لیں۔

فقیر: ہائے، نہ ملا۔

تیسرا مجاور: خیر جھگڑنے کی کیا بات ہے۔ شیخ صاحب تو بڑے سخی مشہور ہیں ایک ہی کو دے کر تھوڑی ہی رہ جائیں گے۔

چوتھا مجاور: جی ہاں، حضور، ہم تو سب ہی آپ کے خادم ہیں۔ آپ کو دعا دیتے رہیں گے۔

(شیخ نجم الدین روپے نکال کر سب کو تقسیم کرتے ہیں۔ مجاوران سب کو دعائیں دیتے ہیں، مگر گھیرے کھڑے رہتے ہیں۔)

پہلا مجاور: حضور کچھ تبرکات تو نہیں چاہیے؟ (جیب سے دو تین پڑیاں نکال کر) یہ حضور ایک بہت مشہور سرمہ ہے۔ حضرت شیخ کو کہیں سے اس کا نسخہ مل گیا تھا، اور اسی کے مطابق تیار ہوتا ہے۔ حضرت کی وصیت ہے کہ یہ سرمہ کبھی بیچا نہ جائے، اس کی قیمت کچھ بھی نہیں ہے، لیکن لوگ حسب حیثیت کچھ نہ کچھ دے دیتے ہیں۔ اور وہ غریبوں اور محتاجوں کو کھلانے میں صرف ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو اس سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی۔

فقیر: نہ ملا، ہائے نہ ملا۔

دوسرا مجاور: (جیب سے ایک پڑیا نکالتا ہے۔) اور حضور یہ تمام اعضائے رئیسہ کی بیماریوں کے لیے ایک اکسیر ہے، اسے بھی......

پہلا مجاور: (دوسرے کو دھکا دے کر) اماں ذرا ٹھہرو۔ شیخ صاحب کو حیران نہ کرو۔ مجھے بات کہہ لینے دو، پھر تم جو جی چاہے بیچنا۔ تو پھر فرمائیے حضور، ایک پڑیا آپ کو دوں؟

(شیخ نجم الدین اس کے ہاتھ میں کچھ دے کر ایک پڑیا لے لیتے ہیں۔)

فقیر: نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے وہ مرد مسلماں نہ ملا۔ بچوں کا پیارا، جوانوں کا دوست، بڈھوں کا سہارا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، غریب کا داتا، دکھی کا مددگار، بھوکے کو کھلانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کہاں ہے وہ سخی وہ خدا رسول کا پیارا، اندھے محتاج پر رحم کھانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کوئی مرد مسلماں نہ ملا۔

دوسرا مجاور: حضور یہ اکسیر بالکل لاجواب ہے۔ درگاہ میں جو آتا ہے اسے ضرور لے جاتا ہے، بس ایک چٹکی بھر صبح کو دودھ کے ساتھ کھالیجیے۔ بال جڑ سے سیاہ ہو جائیں گے، جوان آدمی آپ پر رشک کریں گے۔ حضور ایک ہفتہ استعمال کر کے دیکھیں۔

(شیخ نجم الدین دوسرے مجاور کے ہاتھ میں کچھ رکھ کر پڑیا اس سے لے لیتے ہیں۔ پھر رکن الدین کو اشارے سے بلاتے ہیں۔)

شیخ نجم الدین: لو یہ دو پڑیاں رکھ لو۔ ایک سرمہ ہے، دوسری قوت دماغ کی دوا۔ اسے تم کھانا۔

تیسرا مجاور: حضور آپ اجازت دیں تو میں بھی کچھ عرض کروں۔ میں اس درگاہ کا بہت پرانا مجاور ہوں۔ سات پشتوں سے میرا خاندان آپ لوگوں کی عنایت سے یہیں گزر بسر کر رہا ہے۔ اگر حضور فرمائیں تو آپ کے لیے دعائیں مانگا کروں۔ میں مجبور ہوں، اور کوئی پیشہ اختیار نہیں کر سکتا۔

(مختار علی شاہ نور محمد کے ساتھ مزار کی بائیں طرف سے آتا ہے۔ شیخ نجم الدین مجاور کو بھول جاتے ہیں، اور لپک کر شاہ صاحب سے اتنا جھک کر مصافحہ کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے شاہ نور محمد صاحب کے ہاتھ چوم رہے ہیں۔ شکر اللہ اور رکن الدین الگ کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجاور ایک ایک کر کے مزار پر واپس چلے جاتے ہیں۔)

شاہ نور محمد: میں تو عرصہ سے جناب کی تشریف آوری کا منتظر ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں کسی کے در پر جانا ہم فقیروں کی وضع کے خلاف ہے، ورنہ میں خود حاضر ہوتا۔ خیر اب آپ تشریف لے آئے تو ملاقات ہو ہی گئی۔

فقیر: نہ ملا، ہائے نہ ملا۔

شیخ نجم الدین: شاہ صاحب، مجھے بہت ندامت ہے کہ اس سے قبل حاضر نہ ہو سکا۔ اس میں نقصان بھی میرا ہی ہوا۔ آپ تو مجھ جیسے دنیاداروں کی قدر دانی کے محتاج نہیں ہیں۔

شاہ نور محمد: جی ہاں، آپ کی صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو بہت دنوں سے ایک روحانی مشیر کی ضرورت ہے۔ آپ کے اعصاب بہت کمزور معلوم ہوتے ہیں اور آپ کا دل بھی

پریشان رہتا ہے۔ میرے پاس بہت سے لوگ آتے ہیں جو آپ ہی کی سی زندگی بسر کر چکے ہوتے ہیں اور انھیں شکایتیں بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ میں اس کیفیت کو آدمی کی صورت دیکھتے ہی پہچان لیتا ہوں۔

شیخ نجم الدین: آپ کی مردم شناسی اور بصیرت کی تو ہر شخص تعریف کرتا ہے۔

فقیر: نہ ملا، ہائے نہ ملا۔

شاہ نور محمد: مجھے کسی کی تعریف درکار نہیں، میں تو اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔ اچھا فرمایئے آپ فاتحہ تو پڑھ چکے ہیں نا؟

شیخ نجم الدین: (ادھر ادھر دیکھ کر) جی ہاں۔

شاہ نور محمد: (شیخ صاحب کو ذرا گھور کر) میرے خیال میں آپ ایک مرتبہ اور پڑھ لیں تو کچھ ہرج نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کے مشورے، دواؤں اور تبرکات میں جو تاثیر ہے وہ درگاہ کی برکت سے ہوتی ہے۔ آپ یہاں حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کے مہمان ہیں، انھیں کی دعا سے آپ کو شفا کی امید رکھنا چاہیے۔

(شیخ نجم الدین کچھ شرمندہ ہو کر مزار کی طرف جاتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے لگتے ہیں۔)

فقیر: نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے وہ مرد مسلمان نہ ملا۔ بچوں کا پیارا، جوانوں کا دوست، بڈھوں کا سہارا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، غریب کا داتا، دکھی کا مددگار، بھوکے کو کھلانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کہاں ہے وہ سخی، وہ خدا رسول کا پیارا، اندھے محتاج پر رحم کھانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کوئی مرد مسلماں نہ ملا۔

(مختار علی، رکن الدین اور شکر اللہ کو بلا کر شاہ صاحب سے ان کا تعارف کراتا ہے)

مختار علی: آپ کا اسم شریف رکن الدین ہے اور شیخ صاحب کے فرزند ہیں۔ آپ کا اسم شریف شکر اللہ ہے۔ آپ بھانجے ہیں۔

شاہ نور محمد: بہت خوب، آپ کا شغل کیا رہتا ہے؟

شکراللہ: آپ کو دیاسلائیاں جلانے کا شوق ہے، مجھے آوارہ گردی اور بحث مباحثے کا۔
شاہ نور محمد: (مسکرا کر) بہت خوب۔ افسوس ہے مجھے بحث کرنے کا شوق نہیں، لیکن آپ کے خیالات معلوم کرنے کا اشتیاق ضرور ہے۔
شکراللہ: وہ تو میری صورت دیکھتے ہی آپ کو معلوم ہو گئے ہوں گے۔
شاہ نور محمد: جی ہاں، کچھ نہ کچھ پتا تو چل ہی گیا۔ مگر میں نے عرض کر دیا ہے کہ مجھے بحث کرنے کا شوق نہیں۔
شکراللہ: میں بھی ایسا خبطی نہیں ہوں کہ ہر ایک سے خواہ مخواہ الجھ جاؤں۔

(شکراللہ منہ پھیر کر بڑی لاپروائی سے صحن میں ٹہلنے لگتا ہے۔ رکن الدین بھی شاہ صاحب سے کچھ الگ ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شیخ نجم الدین فاتحہ پڑھ کر واپس آتے ہیں۔)

فقیر: نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے وہ مرد مسلماں نہ ملا۔ بچوں کا پیارا، جوانوں کا دوست، بڈھوں کا سہارا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، غریب کا داتا، دکھی کا مددگار، بھوکے کو کھلانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کہاں ہے وہ سخی، وہ خدا رسول کا پیارا، اندھے محتاج پر رحم کھانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کوئی مرد مسلماں نہ ملا۔
شاہ نور محمد: (شیخ نجم الدین کو غور سے دیکھ کر) واہ شیخ صاحب، آپ فاتحہ کیا پڑھنے گئے تھے آپ کی تو کایا پلٹ ہو گئی۔ میں نے تو پہلی نظر میں آپ کو اچھی طرح پہچانا نہیں۔

(شیخ نجم الدین یہ سن کر بہت خوش اور متحیر ہوتے ہیں)

شاہ نور محمد: لوگ پہلے پہلے اسے ماننے میں تامل کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس درگاہ میں آنے سے فوراً ہر شخص کی صورت اور سیرت پر ایک حیرت انگیز اثر پڑتا ہے۔ کوئی چار پانچ برس ہوئے ایک مجرم جس کی پولیس والے تلاش میں تھے۔ یہاں رات کو چھپ کر آیا اور کئی گھنٹے ہاتھ باندھے مزار مبارک کے پاس کھڑا رہا۔ دوسرے دن پولیس والے اس کی کھوج میں یہاں پہنچے مگر اس مجرم کی صورت میں کچھ ایسی تبدیلی ہو گئی تھی کہ وہ اسے پہچان ہی نہ سکے، اگر وہ ان سے کہتا بھی کہ میں ہی مجرم ہوں جس کی تلاش میں تم آئے ہو وہ سمجھتے کہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔ آخر میں وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔ مجرم حیران کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

فقیر: ہائے نہ ملا۔

شیخ نجم الدین: ماشاءاللہ، کچھ عجب نہیں کہ اس درگاہ میں ایسی کرامات ہوں۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ جب سے آیا ہوں طبیعت تر و تازہ ہے اور قلب کو اطمینان سا ہو گیا ہے۔

مختار علی: شاہ صاحب، ابھی تو آپ آئے ہیں۔ ذرا ٹھہریے تو پھر دیکھیے گا کہ اس درگاہ کی ہوا میں کیا کیا تاثیریں ہیں۔ اور جب شاہ صاحب کی دعا شامل حال ہو تو کیا پوچھنا ہے۔

شاہ نور محمد: خیر، ان سب باتوں کو شیخ صاحب سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دیکھ لیں گے کہ ہم جھوٹے دعوے نہیں کرتے۔ شیخ صاحب ہمارے یہاں یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص درگاہ سے روحانی امداد کا طالب ہو، وہ پہلے مجاوروں اور دوسرے محتاجوں کو ایک وقت کھلائے۔ آپ کو غالباً کوئی عذر نہ ہو گا۔

فقیر: نہ ملا، ہائے نہ ملا۔

شیخ نجم الدین: جی نہیں، ہرگز نہیں۔ آپ جو کچھ چاہیں میں گھر جاتے ہی بھجوا دوں۔

شاہ نور محمد: میرے چاہنے کی بات نہیں۔ آپ جو مناسب سمجھیے درگاہ کی نذر کر دیجیے۔ اس کے بعد پھر میں دیکھوں گا کہ آپ کو ان شکایتوں سے نجات دلانے کی کون سی صورت سب سے اچھی ہو گی۔ آپ ہولناک خواب بھی دیکھتے ہیں؟

شیخ نجم الدین: (کانپ کر) جی ہاں، اکثر۔

شاہ نور محمد: آسمانی آفات جیسے طوفان، سیلاب، زلزلے، یا ڈراؤنی صورتیں یا خوفناک درندے یا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کوئی......

شیخ نجم الدین: (پھر کانپ جاتے ہیں اور گلے پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں) جی ہاں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میرا گلا دبائے دے رہا ہے۔ یا کبھی یہ دیکھتا ہوں کہ ایک سیاہ فام آدمی ہاتھ میں رسی لیے چپکے چپکے چلا آ رہا ہے۔ اور میرے گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی دینا چاہتا ہے۔

شاہ نور محمد: جی میں سمجھ گیا۔ آپ پہلے محتاجوں اور مجاوروں کو کھانا کھلایئے اور پھر اس کے بعد تشریف لایئے تو کچھ اور بتاؤں گا۔

شیخ نجم الدین: بہت اچھا۔ مگر شاہ صاحب (شاہ نور محمد کا ہاتھ پکڑ کر) مجھے اس مصیبت سے بہت جلد

نجات دلایئے۔ میں تو دیوانہ ہوا جاتا ہوں۔

شاہ نور محمد: آپ گھبرایئے نہیں۔ انشاء اللہ آپ کو بہت جلد شفا ہو جائے گی۔

شیخ نجم الدین: آپ کی دعا سے یہی امید ہے۔

فقیر: نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے وہ مرد مسلمان نہ ملا۔ بچوں کا پیارا، جوانوں کا دوست، بڈھوں کا سہارا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، غریب کا داتا، دکھی کا مددگار، بھوکے کو کھلانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کہاں سے وہ سخی، وہ خدا رسول کا پیارا، اندھے محتاج پر رحم کھانے والا، نہ ملا، نہ ملا، نہ ملا، ہائے کوئی مرد مسلماں نہ ملا۔

شاہ نور محمد: اب آپ چاہیں تو تشریف لے جائیں۔ اگلی ملاقات پر پھر آپ کو بتاؤں گا کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے۔

شیخ نجم الدین: مگر اس عرصہ میں میرا کام کیسے چلے گا؟

شاہ نور محمد: (شیخ نجم الدین کو گھور کر اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر) میں نے کہہ دیا ہے آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ آپ گھبرایئے نہیں۔ انشاء اللہ آپ کو آج ہی سکون ہو جائے گا۔ اچھا مجھے اجازت دیجیے۔ چند لوگ حجرے میں منتظر بیٹھے ہیں۔

فقیر: نہ ملا، ہائے نہ ملا۔

(شاہ نور محمد جدھر سے آئے تھے اسی طرف واپس چلے جاتے ہیں۔ جب وہ نظر سے غائب ہو جاتے ہیں تو شیخ نجم الدین اور مختار علی بھی دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔)

مختار علی: ملاحظہ فرمایا آپ نے حضور، کیا شان ہے شاہ صاحب کی؟

(دونوں دروازے کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ رکن الدین مڑ کر مزار کی طرف لپکتا ہے اور جیب سے پڑیاں نکال کر ایک مجاور سے کچھ پوچھتا ہے)

شیخ نجم الدین: اماں چلو بھی رکنو، وہاں کیا کر رہے ہو؟

(رکن الدین بھاگتا ہوا واپس آتا ہے)

شیخ نجم الدین: کیوں، وہاں کیا کرنے لگے تھے؟

رکن الدین: صاحب یہ دو پڑیاں ہیں، معلوم نہیں ان میں سے سرمہ کون سا ہے اور دماغ کی دوا کون سی؟ میں نے کہا کہ کہیں بھولے سے سرمہ نہ کھالوں۔

شکراللہ: کوئی پروا نہیں۔ دونوں کا ایک ہی اثر ہوگا۔

شیخ نجم الدین: خیر، تو پوچھ لیا؟

رکن الدین: جی، وہاں کوئی کچھ جواب ہی نہیں دیتا۔

(رکن الدین کبھی پڑیوں کو دیکھتا ہے، کبھی ڈرتے ڈرتے اپنے باپ کو، مختار علی اس سے پڑیاں لے کر مزار کی طرف جاتا ہے۔ رکن الدین کچھ سوچ کر اسے دوڑ کر پکڑ لیتا ہے)

رکن الدین: صاحب ان سے کہیے کہ پڑیوں پر لکھ دیں، نہیں تو میں پھر بھول جاؤں گا۔ مجھے ڈر ہے کہیں سرمہ نہ کھالوں، یا دماغ کی دوا آنکھ میں نہ لگالوں۔ گھر میں بھی جاتے ہی یہ پوچھیں گے کہ بتاؤ سرمہ کون سی پڑیا میں ہے۔ اگر کسی نے سرمہ کھالیا یا دماغ کی دوا آنکھ میں لگالی تو شاید نقصان ہو۔ آپ ان سے لکھوا لیجیے۔

مختار علی: بہت اچھا۔

فقیر: نہ ملا، ہائے نہ ملا۔

شیخ نجم الدین: ارے رکنو، دیکھو اس بیچارے فقیر کو کچھ دے دو۔ بہت دیر سے مانگ رہا ہے۔

(رکن الدین جیب سے دو پیسہ نکال کر فقیر کو دیتا ہے اس کے ہاتھ میں جیسے ہی پیسے گرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے پیسے نہیں انگارے ڈال دیے ہیں۔ وہ، ارے اللہ!، کہہ کر ہاتھ جھٹکتا ہے اور پیسے دور جا گرتے ہیں۔)

شیخ نجم الدین: کیوں جی، لیتے کیوں نہیں؟

فقیر: نا بابا، یہ بڑے پاپی کا مال ہے۔ میں اسے نہیں لیتا، میرے ہاتھ جل جائیں گے۔

شیخ نجم الدین: کیا ایسے بھی پاپی ہوتے ہیں؟

فقیر: ہاں بابا، ایسے پاپی بھی ہوتے ہیں جن کا پاپ اندھا اندھیری رات میں دیکھ سکے۔

(مختار علی واپس آتا ہے)

مختار علی: یہ لیجیے صاحب، لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سرمہ سیاہ ہے، دوسری دوا سرخ۔ اب تو یاد رہے گا۔

(رکن الدین کو پڑیاں دی جاتی ہیں تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور سر ہلا کر انھیں لینے سے انکار کرتا ہے)

شیخ نجم الدین: کیوں جی، اب کیوں نہیں لیتے؟

رکن الدین: نہیں صاحب، میں نہیں لیتا...... بعض دماغ کی دوائیں بھی تو سیاہ رنگ کی ہوتی ہیں۔ مجھے کیا معلوم...... مجھے گھر میں سب بنائیں گے۔

شیخ نجم الدین: توبہ! خدا تمھارے اوپر رحم کرے۔ (مختار علی سے) دیکھیے صاحب، یہ حضرت کیا فرماتے ہیں (فقیر سے) ارے میاں، ذرا بتاؤ تو، یہ پاپی ہوتے کیسے ہیں؟

فقیر: واہ جی، واہ۔ ہم نے تو ایسا بیوپاری دیکھا نہیں جو سودا بھی کرے اور چھپائے بھی۔ تم تو سب سے نرالے ہو۔ خیر جاؤ خدا تمھارا بھلا کرے۔ مگر تمھارا سودا تو ہوگا نہیں۔

شیخ نجم الدین: خیر بھئی، اگر میں سودا بھی کر رہا ہوں تو مجھے بددعا دینے کی کیا ضرورت ہے؟

فقیر: ہے، ہے خدا نہ کرے میں بددعا کیوں دینے لگا۔ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ سودا نہ کرو، میری طرح سے بھیک مانگو۔ خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ، گڑ گڑا کر دعا مانگو، شاید کچھ ہو جائے۔ کسی بندے کے ہاتھ میں روپیہ رکھ کر یہ چاہو گے کہ خدا کو رشوت دے کر خوش کر دیں تو پچھتاؤ گے۔ خدا کے یہاں پہنچ ہو سکتی ہے تو تمھارے رونے کی، تمھاری دعاؤں کی اور نیک اعمال کی۔ کوئی تمھارا وکیل بن کر نہیں جا سکتا۔ کوئی جانے کو کہے بھی تو سمجھو جھوٹا ہے۔ ہائے کیا عدل ہے، کیا انصاف ہے!

شیخ نجم الدین: میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو میں کسی کو وکیل بنانے کی کیوں فکر کرتا؟

فقیر: ہائے وہی حجت، وہی ہٹ۔ میں کہہ رہا ہوں۔ بھیک مانگو، بھیک۔ دنیا پر لات مارو، روپیہ پیسہ اس کی راہ میں دے ڈالو۔ بھیک مانگو اور خدمت کرو۔ دعا کوئی حکیم تھوڑی ہی ہے کہ اجابت ہاتھ باندھے کھڑی رہے۔ تم نے بندوں کا حق مارا ہے، تمھیں بہت بھگتنا ہوگا

اور جتنا مصیبت سے بھاگوگے وہ پیچھا کرے گی۔ ایک دن تم دیکھ لوگے کہ تم کیا ہو، اور تمھارے وکیل، تمھارے دلال کیا ہیں...... اپنا دل ہے اور اپنا خدا ہے۔ اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ سب دھوکا ہے۔

(شیخ نجم الدین: حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔ مختار علی ان کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے جاتا ہے۔)

فقیر: ہائے، وہ بڑا پاپی ہے۔ بڑا پاپی۔

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

پہلا منظر

(شیخ نجم الدین کے مکان کا کمرہ۔ آرائش وہی ہے، جو پہلے ایکٹ، پہلے منظر میں تھا۔ مختار علی ایک کرسی پر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد شیخ نجم الدین اندر سے آتے ہیں۔ وہ اب بالکل پیلے پڑ گئے ہیں اور ان کے ہاتھ پیر کانپتے رہتے ہیں۔ مختار علی انھیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بہت جھک کر سلام کرتا ہے۔)

مختار علی: آداب بجالاتا ہوں۔

(شیخ نجم الدین ہاتھ سے جواب دیتے ہیں، کچھ بولتے نہیں، اور ایک کرسی پر آ کر سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں معلوم ہوتا ہے پتھرا گئی ہیں، نظر ایک جگہ جمی رہتی ہے)

مختار علی: مزاج اقدس!

شیخ نجم الدین: کیا بتاؤں؟ شکایت کرتے کرتے تھک گیا، علاج کرتے کرتے بھی عاجز آ گیا ہوں۔

مختار علی: جی ہاں، آپ پریشان ہوں تو کیا تعجب کی بات ہے، مولوی عبداللہ صاحب نے آپ کے ساتھ واقعی بڑی زیادتی کی۔ ان کی اپنی حیثیت دیکھتے ہوئے ہرگز اس کی جرات نہ کرنا چاہیے تھی کہ آپ کے یہاں پیغام بھیجوائیں اور پھر اس حالت میں جب وہ آپ کا علاج کر رہے تھے۔ شہر میں کون نہیں جانتا کہ ان کی ذات کیا ہے؟ آپ جیسے معزز حضرات کی صحبت میں بیٹھ کر وہ خدا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگے ہیں۔

شیخ نجم الدین: جی ہاں، دیکھیے۔ کوئی دو ہزار کے قریب مختلف چندوں کے نام سے مانگ لے گئے، اور جگہ جگہ کہتے پھرے کہ میں شیخ نجم الدین صاحب کا داماد ہونے والا ہوں۔ اگر اسی کا شوق تھا تو مجھ سے گفتگو کرتے، پیغام بھیجتے، مجھے منظور نہ ہوتا تب بھی میں برا نہ مانتا۔ اور پھر یہ فضیحت نہ ہوتی جواب ہو رہی ہے۔ سارے شہر میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے پہلے وعدہ کیا پھر مکر گیا اور جب مولوی صاحب قسمیں کھاتے پھرتے ہیں کہ میں نے بدعہدی کی اور انھیں خواہ مخواہ ذلیل کیا تو میری بات کون مانے گا؟ میری پریشانیاں پہلے ہی کیا کم تھیں۔ اب تو گھر سے نکلتے شرم آتی ہے۔

مختار علی: حضور، یہ ایسی بات نہیں ہے جس سے آپ بہت زیادہ پریشان ہوں۔ کہاں آپ اور کہاں مولوی عبداللہ! بھلا یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے مقابلے میں ان کی بات مانی جائے۔ انھوں نے بے شک زیادتی کی، چوں کہ آپ کو ان سے اعتقاد تھا اس لیے آپ کو اور بھی صدمہ ہوا مگر ان کے کمینے پن سے بھلا آپ کی عزت آبرو میں فرق آ سکتا ہے؟

شیخ نجم الدین: دنیا کا قاعدہ تو یہی ہے۔ کسی کی نسبت بری بات کہیے تو سب فوراً مان لیتے ہیں اور اچھی بات کہیے تو کوئی سنتا بھی نہیں۔

مختار علی: خیر، آپ اس کی فکر نہ کیجیے۔ مولوی صاحب کی بہت جلد قلعی کھل جائے گی۔

شیخ نجم الدین: میری یہ خواہش نہیں ہے کہ مولوی صاحب کسی طرح بدنام ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر ہمارے رہنماؤں کا یہ حال ہے تو ہمارے دین وایمان کا کیا انجام ہوگا، اور جو لوگ بھولے بھٹکے ہیں انھیں راہ راست پر کون لائے گا۔ مجھے ہر طرح کی بے ادبی پر غصہ آتا ہے، اور کچھ دن ہوئے میرے بھانجے نے مولوی صاحب کے سامنے ایک بے تکی

بحث چھیڑی تو میں نے اسے بہت ڈانٹا۔ مگر مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ مولوی صاحب اصل میں ایسے ہیں۔

مختار علی: کچھ نہ پوچھیے حضور، دنیا کا حال ہے۔ قدم قدم پر خوشامد کرنا، رشوت دینا پڑتا ہے، جہاں دیکھیے دیانت داری اور انصاف کا خون کیا جاتا ہے۔ کمشنر صاحب کے پاس کوئی جانا چاہے تو چپراسی بغیر انعام لیے اندر گھسنے نہیں دیتا۔ عدالت میں چارہ جوئی کرنے جایئے تو منشی اور چپراسی کو خوش کیجیے، ورنہ سوائے بازاری کتوں کے فریاد سننے والا کوئی نہیں ملتا۔ آپ کو خدا نے حیثیت دی اور ججی کے مرتبے پر پہنچایا، آپ کو کیا خبر ہوگی کہ آپ کے سامنے معاملہ پیش ہونے تک بیچارے دادخواہ کو کتنی مصیبتیں اٹھانا پڑیں، جن کی شکایت نہ دیوانی میں کی جا سکتی ہے نہ فوجداری میں۔ لیکن آپ یہ سمجھ لیجیے کہ جیسا دنیا میں ہوتا ہے ویسا ہی لوگ چاہتے ہیں خدا کے یہاں بھی ہو۔ اور جب تک مولوی صاحب یا پیر صاحب خوش نہ ہوں، کسی کی دعا بھی خدا کے پاس نہ پہنچنے پائے۔ صرف چند ایسے دیانت دار رہنما ہیں جو بے غرضی سے شفاعت کرتے ہیں ان کی ہم جتنی قدر کریں وہ کم ہے۔

شیخ نجم الدین: جی ہاں۔

(خاموشی)

مختار علی: حضور کو مولوی عبداللہ نے پریشان کر دیا، ورنہ میں تو یہ دیکھنے آیا تھا کہ شاہ صاحب کی توجہ سے کتنا فائدہ ہوا۔ اب تو شاید پوچھنا ہی بے کار ہے۔

شیخ نجم الدین: جی نہیں، اس سے تو میں انکار نہیں کر سکتا کہ شروع میں بہت فائدہ ہوا۔ طبیعت کو سکون ہو گیا، نیند بھی ٹھیک آنے لگی، مگر اب پھر تقریباً وہی حال ہے جو پہلے تھا۔

مختار علی: شاہ صاحب سے پھر آپ کی ملاقات تو ہوئی تھی؟

شیخ نجم الدین: جی ہاں، میں کئی مرتبہ درگاہ گیا اور دو ایک بار شاہ صاحب سے ملاقات بھی ہوئی۔ مجاور ہر دوسرے دن مختلف بہانوں سے روپے مانگنے آتے ہیں، معلوم نہیں انھیں شاہ صاحب بھیجتے ہیں یا وہ اپنے طور پر آتے ہیں اور ان کے نام سے مانگ لے جاتے ہیں۔

مختار علی: سرکار، یہ تو ناممکن ہے کہ شاہ صاحب نے انھیں بھیجا ہو۔ یہ مجاوروں کی قوم بڑی چلتی ہوئی ہوتی ہے۔ انھوں نے جہاں دیکھا کہ شاہ صاحب سے کسی کو عقیدت ہے بس فوراً اس کے پاس پہنچتے ہیں اور شاہ صاحب کے نام سے روپے وصول کرتے ہیں۔ آپ ان کو ہرگز کچھ نہ دیا کیجیے، اور دیجیے تو پہلے شاہ صاحب سے دریافت کر لیجیے۔ وہ بے چارے خود ان مجاوروں کی وجہ سے شرمندہ رہتے ہیں اور زیادہ تر انھیں کی وجہ سے روپوش ہو جایا کرتے ہیں۔

شیخ نجم الدین: میں نے تو پوچھوایا تھا۔ شاہ صاحب نے یہ جواب دیا کہ دینے والے کو اس سے کوئی مطلب نہ ہونا چاہیے کہ مانگنے والا کیسا آدمی ہے اور کس غرض سے مانگتا ہے۔ زیادہ رقم کی بات نہیں تھی، میں خاموش ہو گیا۔

مختار علی: تو پھر آپ یقین جانیے۔ اس میں شاہ صاحب کی کوئی مصلحت ہوگی۔

شیخ نجم الدین: ممکن ہے ہو، مجھے تو ان سے کوئی عقیدت ہی نہیں۔ مولوی صاحب کی جو غرض تھی وہ معلوم ہو گئی۔ شاہ صاحب کی بھی ایسی ہی کوئی غرض ہوگی۔ مجھے تو ان لوگوں سے وہ بے دین زیادہ نیک اور بے غرض معلوم ہوتے ہیں جو باتیں نہیں بناتے او جو کچھ جی میں آتا ہے، کر ڈالتے ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ گمراہ ہوں، اور جہنم میں جائیں۔ دنیا میں تو وہی معاملے کے صاف ہوتے ہیں۔

مختار علی: شیخ صاحب، گستاخی معاف ہو، میرے خیال میں آپ کی تکلیف کا سبب یہی عقیدے کی کمزوری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ درگاہوں میں جھوٹے مجاور جمع ہو جاتے ہیں، اور اپنے ساتھ وہاں کے نیک اور فرشتہ صفت لوگوں کو بدنام کرتے ہیں؟ شاہ صاحب کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ کبھی کبھی ضرور ہوتا ہے کہ وہ ان شیطانوں کے ذریعے سے اپنے مریدوں اور معتقدوں کو آزماتے ہیں جو آزمایش میں پورا اترے ہے وہ پھر کسی چیز کا محتاج نہیں رہتا اور دنیا میں کوئی مصیبت اس کے پاس نہیں پھٹکتی۔

شیخ نجم الدین: اس آزمائش کے آخر کیا معنی؟ میں ان کے پاس ایک شکایت لے کر گیا تھا۔ اگر وہ اسے رفع کر سکتے تھے اور کرنا چاہتے تھے تو کر دیتے، اگر نہیں کر سکتے تھے تو کہہ دیتے۔

اس کے کیا معنی ہیں کہ وہ روز ایک مجاور کو روپیہ مانگنے کے لیے میرے پاس بھیجیں؟ میں آخر کہاں تک دیتا چلا جاؤں۔

مختار علی: حضور، اجازت ہو تو عرض کروں۔ اس معاملے کی صورت ہی کچھ اور ہے۔ شاہ صاحب کے ایسے جتنے بزرگ ہوتے ہیں وہ سب جانتے ہیں کہ جب تک کسی شخص کو ان سے پختہ عقیدت نہ ہو وہ اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ جتنی عقیدت بڑھے اتنا ہی زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔

شیخ نجم الدین: میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ عقیدت کس کو کہتے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میرے سامنے کوئی شخص بیٹھ کر جھوٹ بولے تو میں اسے جھوٹا نہ سمجھوں؟ اتنا میں کر سکتا ہوں کہ آپ کے یا کسی اور کے خیال سے میں اسے جھوٹا ثابت نہ کروں، لیکن خدا نے مجھے عقل دی ہے، جھوٹ سچ میں امتیاز کرنے کی صلاحیت دی ہے، اسے میں کیا کروں؟

مختار علی: حضور، اب کیا عرض کروں، ہم سب کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لائے۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ خدا نے دنیا اور دنیا کے اندر ہر چیز پیدا کی ہے، یعنی خدا نے سانپ بچھو بھی پیدا کیے ہیں، جن سے ہماری جان ہر وقت خطرے میں رہتی ہے، ہر طرح کی بیماریوں کے جراثیم پیدا کیے ہیں تو کیا ان کی وجہ سے ہم کو خدا کے وجود سے انکار کرنا یا اس کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی فرمانبرداری سے انکار کر دینا چاہیے؟ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص سانپ کو دیکھ کر خدا کے وجود یا نظام کائنات کی روشنی میں شک کرنے لگے اس کا عقیدہ کتنا کمزور ہوگا۔

شیخ نجم الدین: معاف کیجیے، وہ مسئلہ ہی بالکل اور ہے۔ خدا نے جان دی ہے اور جان کی حفاظت کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ اس نے ہمیں آنکھیں بھی دی ہیں کہ سانپ اور کیچوے میں فرق کر سکیں اور ہاتھ پیر دیے ہیں کہ سانپ کو ماریں یا اس سے بچ جائیں۔ اور خدا نے سانپ کو اس کا اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ چاہے تو گلہری بن کر انسان کو دھوکہ دے اور اسے کاٹ کھائے۔

مختار علی: لیکن حضور اس سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ ہزاروں آدمی سانپ کے کاٹنے سے مر جاتے ہیں۔

شیخ نجم الدین: اس میں ان لوگوں کا اپنا قصور ہوتا ہے۔

مختار علی: اور ان کا قصور یہ ہوتا ہے کہ جو غریب مرتے ہیں، ان کے پاس پیر میں پہننے کو جوتا نہیں ہوتا۔ گھر میں جلانے کو دیا نہیں ہوتا۔

شیخ نجم الدین: خیر! مگر اس سے آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

مختار علی: حضور، میرا مدعا یہ ہے کہ جو شخص ایمان لاتا ہے وہ معاہدہ نہیں کرتا۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ جب تک مجھے فائدہ ہوگا میں خدا کو مانوں گا اور جب کوئی صدمہ پہنچے گا تو اس کے وجود سے انکار کردوں گا۔

شیخ نجم الدین: اور اس سے نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

مختار علی: حضور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان ہر وقت خدا کے حضور میں دست بہ دعا رہتا ہے اور خدا کو جو منظور ہو وہ اسے بھی منظور ہوتا ہے۔ آپ کو اگر شاہ صاحب سے عقیدت ہے تو آپ کو ان کی دعا اور ان کے اثر سے شفا کی امید رکھنی چاہیے، اور مجاور آپ کو آ کر ستائیں تو اس کا الزام شاہ صاحب پر نہ لگانا چاہیے۔

شیخ نجم الدین: تو پھر مولوی صاحب یا شاہ صاحب کے پاس جانے سے کیا فائدہ ہوا؟ خدا سے تو میں گھر بیٹھے بھی دعا مانگ سکتا ہوں۔ بزرگوں کے پاس جو لوگ ان کی کرامات کی وجہ سے جاتے ہیں اور اس امید میں کہ جہاں ان کی اپنی دعا بے تاثیر رہی ہے وہاں بزرگوں کو زیادہ کامیابی ہوگی، کیونکہ ان کا بارگاہ الٰہی میں رسوخ ہوتا ہے۔

مختار علی: حضور نے بالکل بجا ارشاد فرمایا۔ لیکن یہ امید اسی وقت پوری ہوتی ہے جب لوگوں کو اپنے مذہبی رہنماؤں کی نسبت یقین ہو کہ ان کا خدا کی بارگاہ میں واقعی بہت بڑا درجہ ہے۔ اگر یقین پختہ نہیں ہے تو بزرگوں کی بزرگی سے انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

شیخ نجم الدین: مگر بزرگوں کو بھی تو کسی نہ کسی طرح اپنی روحانی عظمت کا ثبوت دینا چاہیے۔ نہیں تو ان کے پیرووں میں ان کی بزرگی کا احساس ہی نہ پیدا ہوگا۔ اگر شاہ صاحب نے کوئی کرامات دکھائی ہوتی تو میں سمجھتا کہ ہاں یہ بھی کچھ ہیں۔ لیکن وہ تو بس مجاوروں کو میرے پاس بھیجا کرتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا جب میں پہلی مرتبہ درگاہ میں گیا تھا تو انھوں نے ایک چورکا

قصہ سنایا تھا جس کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ پولیس والوں نے اسے پہچانا نہیں۔ میں کئی مرتبہ دن کو اور رات کو درگاہ میں گیا، ہاتھ باندھے کھڑا رہا، دعائیں مانگیں، منتیں مانیں مگر میری شکایت میں کوئی کمی نہیں ہوئی بس مجاوروں کو آمدنی کا ایک نیا ذریعہ مل گیا۔

مختار علی: لیکن حضور نے تو شاید فرمایا تھا کہ پہلے پہل شاہ صاحب کی توجہ سے بہت سکون ہو گیا تھا۔

شیخ نجم الدین: جی ہاں۔ اس سے تو مجھے انکار نہیں۔

مختار علی: تو پھر میرے خیال میں حضور کو اس پر دوسرے نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے اور یہ فرض کر کے کہ شاہ صاحب کی توجہ میں وہی اثر ہے جو پہلے تھا یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اب کوئی فائدہ کیوں محسوس نہیں ہوتا۔

شیخ نجم الدین: خیر آپ کی یہی منشا ہے تو میں ایک مرتبہ اور آزما کر دیکھوں گا۔

مختار علی: حضور گستاخی معاف ہو، میرا منشا یہ نہیں تھا۔

شیخ نجم الدین: تو پھر کیا تھا؟

مختار علی: میری عرض یہ تھی کہ آپ اپنے دل کو شک اور شبہے سے پاک کر لیجیے۔ صدق دل سے اپنے آپ کو شاہ صاحب کے حوالے کر دیجیے اور ان کے طرز عمل پر نکتہ چینی کرنا چھوڑ دیجیے۔ اگر آپ اتنا بھی کر لیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی حالت کو بہت بہتر پائیں گے۔

شیخ نجم الدین: میرا خیال ہے کہ میں یہی کرتا رہوں؟ شاہ صاحب کے مجاور میرے پاس نہ آنے لگتے تو مجھے کسی طرح کی بدگمانی نہ ہوتی۔ اب پھر دیکھا جائے گا۔

مختار علی: حضور، عقیدہ بڑی چیز ہے۔ (کچھ دیر خاموشی کے بعد) اب حضور بندے کو اجازت دیجیے۔ کل پرسوں انشاءاللہ پھر حاضر ہوں گا۔

(مختار علی بہت جھک کر سلام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے)

(پردہ)

دوسرا منظر

(شیخ نجم الدین کے سونے کا کمرہ۔ پلنگ بائیں جانب پچھلی دیوار کے قریب کونے میں ہے، اور پائینتی بائیں دیوار کی طرف ہے۔ بالکل کونے میں ایک لیمپ رکھا ہوا ہے جس کی بتی بہت نیچی کردی گئی ہے اور روشنی بہت دھیمی ہے۔ کمرے میں اور کچھ سامان نہیں ہے۔

شیخ نجم الدین پلنگ پر لیٹے سو رہے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ کراہتے ہیں یا کروٹ بدلتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے چین ہیں۔ معروف ان کے قریب زمین پر منھ لپیٹے بے خبر سو رہا ہے۔

یکبارگی کمرے کی روشنی اور دھیمی پڑ جاتی ہے اور داہنی طرف ایک سیاہ فام آدمی نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک رسی ہے جس کے سرے پر ایک پھندا پڑا ہوا ہے۔ سیاہ فام آدمی آہستہ آہستہ پلنگ کی طرف بڑھتا ہے۔ سرہانے پہنچ کر وہ رسی کو اٹھاتا ہے۔ شیخ نجم الدین جاگ کر چیخ مارتے ہیں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی گردن پکڑ لیتے ہیں۔ سیاہ فام آدمی اس طرح غائب ہوتا ہے کہ شیخ نجم الدین اسے دیکھ نہیں سکتے، مگر انھیں یقین

ہوجاتا ہے کہ کمرے میں کوئی تھا ضرور۔)

شیخ نجم الدین: (کانپتے ہوئے چلاکر) کون ہے؟ دوڑو، دوڑو! معروف! رکنو! (اور زیادہ دہشت کھاکر) ارے کوئی بولو!

(شیخ نجم الدین اچک کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ وہ تھرتھر کانپ رہے ہیں اوران کے منہ سے آواز مشکل سے نکلتی ہے۔ معروف ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے)

معروف: (آنکھیں ملتے ہوئے) حضور کیا ہوا؟

شیخ نجم الدین: ارے۔ک۔ک۔کیا ہوا۔ک۔ک۔ کے بچے م۔م۔م میں نے تو۔ تو تجھے ہیں۔ ہیں۔ یہاں اس لیے لٹایا تھا کہ ضرورت ہو تو کام آئے اور تجھے کچھ خبر ہی نہیں! ہیں۔ ہیں۔ یہاں ابھی کون تھا؟

معروف: (حیرت سے ادھر ادھر دیکھ کر) کوئی نہیں حضور، یہاں کون آتا؟

(معروف جاکر دائیں، پچھلی اور بائیں دیوار کے دروازوں کو دیکھتا ہے۔ سب بند ہیں۔)

معروف: حضور دروازے تو سب بند ہیں، چٹخنی لگی ہوئی ہے۔

شیخ نجم الدین: (چلاکر) تو پھر یہاں کون آیا تھا؟

(شیخ نجم الدین کے پیر اس طرح کانپ رہے ہیں کہ وہ کھڑے نہیں رہ سکتے اور وہ سر پکڑ کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

(خاموشی)

شیخ نجم الدین: (گلا سہلاتے ہوئے) توبہ! یااللہ توبہ!

معروف: حضور آپ گھبرائیے نہیں، یہاں بھلا کون آسکتا ہے؟

شیخ نجم الدین: چپ بے نامعقول۔ تو تو پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ تجھے کیا خبر۔ یہاں کوئی تھا یا نہیں؟

(معروف کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہتا نہیں۔ بڑی دیر تک خاموشی رہتی ہے۔ شیخ نجم الدین کبھی گلا سہلاتے ہیں، کبھی منہ اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں، کانپتے

رہتے ہیں اور 'توبہ، توبہ' کہتے جاتے ہیں۔ معروف چپ کھڑا رہتا ہے۔)

شیخ نجم الدین: توبہ، توبہ! کئی دنوں کے بعد نیند آئی تھی اور اس کا یہ انجام ہوا! آہ، اب میں آخر کیا کروں؟

(شیخ نجم الدین تھوڑی دیر تک اسی طرح اور بیٹھے رہتے ہیں، پھر ان کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگتی ہیں اور وہ کراہتے ہوئے اور 'توبہ! توبہ!' کہتے ہوئے پلنگ پر لیٹ جاتے ہیں۔ معروف پہلے انھیں دیکھتا رہتا ہے اور جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ سو گئے ہیں تو خود بھی منہ لپیٹ کر پڑ جاتا ہے۔ پھر وہی سیاہ فام آدمی ہاتھ میں رسی لیے دائیں دیوار کے قریب نمودار ہوتا ہے اور دانت نکالے آہستہ آہستہ شیخ نجم الدین کے پلنگ کی طرف بڑھتا ہے۔ سرہانے پہنچ کر وہ جلدی سے شیخ صاحب کی گردن میں پھندا ڈالتا ہے۔ شیخ صاحب جیسے ہی چونک کر اٹھتے ہیں سیاہ فام آدمی پھندے کو جھٹکا دے کر رسی سمیت غائب ہو جاتا ہے۔ شیخ نجم الدین کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ خوف کے مارے آنکھیں نکل پڑتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے وہ کانپتی ہوئی انگلیوں سے ایک پھندے کو کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر کھول نہیں پاتے۔ اسی کوشش میں وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور اچھلنے کودنے لگتے ہیں۔ اتفاق سے ان کی نظر اس پردے پر پڑتی ہے جس سے پچھلی دیوار کا دروازہ ڈھکا ہوا ہے اور پردے کے ہلنے سے خیال ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ وہ چیخ مار کر گر پڑتے ہیں۔)

(پردہ)

تیسرا منظر

(شیخ نجم الدین کا خواب)

(درگاہ۔ اس وقت درگاہ کا صحن بالکل خالی ہے، اور ہر طرف سناٹا پڑا ہے۔ پردہ اٹھنے کے تھوڑی دیر بعد شیخ نجم الدین قدم بڑھائے ہانپتے ہوئے دائیں دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور مزار پر کھڑے ہوکر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مزار کی بائیں جانب لپکتے ہیں، جدھر شاہ نور محمد کے حجرے کا راستہ ہے۔ مختار علی یک بارگی ان کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

مختار علی: آداب، بجالاتا ہوں۔
شیخ نجم الدین: ہائیں۔ آپ یہاں کیسے؟
مختار علی: حضور میں تو یہیں رہتا ہوں۔
شیخ نجم الدین: مگر آپ نے مجھے تو یہ کبھی بتایا نہیں۔

مختار علی: حضور نے کبھی دریافت نہیں فرمایا۔

شیخ نجم الدین: (ذرا پیچھے ہٹ کر) تو کیا آپ بھی یہاں کے مجاور ہیں۔

مختار علی: جی نہیں، میں تو شاہ صاحب کا دلال ہوں۔ میں لوگوں میں عقیدت پیدا کرتا ہوں، وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مجھے بھی بسر اوقات کے لیے تھوڑا بہت مل جاتا ہے۔

شیخ نجم الدین: تو یہ کہیے آپ لوگوں کو دھوکا دیتے پھرتے ہیں، آپ اور آپ کے شاہ صاحب!

مختار علی: (ہاتھ جوڑ کر) حضور، میں نے آج تک ایک بھی دیندار کو دھوکا نہیں دیا، چاہوں بھی تو دھوکا نہیں دے سکتا۔

شیخ نجم الدین: (غصے سے کانپتے ہوئے) جھوٹا، بدمعاش کہیں کا! کہتا ہے میں دھوکا نہیں دیتا۔

مختار علی: (پھر ہاتھ جوڑ کر اور ذرا جھک کر) حضور، میں کسی دیندار کو دھوکا نہیں دیتا، اور جھوٹ بولنا تو میں جانتا ہی نہیں۔

شیخ نجم الدین: اور مجھے تو نے جو یہ سب قصے سنائے، یہ جھوٹ نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

مختار علی: حضور، گستاخی معاف ہو، میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ آپ کی خدمت میں میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا وہ بالکل سچ تھا۔ حضور فرمائیں تو میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں!

شیخ نجم الدین: ارے بس جانے دے! ذرا تو خدا سے ڈر!

(مزار کے اندر سے کسی کے آہستہ سے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ شیخ نجم الدین لپک کر پردہ ہٹاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کھڑے ہیں۔)

شاہ نور محمد: شیخ صاحب، آپ تو لوگوں کو خدا سے خوب ہی ڈراتے ہیں!

(شیخ صاحب شاہ نور محمد کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں اور ایک دو قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔)

شاہ نور محمد: فرمائیے، آپ کو میرے دلال سے کیا شکایت ہے؟

شیخ نجم الدین: شکایت؟...... (مکا دکھا کر) خدا سمجھے تم بدمعاشوں سے!

شاہ نور محمد: جی ہاں، خدا سب کچھ سمجھتا ہے، سب کو سمجھتا ہے، مجھ کو سمجھتا ہے۔ اور آپ کو بھی۔ اسی لیے تو اس نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے۔ فرمائیے کیا شکایت ہے؟ آپ تو مارے ڈر کے

مرے جارہے ہیں۔

شیخ نجم الدین: بدمعاش! لٹیرے! پارسا بن کر سب دھوکا دیتے پھرتے ہیں!

شاہ نور محمد: آپ کو دھوکا کھانا منظور نہیں تھا تو گنہگار کیوں بنے؟

شیخ نجم الدین: (اکڑ کر) تم جیسوں سے تو پھر بھی اچھا ہوں!......

شاہ نور محمد: اسی لیے رات کو دو بجے تمھارے پاس بھاگ کر آیا ہوں کہ مجھے اس سیاہ فام آدمی اور اس کے رسی کے پھندے سے بچاؤ۔ کیوں حضرت؟

شیخ نجم الدین: (کانپ کر اور جلدی سے ادھر ادھر دیکھ کر) ہائے!

شاہ نور محمد: (منہ چڑھا کر) تم جیسوں سے تو پھر بھی اچھا ہوں!

شیخ نجم الدین: (گڑگڑا کر) ارے بھائی، مجھ بیچارے کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ میں تو یوں بھی جان سے بیزار ہوں۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ لے لو اور مجھے چھوڑ دو، خدا کے لیے چھوڑ دو!

شاہ نور محمد: یہ لیجیے، اب اور رنگ بدلا۔ بھلا ہم آپ کے پیچھے پڑے ہیں یا آپ ہمارے؟ آپ ہمیں لوٹنا چاہتے ہیں یا ہم آپ کو، دھوکا ہم دیتے ہیں یا آپ؟

شیخ نجم الدین: شاہ صاحب، میں نے آخر کیا قصور کیا ہے؟ خدا کے لیے میرے حال پر رحم کھائیے۔

شاہ نور محمد: (ہاتھ جوڑ کر) نہیں شیخ صاحب، آپ میرے حال پر رحم کھائیے۔ مجھ میں اتنا صبر نہیں ہے کہ برسوں محنت کر کے آپ کے دل میں یقین پیدا کروں، آپ کے عقیدوں کی لیپ پوت کروں، مجھ میں روحانی قوت کی ایسی افراط نہیں ہے کہ ہر وقت آپ کی تلون مزاجی برداشت کر سکوں اور میں ایسا بدمعاش بھی نہیں ہوں کہ آپ کے جعل فریب کا مقابلہ کروں میری تو بس سیدھے سادے گنہگاروں سے بنتی ہے۔

شیخ نجم الدین: جی نہیں شاہ صاحب، مجھے یقین ہے کہ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں میرے حال پر رحم کیجیے اور میرا قصور معاف کر دیجیے۔

شاہ نور محمد: (انداز اور لہجہ بدل کر) میں کیوں رحم کھاؤں؟ میرا تو اس میں نقصان ہے۔

شیخ نجم الدین: (آبدیدہ ہو کر) شاہ صاحب میرے پاس جو کچھ ہے وہ لے لیجیے، بس میرے حال پر رحم کھائیے۔

شاہ نور محمد: خوب، یہ مفت کا احسان اچھا......آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ تو ل ہی جائے گا، آپ دینا چاہیں یا نہ چاہیں، رشوت کا روپیہ، بے گناہوں کے خون کی قیمت، یہ تو میرا خاص حق ہے۔ اس سے نہ آپ مجھے محروم کر سکتے ہیں، نہ میں دست بردار ہو سکتا ہوں۔ یہ تو ایک قانون ہے، جس پر ہمیشہ سے عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ لوگ رشوت لیتے ہیں، دیانت، انصاف کو ہر خریدار کے ہاتھ بیچتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ خدا، عدالت کے چپراسی، منشی، جج بھی اسی طرح رشوت لے کر ان کے جرموں کو کسی بے گناہ کے سر منڈھ دیں گے۔ کیوں شیخ صاحب، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں؟

شیخ نجم الدین: حضور، میرا قصور معاف کر دیجیے۔ حضور، خدا کے لیے میرے اوپر رحم کیجیے۔

شاہ نور محمد: جی، میرا کام قصور معاف کرنا اور رحم کھانا نہیں ہے۔ میں تو معاملے کی بات کرتا ہوں۔ میں تو عدالت کے چپراسی کی طرح رشوت لوں گا اور جھوٹ سچ بول کر آپ کو راضی رکھوں گا، کہ رشوت ملتی رہے۔ لیکن آپ تو ایسے رشوت دینے والے ہیں کہ رشوت دے کر بھی اعتبار نہیں کرتے۔ آپ سے مختار علی نے لاکھ کہا کہ اعتبار اور عقیدے کے بغیر کام نہیں چلتا، مگر آپ نے ایک نہ سنی۔ آپ نے دل میں بہت دنوں سے مجھے بدمعاش اور دھوکے باز سمجھ رکھا ہے، آج آپ نے زبان سے بھی کہہ دیا، اور پھر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ میرے حال پر رحم کیجیے۔ اب تو بس آپ جائیے اور آپ کا سیہ فام جلاد۔

شیخ نجم الدین: (گلے پر ہاتھ رکھ کر) ہائے! ہائے خدا کے لیے مجھے بچائیے، خدا کے لیے مجھ پر رحم کھائیے۔

شاہ نور محمد: شیخ صاحب، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں بالکل مجبور ہوں۔ میرا کام صرف رشوت لینا ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ رشوت لے کر آپ کو اطمینان دلا دوں کہ مجھے رشوت دیجیے گا تو میں خدا کو خوش کر دوں گا اور آپ کا مقدمہ جب پیش ہوگا تو معمولی سوال جواب کے بعد آپ چھوڑ دیے جائیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے، میں فقط چپراسی ہوں ایک عدالت کا۔ میں نے جج کی صورت نہیں دیکھی، وکیلوں کو پہچانتا نہیں ہوں، قانون کا ایک حرف نہیں جانتا، مجھے بس یہ معلوم ہے کہ اس عدالت

میں کسی بے گناہ کو سزا نہیں مل سکتی، کوئی مجرم چھوٹ نہیں سکتا۔ اس لیے میں جی کھول کر رشوت لیتا ہوں، اور جو شخص جیسی باتیں سننا چاہتا ہے ویسی ہی اس کو سنا دیتا ہوں، لوگ میری باتیں سن کر خوش ہوتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو کچھ ملا وہ حلال کی کمائی ہے۔ مگر آپ کو یقین ہے کہ میں جھوٹا اور دغاباز ہوں، آپ سے رشوت تو میں لے لوں گا، کیوں کہ وہ آپ زبردستی میرے ہاتھ میں دیتے ہیں، لیکن آپ کو اطمینان دلانا یا آپ کا جی بہلانا میرے بس کی بات نہیں۔

شیخ نجم الدین: شاہ صاحب، خدا کے لیے میرا قصور معاف کر دیجیے۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ میں دہشت کے مارے مرا جا رہا ہوں۔ مجھے اپنی زبان پر بالکل قابو نہیں رہا، غصے میں بے ادبی کے الفاظ زبان سے نکل گئے۔ خدا کے لیے میرا قصور معاف کر دیجیے اور مجھے اس عذاب سے نجات دلائیے!

شاہ نور محمد: (بہت بیزار ہو کر) بہت اچھا۔ تو بتائیے میں آپ کے لیے کیا کروں؟

شیخ نجم الدین: مجھے اس عذاب سے چھڑائیے!

شاہ نور محمد: کیا آپ سمجھتے ہیں یہ میرے اختیار کی بات ہے؟

شیخ نجم الدین: خدا گواہ ہے شاہ صاحب، میں دل سے یہی سمجھتا ہوں۔ اور اب ہاتھ جوڑے آپ کے سامنے کھڑا ہوں، آپ ولی اللہ ہیں، آپ کی دعا میں تاثیر ہے۔ میری شفاعت کیجیے، میرے گناہ معاف کرا دیجیے۔

شاہ نور محمد: اور فرض کیجیے میری دعا سے آپ کے گناہ معاف ہو گئے تو پھر خدا قیامت کے روز اس بے وقوف کی شکایت کا کیا جواب دے گا جسے آپ نے رشوت لے کر بھی دھوکا دیا، اس بے گناہ کے خون کا بدلہ کون دے گا جسے آپ نے اپنے افسروں کو خوش کرنے کے لیے پھانسی دلوادی، اس معصوم لڑکی کے زخمی دل پر کون مرہم لگائے گا جسے آپ نے قانون اور انصاف کے محافظ بن کر ایک بدمعاش کے حوالے کر دیا؟ اس وقت آپ اپنے ایمان کی پختگی ثابت کرنے کے لیے خدا کو شہادت میں طلب کر رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں آپ خدا سے جرح کر کے اپنی بریت ثابت کر سکتے ہیں؟

شیخ نجم الدین: شاہ صاحب، میں بڑا گنہگار ہوں، مجھے جو سزا دی جائے وہ کم ہے۔ بس آپ کی شفاعت سے امید رکھتا ہوں کہ میرے گناہ معاف ہو جائیں گے!

شاہ نور محمد: آپ جھوٹ بولتے ہیں! آپ دل میں اپنے آپ کو گنہگار نہیں سمجھتے اور میری ولایت کے بھی قائل نہیں ہیں۔

(شیخ نجم الدین دل پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنا چاہتے ہیں، مگر شاہ نور محمد ہاتھ اٹھا کر انھیں روک دیتے ہیں۔)

شاہ نور محمد: بس زیادہ جھوٹ نہ بولیے۔ آپ جو کچھ میری نسبت کہہ چکے ہیں وہ مجھے خوب یاد ہے۔ بس اب میری گزارش یہ ہے کہ آپ مجھ سے کوئی فرمائش نہ کیجیے۔ مجھے ایک مرتبہ اور جی کھول کر برا بھلا کہہ دیجیے اور پھر اپنے گھر چلے جایئے۔ میں آپ سے اب رشوت نہیں لینا چاہتا، نہ آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہوں۔ مختار علی، بھئی اب ان کا اور میرا معاملہ ختم ہو گیا۔ اب ان کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔

شیخ نجم الدین: (کچھ سوچنے کے بعد) شاہ صاحب، آپ کے لیے تو الگ ہو جانا بہت آسان ہے، مگر آپ الگ ہو جائیں تو مجھے بتا دیجیے کہ میں اور کس کے پاس جاؤں۔

شاہ نور محمد: مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔

شیخ نجم الدین: آپ کو اس سے مطلب کیسے نہیں ہے؟ مجھے آپ نے اپنا مرید بنایا، مجھ سے آپ نے شفاعت کا وعدہ کیا، میری ساری امیدیں آپ سے وابستہ تھیں۔ اب آپ ناراض ہو گئے، مجھ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو میں سمجھ نہیں سکتا۔ اور چاہتے ہیں کہ مجھے ٹھکرا کر الگ کر دیں۔ میں آپ کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتا۔ مگر اس پر بھی تو غور کیجیے کہ میرا کیا انجام ہوگا۔

شاہ نور محمد: آپ کا جو انجام ہوگا وہ مجھے معلوم ہے۔ میری کوشش سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

شیخ نجم الدین: مگر کوشش کرنا تو آپ کا فرض ہے۔

شاہ نور محمد: وہ میں نے ادا کر دیا۔

شیخ نجم الدین: آپ نے ادا کر دیا ہوتا تو میں اس وقت یہاں بھاگا ہوا کیوں آتا؟

شاہ نور محمد: بس اب بحث نہ کیجیے۔ چپکے سے اپنی سزا بھگت لیجیے۔

(شیخ نجم الدین 'ہائے' کر کے گلے پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں اور پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں۔ اتنے میں مختار علی اور شاہ نور محمد دونوں غائب ہو جاتے ہیں۔)

شیخ نجم الدین: (مایوسی سے) ہائے، مجھ غریب کو سب چھوڑ کر بھاگ گئے!

(مزار پر سامنے کی طرف جو پردہ پڑا ہے، اور جسے ہٹانے سے شاہ نور محمد دکھائی دیتے تھے، اس میں سے ایک سیاہ ہاتھ نکلتا ہے۔ شیخ نجم الدین اسے دیکھ کر ایک چیخ مارتے ہیں۔ اور درگاہ سے نکل بھاگتے ہیں۔)

(پردہ)

چوتھا منظر

(شیخ نجم الدین کا خواب)

(ایک چھوٹی سی معمولی مسجد کا صحن۔ سامنے کچھ در ہیں۔ بیچ کے در سے محراب اور ممبر دکھائی دیتا ہے۔ داخلہ کا دروازہ بائیں طرف ہے۔

مولوی عبداللہ سامنے دائیں جانب بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ اب ان کی صورت شاہ نور محمد سے بہت مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ شیخ نجم الدین حیران اور پریشان داخلے کے دروازے سے بھاگتے ہوئے اندر آتے ہیں اور مولوی عبداللہ کو دیکھ کر دم بخود کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

شیخ نجم الدین: ہائیں، آپ یہاں کیسے؟

مولانا عبداللہ: (کھڑے ہو کر) کیوں، کیا مسجد میں خدا نہیں ہوتا؟

شیخ نجم الدین: جی ہاں مجھے معلوم ہے مسجد خدا کا گھر ہے، اسی لیے میں یہاں پناہ لینے آیا ہوں۔ مگر آپ یہاں کیسے پہنچے؟

مولانا عبداللہ: میں یہاں آپ سے پہلے پناہ لینے آیا۔ خدا کا گھر بہت دنوں سے میرا گھر بنا ہوا ہے۔

شیخ نجم الدین: (قبلہ رو ہو کر) یا اللہ، کیا تیرے پاس کوئی بھی ان لوگوں کے جوتے کھائے بغیر نہیں پہنچ سکتا؟

مولانا عبداللہ: (انتہائی اطمینان سے) نہیں۔

شیخ نجم الدین: (بیزار ہو کر) یا اللہ، اب تو مسجد کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ کہاں جاؤں؟ یا اللہ، اب میں تیرے پاس رحم کے لیے التجا کرنے کو کیسے پہنچوں؟ میرے لیے تو کوئی رستہ ہی نہیں رہا۔

مولانا عبداللہ: کیوں، آپ کو کون روکتا ہے؟ مسجد کا دروازہ کھلا تھا، آپ اندر آ گئے ہیں، اب آپ کو سجدہ کرنے سے کون منع کرتا ہے؟

شیخ نجم الدین: آپ اور کون؟

مولانا عبداللہ: ذرا بتلایئے تو کیسے؟

شیخ نجم الدین: ایسے کہ آپ مجھے دھوکا دے چکے ہیں، میری شرافت سے فائدہ اٹھا کر مجھے بدنام اور رسوا کر چکے ہیں اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جہاں آپ ہوں، وہاں خدا نہیں ہو سکتا!

مولانا عبداللہ: یہ تو ایک بالکل انوکھا فلسفہ ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ خدا ہر جگہ ہوتا ہے۔

شیخ نجم الدین: (چلا کر) لیکن ہر جگہ انسان کے دل میں وہ عقیدت نہیں ہوتی جو خدا کے وجود کا احساس پیدا کرتی ہے! تم مولوی ہو، اور تمھیں اتنا نہیں معلوم کہ مسجد اس لیے بنائی جاتی ہے کہ وہ ایک پاک جگہ ہو، جہاں پہنچتے ہی انسان کا دل پاک اور یادِ خدا سے روشن ہو جائے۔ جس مسجد میں تمھارے جیسے جھوٹے، بدمعاش بس جائیں، وہ پھر مسجد نہیں رہتی! بھلا تمھاری صورت دیکھ کر کوئی سچے دل سے عبادت کر سکتا ہے؟

مولانا عبداللہ: تو آپ میری صورت نہ دیکھیے۔ آنکھیں بند کر کے عبادت کیجیے۔

شیخ نجم الدین: (اسی طرح چلا کر) کیا خاک عبادت کروں! خدا جانے کیوں میں اس جال میں پھنسا دیا گیا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ بڑھاپا آ گیا ہے۔ دنیا سے دل ہٹا کر زندگی کے باقی دن عبادت میں صرف کروں، مگر میری کم بختی تھی جو میں مولویوں اور صوفیوں کے کہنے میں آ گیا۔ اب درگاہ جاتا ہوں تو شاہ نور محمد جیسے ذات شریف سے مڈبھیڑ ہوتی ہے،

مسجد آتا ہوں تو آپ کی منحوس صورت پر نظر پڑتی ہے!

مولانا عبداللہ: شاید خدا کی مشیت یہ ہے کہ آپ عبادت میں اپنا وقت نہ ضائع کریں۔آپ یا تو ایسے نیک بندے ہیں کہ خدا آپ سے عبادت کرا کے اپنے اوپر احسان نہیں لینا چاہتا۔ یا ایسے کٹر پاپی کہ آپ کا سجدہ کرنا بھی خدا کو ناگوار ہوتا ہے۔بہر حال اس میں میرا قصور نہیں۔اگر آپ کا میری موجودگی سے کچھ ہرج ہوتا ہے تو میں چلا جاؤں گا۔مگر پھر آپ بالکل اکیلے رہ جائیں گے......(شیخ نجم الدین کو گھور کر) بالکل......اکیلے۔

شیخ نجم الدین: (گلے پر ہاتھ رکھ کر چلا اٹھتے ہیں اور خوف کے مارے کانپنے لگتے ہیں) جی نہیں مولوی صاحب! ٹھہریے، ٹھہریے میرا یہ مطلب نہیں تھا!

مولانا عبداللہ: تو پھر کیا تھا؟

شیخ نجم الدین: (لجاجت سے) مولانا اصل بات یہ ہے کہ میں نے بہت ڈراؤنے خواب دیکھے۔مجھ پر ایسا خوف طاری ہوا کہ میں دیوانوں کی طرح گھر چھوڑ کر نکل بھاگا۔ پہلے میں درگاہ گیا، اس خیال سے کہ شیخ صاحب کے مزار پر بیٹھ کر کچھ دیر وظیفہ پڑھوں اور ان سے دعا کروں کہ میرے دل کی پریشانی دور کردیں۔مگر وہاں پہنچتے ہی وہ بدمعاش مختار علی ملا، اور پھر شاہ صاحب بھی یکبارگی مزار کے اندر سے نکل پڑے۔دونوں نے مجھ سے ایسی باتیں کیں جن سے میری پریشانی اور بڑھ گئی۔اس لیے میں وہاں سے بھاگ کر یہاں پہنچا۔آپ کو میں نے دیکھا تو پہلے پہل آپ میں اور شاہ صاحب میں کچھ ایسی مشابہت، معلوم ہوئی کہ میں سمجھا وہی بیٹھے ہیں۔

مولانا عبداللہ: (اطمینان سے) آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ہم دونوں ایک ہی شخص ہیں۔

شیخ نجم الدین: (گھبرا کر) جی؟

مولانا عبداللہ: میں نے عرض کیا کہ ہم دونوں ایک ہی شخص ہیں۔صرف اس وقت میری ڈاڑھی کچھ لمبی ہو گئی ہے۔کہیے تو اسے چھوٹا کرلوں، پھر آپ کو پہچاننے میں دشواری نہ ہوگی۔

شیخ نجم الدین: (تھر تھر کانپنے لگتے ہیں، اور خوف سے ان کی آنکھیں نکل آتی ہیں۔) جی نہیں مولانا، خدا کے لیے میرے حال پر رحم کیجیے۔

مولانا عبداللہ: اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے؟ کیا آپ کو اب تک معلوم نہیں تھا کہ ہم دونوں ایک ہی شخص ہیں...... جس شخص کا جیسا مذاق ہو ویسی ہی اپنی صورت بنالیتا ہوں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ دیکھنے والے کو اطمینان ہو جائے۔ جو سمجھدار ہوتے ہیں، انھیں بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ خود ہی سمجھ لیتے ہیں...... کہیے، اب تو آپ مطمئن ہو گئے؟

شیخ نجم الدین: (سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں) مطمئن؟......ضرور ضرور!

مولانا عبداللہ: مجھے معلوم ہے آپ کو کسی طرح سے اطمینان نہیں ہو سکتا۔ آپ میں یقین کا مادہ ہی نہیں۔ معلوم نہیں آپ کو اس کا کیسے یقین ہو گیا کہ وہ سیہ فام آدمی واقعی کوئی شخص ہے، محض ایک خیال نہیں؟

شیخ نجم الدین: (چلا کر اچھل پڑتے ہیں اور ادھر ادھر بھاگنے لگتے ہیں) ہائے مولانا، مجھے بچائیے۔

مولانا عبداللہ: بھلا بتایئے میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے بہت معمولی تعلیم پائی ہے، مجھ میں کسی طرح کی قابلیت نہیں۔ میں نے دیکھا کہ مسجد میں لوگوں کا آنا جانا رہتا ہے، اس لیے میں بھی یہاں آکر بیٹھنے لگا۔ لوگوں نے مجھے عبادت کرتے دیکھا تو وہ سمجھے کہ میں کوئی بزرگ ہوں۔ مجھ سے طرح طرح کی فرمائش کی جانے لگیں، کسی نے پانی پھنکوایا، کسی نے تعویذ لکھوایا، اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ انھیں دھوکا کھانے سے خوشی ہوتی ہے اور ان کا ایمان پختہ ہوتا ہے تو میں نے روحانی طبابت کو اپنا پیشہ بنالیا...... آپ پہلے مریض ہیں جسے شفا نہیں ہوئی اور اس میں غالباً آپ ہی کا قصور ہے۔

شیخ نجم الدین: جی ہاں، مریض کا اس سے بڑھ کر اور کیا قصور ہو سکتا ہے کہ وہ دوا کھائے اور اچھا نہ ہو!۔

مولانا عبداللہ: جی اور آپ نے یہ بھی ایک بڑی غلطی کی جو دوا کے بجائے طبیب کی ماہیت معلوم کرنے کی فکر میں پڑ گئے، دوا تو دوا ہے، اسے طبیب کے اخلاق وعادات اور دینی اور دنیوی زندگی سے کوئی مطلب نہیں۔

شیخ نجم الدین: لیکن اناڑی حکیم کے پاس تو کوئی جان بوجھ کر جاتا نہیں، اور اگر علاج شروع کرنے

کے بعد معلوم ہو کہ حکیم اناڑی ہے تو اس کا علاج فوراً چھوڑ دینا چاہیے۔

مولانا عبداللہ: تو پھر آپ میرے پاس کیوں آئے؟

شیخ نجم الدین: میں آپ کے پاس نہیں آیا ہوں، خدا کے گھر میں آیا ہوں۔ آپ کا کچا چٹھا مجھے مدت ہوئی معلوم ہو گیا۔

مولانا عبداللہ: آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میری دعاؤں کی اب ضرورت نہیں رہی۔ وہ سیہ فام آدمی آپ کو بہت جلد خدا کے پاس پہنچا دے گا۔

شیخ نجم الدین: (پہلے ڈر سے کانپتے ہیں اور پھر غصہ آتا ہے) مولانا، آپ کو آخر مجھے ڈرانے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟

مولانا عبداللہ: وہی جو طبیب کو کسی کے بیمار پڑنے سے۔

شیخ نجم الدین: تو گویا آپ چاہتے ہیں کہ میں دیوانوں کی طرح حیران پریشان پھرتا رہوں اور آپ میری تکلیف سے فائدہ اٹھائیں؟

مولانا عبداللہ: جی ہاں۔

شیخ نجم الدین: یعنی آپ عیار اور دغاباز ہوں تو کوئی ہرج نہیں، میں آپ کے اوپر اعتقاد نہ کروں تو بداعتقاد کہلاؤں۔

مولانا عبداللہ: جی ہاں، یہی بات ہے۔ آپ کو خود عیار اور دغاباز کی تلاش ہے، مگر اس پر بھروسہ نہیں کرتے بنتا۔ آپ کو چاہیے کہ آنکھیں بند کر کے میں جو کچھ کہوں وہ مان لیں۔ ویسے آپ کو اختیار ہے صاف صاف بات کرنے کی نوبت آئے تو میرے خیال میں آپ ہی نقصان میں رہیں گے۔

شیخ نجم الدین: اس سے زیادہ میرا اور کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ روپیہ کھویا، آبرو کھوئی، اب الٹا بے وقوف بلکہ مجرم ثابت کیا جا رہا ہوں۔ آپ لوگ دن کو پارسا بن کر میرے یہاں آتے ہیں، مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں رات کو بھیس بدل کر بدمعاش ہو جاتے ہیں اور دن کو مجھ سے جو کچھ کہتے ہیں اسے جھٹلاتے ہیں...... پریشان میں پہلے بھی رہتا تھا، اب آپ لوگوں کی عنایت سے پاگل ہو جاؤں گا۔ اب اور کیا کسر باقی ہے جو میں نقصان

کا خیال کروں؟

مولانا عبداللہ: معاف فرمایئے شیخ صاحب، ابھی تو آپ کی صرف تجہیز کی جا رہی ہے۔ ابھی تک جلاد کا ہاتھ آپ کے قریب بھی نہیں پہنچا ہے۔ جب وہ آپ کو دبوچ لے گا تب ہوگا تماشہ۔ اب تک میری عیاری اور دغابازی آپ دونوں کے درمیان پردے کی طرح حائل تھی۔ آپ نے پردہ نوچ ڈالا ہے، جی بھر کر ایک دوسرے کو دیکھ لیجیے۔

شیخ نجم الدین: ارے مولوی صاحب خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے، خدا کے لیے مجھے اس آفت سے بچایئے۔

مولانا عبداللہ: اب میں کیا کر سکتا ہوں؟

شیخ نجم الدین: (مولانا عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر) خدا کے لیے مولانا، مجھے بچایئے۔ میں واقعی بڑا گنہگار ہوں۔ آپ کے ساتھ میں نے بہت بے ادبی کی ہے مگر خدا کے لیے میرے اوپر رحم کیجیے، میرا قصور معاف کر دیجیے۔

مولانا عبداللہ: کسی کا قصور معاف کرنا میرے اختیار کی بات نہیں ہے۔ میں تو صرف ان لوگوں کو دھوکا دیتا ہوں جو دھوکا کھانا چاہتے ہیں۔ آپ میں دھوکا کھانے کی بھی صلاحیت نہیں ہے تو...... (ہاتھ سے اشارہ کر کے) بس جایئے۔

شیخ نجم الدین: (بہت گڑگڑا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے) مولانا، خدا کے لیے میرے حال پر رحم کیجیے، اب ایسی باتیں نہ کیجیے۔

مولانا عبداللہ: آپ خود آئے، آپ نے خود ہی ایسی باتیں شروع کر دیں، میری آپ کی تو بہت دنوں سے ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔

شیخ نجم الدین: مولانا، میں تو مانتا ہوں کہ میں نے بہت سخت غلطی کی اور مجھے اس پر ندامت بھی بہت ہے۔ مگر اب تو میرے حال پر رحم کیجیے۔ دیکھیے رات کو اس حالت میں بھاگا ہوا آپ کے پاس آیا ہوں! میری عاجزی دیکھیے اور پھر اپنے دل سے پوچھیے کہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے۔

مولانا عبداللہ: حضرت، یہ تو بالکل جھوٹ ہے کہ آپ اپنی غلطی محسوس کرتے ہیں اور اس پر نادم ہیں۔

یہ بھی جھوٹ ہے کہ آپ اس وقت میرے پاس ہیں۔ رہا آپ کے حال پر رحم کرنا، سووہ میرے اختیار کی بات نہیں۔

شیخ نجم الدین: تو میں آخر کس کے پاس جاؤں، کس کو اپنا دکھ سناؤں؟

مولانا عبداللہ: آپ تو اسی ارادے سے مسجد میں آئے تھے کہ خدا کو اپنا دکھ درد سنائیں، لیجیے میں جاتا ہوں، آپ اطمینان سے جو کچھ کہنا چاہیں کہہ دیجیے۔ (طنز سے مسکرا کر) خدا نے غالباً نہ ایسی کہانی کبھی سنی ہوگی، نہ ایسے شخص کی زبانی۔ بسم اللہ، بس اب شروع کیجیے۔

شیخ نجم الدین: مولانا، آپ جانتے ہیں، مجھے اتنی سخت تکلیف ہے کہ میں دیوانہ ہوگیا ہوں۔ میرے اوپر ہنسیے نہیں...... خفا نہ ہوئیے! آپ نے تو فرمایا تھا کہ انشاء اللہ میری تمام شکایتوں کو رفع کردیں گے، مجھے ہر طرح سے اطمینان دلایا تھا۔ اب آپ کا دل یہ کیسے گوارا کرسکتا ہے کہ آپ بے دردی سے میرا ساتھ چھوڑ دیں، اندھیری رات میں مجھے ٹھوکریں کھانے دیں اور میرا ہاتھ نہ پکڑیں۔

مولانا عبداللہ: (ٹھٹھا مار کر ہنستے ہیں) واللہ شیخ صاحب، آپ نے تو مجھ جیسے عیار اور دغا باز کو بھی مات کردیا...... مگر آپ خود ہی غور کیجیے۔ میں آپ کے لیے اب کیا کرسکتا ہوں؟ مجھے جو دو چار دعائیں یاد تھیں وہ میں نے آپ کو بتادیں، جتنا اطمینان دلا سکتا تھا دلا چکا ہوں۔ مجھے کوئی خدا کی طرف سے گنہگاروں کی خطائیں معاف کرنے کا اختیار تو دیا نہیں گیا ہے۔

شیخ نجم الدین: مولانا، مجھے یقین ہے کہ آپ چاہیں تو میری شفاعت کرسکتے ہیں۔

مولانا عبداللہ: اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نہیں کرسکتا۔

شیخ نجم الدین: مولانا، اب اس وقت ایسا بے جا انکسار کرنا تو میرے اوپر ظلم ہے۔

مولانا عبداللہ: حضرت میں جتنا جھوٹ بول سکتا تھا بول چکا ہوں۔ بس اب اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ آپ سے صاف صاف کہے دیتا ہوں، آپ کی مدد کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

شیخ نجم الدین: یہ میں نہیں مان سکتا۔ آپ کی دعا سے جب ہزاروں آدمیوں کو فائدہ ہوتا ہے تو مجھے کیوں نہ ہوگا؟

مولانا عبداللہ: وہ ہزاروں آدمی دوسری قسم کے ہوتے ہیں۔ کسی کا بچہ بیمار ہوتا ہے، کسی کو جنسی امراض ہوتے ہیں، کسی کا جوان لڑکا بری صحبت میں پڑ گیا ہوتا ہے، کسی کی لڑکی کو شوہر نہیں ملتا۔ ایسی حالت میں میری دعا کا اثر ہوتا ہے۔ آپ ایسے لوگوں میں نہیں ہیں۔ آپ صرف خدا کے گنہگار نہیں بندوں کے گنہگار بھی ہیں۔

شیخ نجم الدین: مولانا میں جانتا ہوں کہ میں بڑا گنہگار بندہ ہوں۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خدا کے رحم وکرم کی انتہا نہیں۔ وہ سب کے لیے عام ہے۔

مولانا عبداللہ: آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن مجھے یقین ہو جائے کہ خدا ایک بندے کے مقابلے میں کسی دوسرے کی رعایت کرتا ہے تو میں فوراً پیغمبری کا دعویٰ کر دوں، اور خدا کے پاس اتنی عرضیاں بھجواؤں کہ اسے بہت سے سررشتہ دار رکھنا پڑیں۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ خدا کسی کے ساتھ رعایت کرتا ہی نہیں، نہ کسی پر بقایا ہوتی ہے۔ نہ کسی کا فاضل، سب کا لیکھا جوکھا برابر ہوتا ہے۔

شیخ نجم الدین: تو پھر ہم سے یہ کیوں کہا جاتا ہے......

مولانا عبداللہ: آپ سے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ ایک آپ کے لیے نہیں، تمام بندوں کے لیے ہے۔ خدا کا معاملہ سب سے یکساں ہے، آپ کی خاطر کسی دوسرے پر زیادتی نہیں کی جائے گی۔

شیخ نجم الدین: تو میں یہ کب کہتا ہوں کہ دوسروں پر زیادتی کی جائے؟ میں تو صرف اپنی مصیبت سے نجات چاہتا ہوں۔

مولانا عبداللہ: نجات آپ کو مصیبت جھیلنے کے بعد حاصل ہوگی۔

شیخ نجم الدین: تو پھر آپ کے وجود سے کیا فائدہ، دین وایمان سے کیا فائدہ، مسجدیں بنا کر سر پٹکنے سے کیا فائدہ؟

مولانا عبداللہ: خدا بہتر جانتا ہے۔

شیخ نجم الدین: کچھ نہیں، آپ لوگ سب جھوٹے، دغاباز ہیں، آپ کی پارسائی ایک فریب ہے، آپ کا مذہب ایک ڈھکوسلا ہے۔

مولانا عبداللہ: بہت ممکن ہے آپ صحیح فرماتے ہوں۔

شیخ نجم الدین: صحیح نہیں تو اور کیا؟ آپ لوگ عمر بھر آدمی کو دھوکے میں رکھتے ہیں، اپنے فائدے کے لیے لوگوں کو غلط امیدیں دلاتے ہیں اور جب بھانڈا پھوٹ جاتا ہے تو کھڑے ہو کر فلسفہ بگھارتے ہیں! کچھ نہیں، یہ سب آپ لوگوں کی عیاری مکاری ہے، آپ جھوٹے ہیں، آپ کی مسجد جھوٹ موٹ کی ہے، اسے توڑ کر خاک میں ملا دینا چاہیے!

مولانا عبداللہ: (طنزاً ہاتھ سے مسجد کی طرف اشارہ کر کے) بسم اللہ، مگر حضرت میں جاتا ہوں، کہیں میرے سر پر اینٹ نہ گرے!

(مولانا عبداللہ جلدی سے باہر نکل جاتے ہیں۔ شیخ نجم الدین غصے میں مسجد کے ایک ستون پر مکا مارتے ہیں۔ وہ ایک پردہ کی طرح ہٹ جاتا ہے، اور اس کے پیچھے سے ایک سیاہ فام آدمی ہاتھ میں رسی لیے نمودار ہوتا ہے۔ شیخ نجم الدین چیخ مار کر زمین پر گر پڑتے ہیں اور لوٹنے لگتے ہیں۔ ان کا ایک ہاتھ ہروقت گلے پر رہتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ سیہ فام آدمی ان کو کھڑا دیکھتا رہتا ہے، اور جب وہ تڑپتے تڑپتے ایک مرتبہ بے حس و حرکت ہو کر رہ جاتے ہیں تو وہ پھر ایک کھمبے کی آڑ میں چھپ جاتا ہے۔)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

(شیخ نجم الدین کے بیٹھنے کا کمرہ۔ اب اس میں صرف دو چار پائیاں پڑی ہیں۔ شکر اللہ داہنی طرف سے داخل ہوتا ہے اور ادھر ادھر دیکھتا ہے)

شکر اللہ: ارے بھئی کوئی ہے! معروف! معروف!......خدا کی پناہ ہے۔ اس گھر کا تو ایک مہینے میں رنگ ہی بدل گیا۔ معروف! رکن الدین صاحب ہیں؟

(شکر اللہ بیٹھ جاتا ہے اور دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہے پھر رکن الدین بائیں جانب سے اندر آتا ہے۔)

شکر اللہ: (بیٹھے بیٹھے) آیئے۔ جناب۔ سلام علیکم۔ کہیے کیا حال ہے؟

(رکن الدین سلام کا اس طرح جواب دیتا ہے جیسے منہ پر سے مکھی اڑا رہا ہے۔ بغیر کچھ کہے شکر اللہ کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور مسکرانے لگتا ہے۔)

شکر اللہ: کہیے! گھر میں سب خیریت ہے؟

(رکن الدین مسکرا کر رہ جاتا ہے)

رکن الدین: (شرما کر، مسکراتے ہوئے) آپ کانپور سے کب تشریف لائے؟

شکر اللہ: ابھی سیدھا وہیں سے آرہا ہوں۔ بہت دن سے آنا چاہتا تھا۔ مگر اب تک چھٹی نہیں ملی۔

اچھا یہ تو بتایئے معروف، کیا ہوا؟

رکن الدین: کہیں باہر گیا ہوا ہے، ابھی آتا ہوگا۔ کیوں؟

شکر اللہ: وہ شاید اسی کمرے میں سو رہا تھا جس میں ماموں جان نے آخری رات گزاری۔ میں چاہتا تھا ذرا اس سے پوچھوں کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ عجیب عجیب داستانیں سننے میں آئی ہیں۔

رکن الدین: (ویسے ہی مسکراتے ہوئے) کچھ نہیں، ہوتا کیا۔ ہم لوگ سب سو رہے تھے، صبح کو اٹھے تو دیکھا کہ ابا جان مرے پڑے ہیں۔ انتقال کر گئے۔

شکر اللہ: سنتے ہیں کہ ان کا چہرہ بالکل نیلا ہو گیا تھا...... وہ اپنے ہاتھ سے گلا دبائے ہوئے تھے۔

رکن الدین: جی ہاں معروف یہی کہہ رہا تھا، میں تو ڈر کے مارے پاس گیا نہیں۔

شکر اللہ: مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ نے کسی ڈاکٹر سے نہیں پوچھا؟

رکن الدین: ڈاکٹر بلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، وہ مر چکے تھے۔ انتقال ہو گیا تھا۔

شکر اللہ: نہیں، میرا مطلب ہے آپ نے یہ کسی سے نہیں پوچھا کہ اس طرح خودکشی کرنا ممکن ہے یا نہیں۔ باہر سے کوئی آیا نہیں، معروف معتبر آدمی تھا، آدمی اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹ نہیں سکتا۔ تو آخر موت کا کیا سبب ہو سکتا تھا؟

رکن الدین: کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور، ورنہ وہ مرتے کیوں۔ انتقال کیوں کرتے؟

(شکر اللہ رکن الدین کو حیرت سے تکتا رہتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد معروف باہر کی طرف سے آتا ہے اور شکر اللہ کو خاموشی سے جھک کر سلام کرتا ہے۔ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ معروف آنسو پونچھ کر ٹھنڈی سانس بھرتا ہے۔)

معروف: کیا بتاؤں صاحب، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، دنیا بس عجیب جگہ ہے۔ رات کو میاں کا بستر ٹھیک کیا، انھیں لٹایا۔ صبح اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں......

شکر اللہ: دروازے سب بند تھے نا؟

معروف: جی ہاں حضور، میں تو روز سب بند کر کے سوتا تھا۔ پولیس والے پہلے سمجھے کہ میں نے نمک حرامی کی ہے، پھر جب انھوں نے دیکھا کہ میاں اپنی گردن اتنی زور سے دبائے ہیں

کہ انگلیاں اندر گھس گئی ہیں تو ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور سر ہلا کر رہ گئے۔ میں میاں کو دفن کر کے فوراً شاہ صاحب شاہ کے پاس گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں پہلے سے جانتا تھا کہ ایسا ہی کچھ ہوگا۔ جو خلق خدا پر ظلم کرتا ہے وہ سمجھو اپنا گلا گھونٹتا ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ جب تک میاں کی یاد تمھارے دل میں ہے ان کی قبر پر جا کر دو آنسو ٹپکا دیا کرو۔ ان کی روح کو تمھاری محبت سے بڑی تسکین ہوگی۔ دنیا میں ان کا اور کوئی چاہنے والا نہیں ہے۔

شکر اللہ: مگر بھئی تمھارے شاہ صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ......

معروف: حضور میں نے پوچھا تھا۔ شاہ صاحب مسکرا کر رہ گئے، کچھ بتایا نہیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ یہ بھید کی بات ہے، تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ بس تم یہ یاد رکھو جو بندوں پر ظلم کرتا ہے۔ اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔

شکر اللہ: مگر ماموں جان نے کون سا ایسا ظلم کیا تھا؟

معروف: شاہ صاحب کہتے ہیں بڑے پاپی تھے اور کچھ نہیں بتاتے۔

(خاموشی)

شکر اللہ: (رکن الدین سے) اچھا اب اندر میرا سلام کہہ دیجیے اور پوچھ لیجیے۔ اگر اجازت ہو تو اندر آ جاؤں اور سب سے مل لوں۔

رکن الدین: آپ چلے جائیے، اندر پردہ کرنے والا کون ہے۔

(شکر اللہ اندر چلا جاتا ہے اور اس کے پیچھے معروف۔ تھوڑی دیر بعد رکن الدین جیب سے دیا سلائی کی ڈبیا نکالتا ہے، اور پوری دیا سلائی ہاتھ میں لیے ہوئے جلانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دو دیا سلائیاں بجھ جاتی ہیں، جس پر اسے بہت افسوس ہوتا ہے۔ پھر وہ ایک دیا سلائی پورے جلانے میں کامیاب ہوتا ہے اور فاتحانہ انداز سے ادھر ادھر دیکھتا ہے، بڑے اطمینان سے جیب میں دیا سلائی رکھ کر کھڑا ہوتا ہے، انگڑائی لیتا ہے اور جھومتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔)

(پردہ)

خانہ جنگی

کردار (اشخاص)

شاہ جہاں
داراشکوہ
اورنگ زیب
خلیل اللہ خاں
خان جہاں
ابوطالب
شائستہ خاں
امیرالامراء
اعتماد خاں عبدالقوی
شیخ سرمد
ملا ابوالقاسم
ابراہیم بدخشاں : ملا ابوالقاسم کے شاگرد
لطف اللہ : ملا ابوالقاسم کے شاگرد

حفظ الرحمٰن	:	ملا ابوالقاسم کے شاگرد
سعید الدین	:	ملا ابوالقاسم کے شاگرد
4 نوجوان	:	ملا ابوالقاسم کے شاگرد
نوجوان مولوی	:	اعتماد خاں کے ہمراہ
عبدالرحمٰن	:	حفظ الرحمٰن کا باپ
8 علماء	:	مختلف عمروں کے
دو غلام	:	قریب 30 برس کی عمر کے
6 سپاہی	:	
لڑکا	:	قریب دس سال کا
2 لڑکے	:	14, 15 سال کے
علی قوال	:	
علی قوال کا لڑکا	:	
ایک اجنبی	:	
شہری، فقیر وغیرہ		

زمانہ ومقام

زمانہ: مئی 1658ء۔آخر 1659

پہلا ایکٹ	:	مثمن برج، آگرہ کا قلعہ
دوسرا ایکٹ	:	جامع مسجد کے زینے اور سامنے کا میدان
تیسرا ایکٹ	:	ملا ابوالقاسم کا مدرسہ
چوتھا ایکٹ	:	عدالت
پانچواں ایکٹ	:	ملا ابوالقاسم کا مدرسہ

پہلا ایکٹ

(آگرہ کا قلعہ۔ شاہ جہاں مثمن برج میں بہت سے تکیوں کی ٹیک لگائے پلنگ پر لیٹا ہے۔ بیچ کے در سے تاج محل دکھائی دیتا ہے اور شاہ جہاں اسی کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر افسردگی بہت نمایاں ہے۔ پلنگ کے پیچھے ایک غلام پنکھا جھل رہا ہے۔ شاہ جہاں کے سامنے، اسٹیج کے دائیں طرف، خلیل اللہ خاں کھڑا ہے)

شاہ جہاں: تمھاری فوج روانہ ہوگئی؟

خلیل اللہ خاں: خداوند عالم کے اقبال سے فوج پوری تیاری کے بعد آج صبح روانہ ہوگئی۔

شاہ جہاں: (خلیل اللہ خاں کو غور سے دیکھ کر، حسرت کے ساتھ) ہمارے اقبال سے!...... تمھیں اور کچھ نہیں کہنا ہے؟ کیا تم میں سے ایک ایسا نہیں ہے کہ سلطنت کو خانہ جنگی سے بچانے کی کوئی تدبیر کرے؟...... تم کو ہماری خدمت میں کتنے سال گزرے ہیں؟

خلیل اللہ خاں: (زمین بوسی کرکے) خداوند عالم کو جہاں بانی، خداوند عالم کے ناچیز بندوں کو نمک خواری، ازل سے مقدر تھی۔

شاہ جہاں: (بے چین ہوکر) یہ مطلب کی باتیں ہیں...... میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم نے خدمت کر کے کتنا اعتبار حاصل کیا ہے؟ میں اگر تم سے کہوں......

خلیل اللہ خاں: (زمین بوسی کر کے) غلام کا کام خدمت کا حق ادا کرنا ہے، اس پر اعتبار کرنا نہ کرنا آقا کے اختیار میں ہے۔ خلیل اللہ خاں نے کوتاہی کی تو راجہ چھتر سال کو سرفرازی نصیب ہوگی۔

شاہ جہاں: (خلیل اللہ خاں کی طرف غور سے دیکھ کر) ہاں، مجھے یاد ہے۔ دارا نے تمھاری بہت دل شکنی کی۔ اسے یہ نہ کہنا چاہیے تھا کہ ترکوں نے اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ راجپوتوں کے بل پر لڑے گا۔ مگر تم جانتے ہو کہ دارا دل جوئی بھی کر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے تمھاری وفاداری اور مستعدی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ (خلیل اللہ زمین بوسی کرتا ہے) مگر میں تم سے کچھ اور کہہ رہا تھا۔ کیا اب بھی ممکن ہے کہ سلطنت کے وفادار اور معتبر امرا......

(دارا، کچھ خوش، کچھ پریشان، تیزی کے ساتھ داخل ہوتا ہے، دروازے پر سلام کے لیے جھکتا ہے، پھر قدم بوسی کر کے پلنگ کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور شاہ جہاں کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیتا ہے)

دارا: کیا فرما رہے تھے خداوند عالم؟

خلیل اللہ خاں: خداوند عالم غلام سے دریافت فرما رہے تھے......

دارا: چپ رہو، خلیل اللہ خاں۔ تم کو چاہیے تھا کہ فوج کے ساتھ جاتے۔ یہاں کیوں فضول باتیں بنا رہے ہو۔

(شاہجہاں خلیل اللہ خاں کی طرف دیکھتا ہے، مسکراتا ہے اور آنکھ سے چلے جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ خلیل اللہ خاں زمین بوسی کر کے خاموشی سے چلا جاتا ہے)

شاہ جہاں: میں خلیل اللہ خاں سے پوچھ رہا تھا کہ سلطنت کو خانہ جنگی سے بچانے کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے یا نہیں۔

دارا: (تیور بدل کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ٹہلنے لگتا ہے) خداوند عالم، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اس نمازی کی بغاوت کو خانہ جنگی کیوں کہتے رہتے ہیں۔ خدائے جل شانہ، آپ کو سلامت رکھے، ہم تو آپ کی دولت اور اقتدار کے لیے لڑ رہے ہیں، اور ہمارا جو مخالف ہو وہ کافر نعمت ہے، باغی ہے۔ آپ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ آپ باغیوں سے ہمدردی کریں۔ اب مجھے اس کا موقع دیجیے کہ اس نمازی کے فتنے کو رفع کروں۔

شاہ جہاں: تم صرف اورنگ زیب کے عیبوں کو دیکھتے ہو، مجھے معلوم ہے کہ وہ دنیا کے کاموں میں بہت ہوشیار ہے۔ تم کسی کو یقین دلا سکے ہو کہ وہ باغی ہے؟

دارا: تو پھر اسے بلائیے اور کہیے کہ تخت پر مصلے بچھائے اور مصلحت کی نمازیں پڑھے۔ مجھے بھی اس کے حوالے کر دیجیے۔

شاہ جہاں: میں یہ ہرگز نہیں چاہتا۔ میں نے تو تم کو اپنے پاس تخت پر بٹھایا ہے۔ اپنا وارث بنایا ہے۔ مگر تم میری کوئی بات نہیں مانتے۔ اورنگ زیب نے مصلحت سے مشہور کیا ہے کہ میں گرفتار کر لیا گیا ہوں، تم نے حقیقت میں مجھے بے بس اور مجبور کر دیا ہے۔ میں انصاف کرنا چاہتا ہوں، تم لڑنے پر تلے ہو۔ میں پھر کہتا ہوں، مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اورنگ زیب کے امرا کو معلوم ہوا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں تو وہ سب قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔ ان میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے ورغلانے سے میرے خلاف ہو جائے۔

دارا: خداوند عالم! اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنا حق حاصل کر سکوں۔ مجھے وہی ملے گا جو آپ اس نمازی کی خوشامد کر کے مجھے دلوائیں۔ اسی وجہ سے تو میں اصرار کر رہا ہوں کہ مجھے اورنگ زیب سے طاقت آزمائی کرنے دیجیے۔ اگر میں جیت گیا تو مجھے اور آپ کو بھی یقین ہو جائے گا کہ میں سلطنت کا حق دار ہوں۔ اگر میں ہار گیا تو آپ دیکھ لیں گے کہ وہ سانپ جس کی پرورش آپ نے کی ہے مجھے اور آپ کو کس طرح ڈستا ہے۔ تب آپ افسوس کریں گے کہ آپ نے ایک زہریلے کیڑے کو، جس کا سر کچل دینا چاہیے تھا، نرمی اور مروت کا سزاوار سمجھا۔

شاہ جہاں: (سر پکڑ لیتا ہے) بھائی کو بھائی سے ایسی نفرت!......

دارا: خداوند عالم آپ میرے غصے کو برا سمجھتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ اورنگ زیب بچپن سے میرا دشمن ہے، برابر میرے خلاف سازشیں کرتا رہا ہے اور آپ کی علالت کا بہانہ کر کے مجھے برباد کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ انصاف کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے دکن اورنگ زیب کو، بنگال شجاع کو، گجرات مراد کو دیا تھا۔ انصاف تو یہ تھا کہ وہ اپنے اپنے صوبوں میں رہتے، اور مجھے آپ کی خدمت کرنے کا موقع دیتے۔ اب آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ ان تینوں نے میرے حصے کے ملک پر لشکر کشی کی ہے، مجھ سے میرا حق چھیننا چاہتے ہیں۔ میں آپ کے انصاف پر بھروسا کر کے بیٹھ رہوں تو سب سمجھیں گے کہ مجھ میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں، صرف آپ کے زیر سایہ حکومت کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ نے سلطنت کی جو تقسیم کی تھی وہ برحق ہے، تو پھر اب میرا ساتھ دیجیے، دنیا پر ثابت کیجیے کہ مجھے آپ کی پوری تائید حاصل ہے، اور آپ یہ نہیں چاہتے کہ میری حق تلفی اور بے آبروئی ہو۔

شاہ جہاں: دارا، تم جانتے ہو کہ میں ہر طرح تمھاری مدد کو ہوں۔ مگر میں نے جو کچھ کیا ہے اسے میں کافی نہیں سمجھتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میدان میں جہاں تم تلوار سے فیصلہ کرنا چاہتے ہو، میں جا کر مروت اور وفاداری سے فیصلہ کراؤں۔ میرے نمک خوار میرے خلاف کبھی ہاتھ نہ اٹھائیں گے، اور میں کہوں گا تو وہ سب میری وصیت پر عمل کرنے کا عہد کر لیں گے، خانہ جنگی کو کبھی گوارا نہ کریں گے۔

دارا: خداوندِ عالم، مجھے یقین ہے کہ اورنگ زیب کی ریاکاری آپ کی مروت اور امرا کی وفاداری پر غالب آجائے۔ اس نمازی کے فتنوں کا علاج صرف تلوار کر سکتی ہے۔ اگر آپ کو ذرا بھی خواہش ہے کہ میں آبرو کے ساتھ حکومت کروں تو مجھے تلوار سے اپنا حق حاصل کرنے دیجیے۔ آپ اورنگ زیب کو پوری سلطنت کا حقدار مانتے ہوں تو مجھے حکم دیجیے، میں ابھی جا کر اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ دوں۔ حقدار کو اس کا حق مل جائے گا اور آپ کے وفاداروں کا خون نہ بہے گا۔

شاہ جہاں: (بڑی مایوسی کے لہجے میں) اچھا دارا، جاؤ لڑو، خدا تمھیں کامیاب کرے۔

دارا: خداوند عالم، آپ مایوس ہیں، میرے دل میں امیدیں موجیں مار رہی ہیں۔ آپ کے اقبال

سے میں نے ایسی فوج جمع کی ہے جسے دیکھ کر اورنگ زیب کانپ اٹھے گا۔ آپ نے تمام عمر اس کی حوصلہ افزائی نہ کی ہوتی تو اس وقت وہ دارالسلطنت پر چڑھائی کرنے کی جرأت نہ کرتا، اس نے ایسی گستاخی کی ہے تو میں اسے اس کا مزا چکھاؤں گا۔ میں نے بھی سپہ گری کی تعلیم حاصل کی ہے، آپ کی عنایت سے سپہ سالاری کے مشکل سے مشکل فرائض خوبی کے ساتھ انجام دیے ہیں۔

شاہ جہاں: دارا، اورنگ زیب بڑا ہوشیار، بڑا مستعد ہے۔ تم نے جو زمانہ اہل علم اور اہل فن کی صحبت میں گزارا ہے اس میں وہ سپاہیوں کے ساتھ رہا۔ اہل علم تمھاری قدر کرتے ہیں، سپاہی اس پر جان دیتے ہیں۔ اسے حقیر سمجھو گے تو پچھتاؤ گے۔ اب بھی میری بات مان لو، مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔

دارا: خداوند عالم، آپ جس قدر اپنا مطلب واضح کرتے ہیں میرا ارادہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ میں اورنگ زیب سے لڑوں گا، یہ دکھانے کے لیے لڑوں گا کہ میں حق پر ہوں، یہ دکھانے کے لیے لڑوں گا کہ حق باطل پر غالب آتا ہے، یہ دکھانے کے لیے لڑوں گا کہ جنگ کے فن میں بھی میں اورنگ زیب کا بڑا بھائی ہوں۔

شاہ جہاں: مجھے ڈر ہے......

دارا: آپ کو کس بات کا ڈر ہے، خداوند عالم؟ میری نااہلی کا؟ تو پھر خدا کے لیے مجھے موقع دیجیے کہ آپ کے اس ڈر کو دور کردوں۔

شاہ جہاں: (سوچ کر) مجھے ساتھ لیے چلو۔

دارا: نہیں خداوند عالم، ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس میں میری بڑی بے آبروئی ہوگی۔ میں ایک مرتبہ اورنگ زیب کو میدان جنگ میں شکست دیدوں، پھر آپ جو حکم دیں سر آنکھوں پر۔ اس وقت میں کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ اورنگ زیب نے مشہور کردیا ہے کہ میں بے دین ہوں، ہندو پرست ہوں، مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لائق نہیں ہوں.......... اب آپ کے بیچ میں پڑنے سے کوئی سمجھوتہ ہوگیا تو مجھ پر جو الزام لگے ہیں وہ صحیح ثابت ہوجائیں گے۔ آپ کا نمازی لڑکا تب کہے گا کہ مسلمان

اس کے ساتھ ہیں، مجھے صرف آپ کی محبت اور ہندوؤں کی مدد حاصل ہے۔ اس کے بعد میں کس منھ سے تخت پر بیٹھوں گا اور حکومت کروں گا؟

شاہ جہاں: دارا، تم بڑے نا سمجھ ہو، نہ میری سنتے ہو نہ اپنے امرا کے مشورے پر چلتے ہو۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ خانہ جنگی سے سب ڈرتے ہیں، اس لیے کہ اس میں سب کا نقصان ہوتا ہے۔ اگر تم نے امرا اور عوام کو یقین دلایا کہ تم انھیں مصیبت سے بچانا چاہتے ہو تو سب تمھارا ساتھ دیں گے اور خانہ جنگی کا فتنہ برپا کرنے کا سارا الزام اورنگ زیب پر لگے گا، اس سے سب بدظن ہو جائیں گے کہ اس کے ساتھی ٹوٹ کر تمھاری طرف آ جائیں گے، تمھیں دلوں پر وہ تسلط نصیب ہوگا جو تلوار سے حاصل نہیں ہوتا۔ مگر تم صرف اپنی ضد پوری کرنا چاہتے ہو۔

دارا: خداوند عالم، میں دیکھتا ہوں کہ میں جتنی دیر یہاں ٹھہروں گا، آپ کی نظروں میں گرتا جاؤں گا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔

شاہ جہاں: سلیمان شکوہ کا بھی انتظار نہ کروگے؟

دارا: خداوند عالم، آپ خود ہی سوچیے، جب اورنگ زیب چمبل کے قریب تک آ گیا ہے تو میں کیسے ٹھہر سکتا ہوں؟...... آپ تو صرف مصلحت کی باتیں سوچتے ہیں۔ آپ کے لیے یہ کہہ دینا آسان ہے کہ ابھی ٹھہرو، ابھی اور ٹھہرو۔ میرے دل میں جو آگ جل رہی ہے اس کا آپ کو علم نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا کو مکر، فریب، ریا کاری سے پاک کر دوں، ابھی پاک کر دوں۔ فتنہ برپا کرنے والے کو ایسا رسوا کروں کہ دنیا اس پر لعنت بھیجے۔ میری طبیعت ایسی بے چین ہے کہ اپنے فائدے کی خاطر بھی نہیں ٹھہر سکتا۔

(غلام داخل ہوتا ہے اور تسلیم کر کے کہتا ہے)

غلام: امیر الامرا خان جہاں شائستہ خاں حاضر ہوئے ہیں۔

(شائستہ خاں خاموشی سے داخل ہوتا ہے)

شاہ جہاں: کہو شائستہ خاں۔

شائستہ خاں: اعلیٰ حضرت کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

شاہ جہاں: کبھی سلطنت کی مزاج پرسی بھی کرتے ہو؟

شائستہ خاں: اعلیٰ حضرت کی بصیرت اور مصلحت اندیشی آفتاب کی طرح روشن ہے۔اس روشنی کے ہوتے ہوئے میں اپنا دیا الگ کیوں جلاؤں۔

شاہ جہاں: باتیں نہ بناؤ، میری حالت دیکھ رہے ہو، خانہ جنگی جس حد تک پہنچی ہے تمھیں معلوم ہے، تم دارا اور اورنگ دونوں کے بزرگ ہو۔اب بتاؤ کیا کرنا چاہیے۔

شائستہ خاں: اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں۔

شاہ جہاں: ہاں کہو۔

شائستہ خاں: اس وقت جو صورت حال ہے اس میں اعلیٰ حضرت کے نمک خواروں کی بڑی سخت آزمائش ہوگی اگر ان سے الگ الگ رائے لی گئی۔دراصل ان کا حق ہے کہ اس نازک موقع پر اعلیٰ حضرت ان کی رہنمائی کریں۔

دارا: (طنز سے) میرے ماموں امیر الامرا خان جہاں شائستہ خاں کا منشا یہ ہے کہ دربار میں جو امرا موجود ہیں انھیں ایک جگہ جمع ہو کر یہ کہنے کا موقع دیا جائے کہ وہ اورنگ زیب سے لڑنا نہیں چاہتے۔خداوند عالم انھیں ضرور اس کا موقع دیں اور ایک دفعہ نہیں دس دفعہ۔مجھے معلوم ہے کہ کون میرا ساتھ دینے پر تیار ہے اور کون مشورے کے بہانے سے غداری کرنا چاہتا ہے۔

شاہ جہاں: دارا، اس طرح اپنا کام نہ بگاڑو۔خیر خواہوں اور خادموں کے بغیر کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔

دارا: (غصہ میں) مجھے خیر خواہوں اور خادموں کی ضرورت نہیں ہے۔مجھے خدا نے جو توفیق دی ہے وہ کافی ہے۔

شاہ جہاں: دارا، مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تم میں اتنا تکبر کہاں سے آ گیا۔تمہارے مداح تم کو صوفی بلکہ ولی کہتے ہیں۔تم کو تو نہ چاہیے کہ اپنے خیر خواہوں کی بلاوجہ دل آزاری کرو۔

دارا: خداوند عالم، میں آپ سے بار بار عرض کر چکا ہوں کہ میں منافقت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اورنگ زیب کی ریاکاری اور آپ کے امرا کی منافقت نے مجھے ایسے صدمے پہنچائے

ہیں کہ مجھے اپنی طبیعت اور زبان پر قابو نہیں رہا ہے۔

شاہ جہاں: مگر تمھارا رویہ ایسا تو نہ ہونا چاہیے کہ لوگ اس کے مقابلے میں ریاکاری کو غنیمت سمجھیں۔

دارا: مجھے کسی کی پروا نہیں۔

شاہ جہاں: پھر حکومت کس پر کرو گے؟

شائستہ خاں: اعلیٰ حضرت کسی کو اپنی طبیعت پر بار نہ ہونے دیں......

دارا: جی ہاں، آپ کا کیا جاتا ہے۔

شائستہ خاں: اعلیٰ حضرت کے نمک خوار اشارہ ملنے پر سو جان سے نثار ہونے کو تیار ہیں۔

دارا: خداوند عالم، میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ آپ کے ناز پروردہ امرا میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ جب تک انھیں میری قوت اور جذبہ انتقام کا اندازہ نہ ہوگا یہ میری حکومت کو کیسے گوارا کریں گے۔ اب آپ سے میری آخری التجا ہے کہ مجھے مر مٹنے دیجیے!

(دارا غصہ میں سلام کیے بغیر چلا جاتا ہے۔ شاہ جہاں اور شائستہ خاں کچھ دیر خاموش رہتے ہیں۔ شاہ جہاں تاج محل کی طرف حسرت سے دیکھتا رہتا ہے)

شاہ جہاں: بیٹھ جاؤ ابو طالب، کھڑے کیوں ہو۔

(شائستہ خاں کورنش بجالاتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہتے ہیں)

شاہ جہاں: کیوں ابو طالب، دارا کی عمر کیا ہوگی؟

شائستہ خاں: بیالیس سال کچھ مہینے ہوگی۔

شاہ جہاں: بچپن میں بھی یہ اسی طرح مچلتا تھا اور پھر آکر ایسی محبت سے لپٹ جاتا کہ اس کی کوئی شرارت، کوئی ضد یاد نہ رہتی۔ ارجمند کو اس نے ہمیشہ حیران کیا، مجھے کبھی خاطر میں نہ لایا۔ ہم تینوں ساتھ ہوتے تو بادشاہ یہی بنتا۔ اورنگ زیب کی آنکھیں سب کچھ دیکھتی تھیں، دارا سے ہم جتنی محبت کرتے، اورنگ زیب کا دل سخت ہوتا جاتا۔ اس نے ہمیشہ خود شکایت کی، ہم کو شکایت کا موقع نہ دیا۔ ہم کیا کرتے، محبت نے مجبور کر دیا تھا۔ جہاں

آرا اورنگ زیب کے سیان پن سے جلتی تھی، اور بچپن کی یہ کیفیت اب تک نہیں گئی ہے...... بڑی خوش قسمت تھی ارجمند کہ اپنے پھولوں کو کھلتے ہی دیکھا......

(خاموشی۔ شاہ جہاں تاج کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔)

شاہ جہاں: یہ تاج محل کیا ہے، محبت یا عصمت؟

شائستہ خاں: اعلیٰ حضرت، محبت اور عصمت دونوں ایک نور کی شعائیں ہیں۔ یہ نور آپ کے دل میں تھا، اور آپ نے اسے اپنی ارجمند کے صدقے دنیا کو بخش دیا ہے۔ انصاف بھی اسی میں تھا کہ ایسی لازوال دولت آپ اپنے پاس نہ رکھیں، بلکہ خاص و عام میں لٹا دیں۔

شاہ جہاں: (سوچ کر) انصاف کا نام نہ لو ابو طالب۔

شائستہ خاں: کیوں اعلیٰ حضرت؟ آپ کی ایک عظیم الشان یادگار آپ کا انصاف ہے۔ اسی پر تو آپ نے اپنی سلطنت کی اور اپنے تاج محل کی بنیاد رکھی ہے۔

شاہ جہاں: نہیں، ابو طالب۔ اب تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ انصاف محبت کی عاجزی کا نام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ محبت غالب رہے...... اگر کبھی اس کا موقع ہو تو تم یہ کہنا کہ میری آخری وصیت تھی کہ میرے چاہنے والے انصاف نہ کریں، محبت کریں۔ انصاف صرف خدا کر سکتا ہے، انسان کے لیے محبت سے بالاتر کوئی مقام نہیں......

(خاموشی)

شاہ جہاں: ہاں، میں تم سے پوچھنا بھول گیا، شاہ جہاں آباد میں لوگوں کا کیا خیال ہے؟

شائستہ خاں: کیا بتاؤں اعلیٰ حضرت، ایک بے چینی اور خوف ہے کہ جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کو کسی پر اعتبار نہیں رہا، سب سہمے ہوئے ہیں۔ شہر میں مشہور ہو گیا ہے کہ اورنگ زیب کے جاسوس ہر جگہ موجود ہیں اور ایک ایک بات کی خبر اپنے آقا کو پہنچا دیتے ہیں۔ جو لوگ نڈر ہیں ان میں دو فریق ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ شریعت ہماری زندگی کی اساس ہے، اور جو شریعت کا پابند نہ ہو وہ ملت اسلامی کا دشمن ہے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ ریاکاری سے زیادہ مہلک کوئی عیب نہیں، اور جب تک ملت اس عیب سے پاک نہ کی جائے، شریعت کا نام لینا محض حماقت ہے۔ جو لوگ فتنے فساد کو برا کہتے ہیں وہ شیخ سرمد کی رباعی

پڑھتے ہیں اور کفِ افسوس ملتے ہیں۔

شاہ جہاں: شیخ سرمد؟ ہاں، کیا فرماتے ہیں؟

شائستہ خاں: اعلیٰ حضرت، بہت خوب کہا ہے۔

یاراں چہ قدر راہِ دورنگی دارند　　مصحف بہ بغل، دینِ فرنگی دارند
پیوستہ بہم چو مہرہ ہائے شطرنج　　دردل ہمہ فکر خانہ جنگی دارند

(شاہ جہاں ایک ایک مصرعہ شائستہ خاں کے ساتھ دہراتا ہے)

شائستہ خاں: غور کیجیے، اعلیٰ حضرت، اس میں کیا غم ہے اور کیا غصہ۔ پھر تقدیر کی شکایت بھی کس عنوان سے کی ہے۔ فقیر کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو حقائق کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں

شاہ جہاں: میں یہ سوچ رہا ہوں کہ شطرنج کے یہ مہرے میرے دل کے ٹکڑے ہیں...... دردل ہمہ فکر خانہ جنگی دارند......

(خاموشی۔ شاہ جہاں آنکھیں بند کیے رہتا ہے۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے سخت تکلیف ہے تھوڑی دیر کے بعد اس کا سر ایک طرف کو گر جاتا ہے)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

(جامع مسجد، شاہ جہاں آباد، طلوع کا وقت ہے۔ شیخ سرمد جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے زمین پر ایک عجیب انداز سے پڑے سو رہے ہیں۔ ایک ایک کر کے کوئی دس پندرہ فقیر ان کے پاس جمع ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چار سپاہی آتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک آدمی ہے جو خوان سر پر رکھے ہے، اور چھوٹی سی میز ہاتھ میں لیے ہے۔ آدمی خوان کو میز پر شیخ سرمد کے پاس رکھ دیتا ہے، سپاہی فقیروں کو ہٹا کر انھیں ایک طرف کھڑا کر دیتے ہیں۔ تین سپاہی فقیروں کو دور رکھنے کے لیے ان کے سامنے قطار باندھ لیتے ہیں، چوتھا سپاہی شیخ سرمد کے قدموں پر ہاتھ رکھتا ہے۔)

سپاہی: حضور، غلاموں کا سلام قبول ہو۔ ناشتہ حاضر ہے۔

(شیخ سرمد اٹھتے ہیں، منھ پر ہاتھ ملتے ہیں، سپاہی خوان پر سے خوان پوش ہٹاتا ہے۔ شیخ سرمد خوان پر جو چیزیں رکھی ہیں انھیں کسی قدر تعجب سے دیکھتے ہیں، خوان کو چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور سپاہی کا ہاتھ پکڑ کر اسے

ایک طرف کو لے جاتے ہیں۔ باقی سپاہی خوان میں جو خشک میوے ہیں
انھیں فقیروں میں لٹا دیتے ہیں)

شیخ سرمد: اس خشک میوے کے کیا معنی؟

سپاہی: حضور، آپ کو تو سب معلوم ہے۔

شیخ سرمد: (کسی فکر میں محو ہو جاتے ہیں۔ پھر سپاہی کا ہاتھ چھوڑ کر) جا مجھے معلوم ہو گیا۔ دارا نے شکست کھائی ہے، آگرہ سے بھاگا ہے۔ کیوں، کہاں ہے دارا؟ شاہ جہاں آباد میں؟

سپاہی: حضور، خود بدولت کل شام کو بڑی پریشانی کی حالت میں شاہ جہاں آباد تشریف لائے۔ قلعے میں داخل نہیں ہو سکے۔

شیخ سرمد: (اپنے آپ سے) مگر فقیر کو ناشتہ بھیجنا نہیں بھولے...... خشک میوہ کھلا دیا ہے۔ اب دستر خوان اٹھ جائے گا، نہ میزبان رہے گا...... نہ مہمان۔

(سپاہی چلے جاتے ہیں۔ فقیر رفتہ رفتہ غائب ہو جاتے ہیں۔ شیخ سرمد پریشان ہو کر ٹہلنے لگتے ہیں۔ پھر ایک طرف اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں اور سر گھٹنوں پر رکھ دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دس برس کا لڑکا اس طرف سے داخل ہوتا ہے جدھر شیخ سرمد بیٹھے ہیں، ادھر ادھر نظر سے ان کو تلاش کرتا ہے، انھیں دیکھ لیتا ہے تو ان کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس کپڑے میں لپٹی ہوئی دو روٹیاں ہیں۔ انھیں وہ نکال کر شیخ سرمد کے سامنے پیش کرتا ہے۔)

لڑکا: لیجیے، شاہ صاحب، ناشتہ کر لیجیے۔

(شیخ سرمد سر اٹھا کر لڑکے کی طرف پیار سے دیکھتے ہیں، اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور روٹیاں لے کر ایک نوالہ توڑتے ہیں۔ مگر نوالہ منہ کے پاس لے جا کر رک جاتے ہیں، اور روٹی کو غور سے دیکھتے ہیں۔)

لڑکا: کیا ہوا شاہ صاحب، کیا روٹی میں کچھ ہے؟

شیخ سرمد: نہیں بیٹا، روٹی میں کچھ نہیں، تیرے دل میں کچھ ہے...... یا تیری ماں کے دل میں کچھ ہے۔

لڑکا: اماں کل شام سے رو رہی ہیں۔ ابا کی کچھ خبر نہیں آئی۔ وہ شہزادہ داراشکوہ کی فوج میں تھے۔
اماں نے کہا تھا کہ شاہ صاحب روٹی کھالیں تو ان سے کہنا کہ دعا کیجیے ابا خیریت سے
گھر پہنچ جائیں۔
(شیخ سرمد کانپ سے اٹھتے ہیں اور آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔ پھر لڑکے
کو زور سے لپٹا لیتے ہیں)

شیخ سرمد: بیٹا، جا اپنی ماں سے کہہ دے کہ سرمد نے شرم کے مارے روٹی نہیں کھائی۔

لڑکا: نہیں شاہ صاحب، اماں نے کہا ہے کہ شاہ صاحب کو روٹی ضرور کھلا دینا۔
(شیخ سرمد حیران ہوکر کھڑے ہوجاتے ہیں اور ٹہلنے لگتے ہیں)

لڑکا: پھر لیجیے شاہ صاحب، روٹی کھا لیجیے۔

شیخ سرمد: اچھا بیٹا، مجھے روٹیاں دے دے۔ میں کھالوں گا۔ تو جا اپنی ماں کے پاس، جلدی سے جا۔
(شیخ سرمد لڑکے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اسے باہر نکال دیتے ہیں، پھر انتہائی
پریشانی اور پیچ و تاب میں کبھی چلتے ہیں، کبھی کھڑے ہوجاتے ہیں، پھر
پاؤں پٹک کر چلنے لگتے ہیں)

شیخ سرمد: (آسمان کی طرف دیکھ کر) شرم کر۔ شرم کر...... کیا کہوں، اس عورت کو تو نے پیدا
کیا ہے؟......تو نے؟
(ابراہیم بدخشانی، ایک نوجوان، داخل ہوتا ہے اور ادب سے دست بستہ
کھڑا ہوجاتا ہے، کچھ دیر کے بعد شیخ سرمد کی نظر اس پر پڑتی ہے اور وہ اسے
گھور کر دیکھنے لگتے ہیں!)

شیخ سرمد: جاؤ یہاں سے، میں کچھ نہیں جانتا۔

ابراہیم: اندھے کی دنیا کتنی بڑی ہوسکتی ہے، بہت دور جاتا ہے تب بھی جہاں تھا وہیں رہ جاتا ہے۔

شیخ سرمد: تمھاری دنیا تنگ ہے۔ اس لیے تم چاہتے ہو کہ دیوانے سے اس کا ذرا سا مقام بھی چھین
لو۔ لے جاؤ اسے بھی لے جاؤ، سب پڑھ ڈالو، سب رٹ لو۔ خلقہ، فقدرہ، ثم السبیل
یسرہ، ......ثم السبیل یسرہ۔

(شیخ سرمد ابراہیم بدخشانی کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ان کا بدن کانپ رہا ہے۔)

شیخ سرمد: کیوں، بولتا کیوں نہیں، کیا معنی ہیں اس کے؟.....تو نے کبھی کسی غریب عورت کی روٹی کھائی ہے.....مفت اور برسوں اور روز؟..... بتا اگر اس عورت کا شوہر قتل ہوجائے اور وہ تیرے پاس فریاد لے کر آئے، تو کیا کہے گا؟ ثم السبیل یسرہ؟

ابراہیم: میری سمجھ بہت ناقص ہے۔

شیخ سرمد: پھر کیا تو مجھے حیران کرنے کے لیے آیا ہے؟ جا یہاں سے!

(شیخ سرمد غصہ میں ٹہلنے لگتے ہیں، اور ابراہیم بدخشانی سر جھکائے خاموش کھڑا رہتا ہے)

شیخ سرمد: کیوں، جاتا کیوں نہیں؟

ابراہیم: حضور، میں جا نہیں سکتا، میرے استاد ملا ابوالقاسم نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ دیکھو، اگر شاہ صاحب مطمئن ہوں تو سلام کر کے چلے آنا، اگر مضطرب ہوں تو ان کی خدمت میں حاضر رہنا، جب تک کہ ان کو سکون نہ ہوجائے۔

(شیخ سرمد پر معلوم ہوتا ہے بجلی سی گری ہے۔ وہ کچھ دیر کھڑے جھومتے رہتے ہیں، پھر لڑکھڑا کر دو تین قدم چلتے ہیں اور گر پڑتے ہیں۔ ابراہیم ان کا سر اپنے زانو پر رکھ کر دابنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دو لڑکے داخل ہوتے ہیں)

پہلا لڑکا: ارے دیکھ ہاتھی.....اس ہاتھی پر کون ہے؟

دوسرا لڑکا: ہاتھی پر کوئی بھی ہو، دیکھ سپاہی بھی تو ساتھ ہیں۔ چل بھاگ چل یہاں سے۔

پہلا لڑکا: ارے چلتے ہیں بھائی، ذرا تماشا تو دیکھ لیں۔ دیکھو ہاتھی بیٹھ رہا ہے۔

دوسرا لڑکا: اوہو، یہ وہ ہوگا، شہزادہ داراشکوہ۔ دیکھ، اسی طرف آ رہا ہے۔ بھاگ، بھاگ!

(دونوں لڑکے چلے جاتے ہیں۔ دوسری جانب سے داراشکوہ داخل ہوتا

ہے۔ شیخ سرمد کو دیکھتے ہی ان کی طرف لپک کر آتا ہے اور قدم بوسی کرتا ہے۔ شیخ سرمد آنکھیں کھول کر اسے دیکھتے ہیں اور مسکراتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے چہرے کا رنگ خوشی سے بدل جاتا ہے۔ ابراہیم شہزادے کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

دارا: حضور، میں معافی کا خواستگار ہوں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کو دل بہت دنوں سے چاہتا تھا لیکن دنیا کی الجھنوں میں ایسا پڑ گیا کہ یہ شرف نصیب نہ ہوا۔

شیخ سرمد: (مسکرا کر) ہوں...... یاد ہے بھرتری ہری کی وہ رباعی جس کا ترجمہ ہم دونوں نے مل کر کیا تھا؟ کیا کہتا ہے......

راضی دلِ دیوانہ بہ تقدیر نہ شد — فارغ ز خیال و فکر و تدبیر نہ شد
ایامِ شباب رفت و باقیست ہوس — ما پیر شدیم، آرزو پیر نہ شد

دارا: حضور! اب وہ دن یاد نہ دلایئے۔
(اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیتا ہے اور رونے لگتا ہے)

شیخ سرمد: (دارا کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر)

دیدی کہ غم و عیش جہاں زود گذشت — چیزے کہ در اندیشہ تو بود گذشت
ایں یک دو نفس کہ ماند سرمایہ تو — ہشیار کہ نقصاں نہ کنی سود گذشت

(دارا ہاتھوں سے چہرے کو ڈھکے رہتا ہے۔ خاموشی۔)

دارا: حضور، میری حالت تو اس دیوانے کی سی ہے جسے نصیحت بھی ناگوار ہوتی ہے۔ خیر خواہوں نے سمجھایا، خداوند عالم سمجھاتے سمجھاتے حیران ہو گئے، مگر کسی کی بات میرے دل پر نہ پڑی۔ اب ہلاکت سے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے، اور اسی سے بچنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔ کاش کہ مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ اپنے آپ کو ملک الموت کے حوالے کر دیتا اور اپنے وفاداروں کو مصیبت سے بچا لیتا۔ مگر مجھے تو اب تباہی میں مزا آنے لگا ہے مجھے

سلطنت نہیں ملی ہے.....تو میں چاہتا ہوں کہ میرے پاس کچھ نہ رہے، جو عمر باقی ہے اس میں آوارہ پھروں، اور اپنے جذبۂ انتقام کے سوا کوئی یادگار نہ چھوڑوں۔

شیخ سرمد: انتقام کس سے لوگے۔ ذرا غور تو کرو، زاہد عاشق سے بھی زیادہ مبتلا ہوتا ہے۔

زاہد توچہ لذت زریافتہ ‏ ‏ صد خرقۂ پشمینہ بہم یافتہ
از رشتۂ تسبیح کہ باریک زموست ‏ ‏ محکم رسنے برائے خود بافتہ

(دارا سمجھ جاتا ہے کہ شیخ سرمد کا اشارہ کس طرف ہے اور اس کے چہرے پر کچھ شگفتگی آجاتی ہے)

دارا: حضور، خداوند عالم نے بھی اورنگ زیب کو یہی بات ایک خط میں لکھی تھی۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ تم نے خانہ جنگی کی مثال قائم کی ہے تو یقین جانو کہ تمھاری اولاد اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھے گی، تم عمر بھر خطرے میں رہوگے اور بڑھاپے میں تم میری طرح معذور ہو جاؤ گے تو تمھارے لڑکے ایک دوسرے کا خون بہائیں گے۔ مگر اس ہوس کے بندے نے ایک نہ سنی اور اب کامیابی نے اسے اور کوتہ اندیش کر دیا ہے۔

شیخ سرمد: کوتہ اندیش ہم سب ہیں۔

جز محنت و رنج نیست حاصل زہمہ ‏ ‏ فارغ شو و آزاد بکن دل زہمہ
خود را بخدا گذار، اندیشہ مکن ‏ ‏ ایں فکر و خیال دو ہم مشکل زہمہ

دارا: حضور، دعا کیجیے کہ یہ مرتبہ مجھے نصیب ہو۔ اب مجھے اجازت دیجیے میں آپ کے پاس بیٹھنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔

شیخ سرمد: (دارا کا ہاتھ پکڑ کر)

ہر جا کہ روی مہر و وفا یار تو باد ‏ ‏ آرام و فراغت ہمہ جا یار تو باد
از نامہ و پیغام فراموش مکن ‏ ‏ یاد آوریم بکن خدا یار تو باد

(دارا شیخ سرمد کے قدموں پر گر پڑتا ہے اور کچھ دیر پڑا رہتا ہے پھر اٹھ کر ان

کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے چلا جاتا ہے۔ شیخ سرمد کسی فکر میں ڈوبے بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں)

سرمدؔ گلہ اختصار می باید کرد　　　یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد　　　یا قطع نظر زیار می باید کرد

(شیخ سرمد رباعی کا ایک ایک مصرع اس طرح پڑھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے رباعی اسی وقت کہی ہے۔ رباعی کہنے کے بعد وہ اپنے منھ پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ اب ان کے دل کو کچھ سکون ہو گیا ہے)

شیخ سرمد: (ابراہیم سے مخاطب ہو کر) تم کو گانا آتا ہے؟

ابراہیم: جی نہیں۔

شیخ سرمد: شراب بھی نہ کھینچتے ہوگے؟

(ابراہیم شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتا ہے)

شیخ سرمد: تمھارا نام کیا ہے؟

ابراہیم: ابراہیم بدخشانی۔

شیخ سرمد: کیا ہوا۔ ایسے ابراہیم تو نہیں ہو کہ خدا کے دوست بنو اور کافر کو روٹی نہ دو۔ نشہ نہیں پیدا کر سکتے نہ سہی، سر کا درد تو مٹا دیتے ہو۔

ابراہیم: (کچھ تامل کے بعد) حضور! ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔

شیخ سرمد: کیا؟

ابراہیم: خانہ جنگی کے اس دور میں ملت کی وحدت کیسے قائم رکھی جا سکتی ہے؟

شیخ سرمد: میں کیا جانوں؟ میں تو ابھی تک کلمہ بھی پورا نہیں پڑھ سکا ہوں۔ مگر تمھیں ایک بات بتاتا ہوں۔ سوال کبھی نہ کیا کرو، اس لیے کہ جواب ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ شعر پڑھو، شراب پیو، دیوانے بنو، سوال مت کرو۔ جس نے سوال کیا اس نے اپنے پاؤں میں زنجیر پہنی۔ (ابراہیم کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اور اس کی آنکھ سے آنکھ ملا کر) کیا سمجھے؟

ابراہیم: (شرمندگی سے مسکرا کر) کچھ نہیں۔

شیخ سرمد: دیکھو، میں نے کہا تھا کہ ہر جواب غلط ہوتا ہے۔ تم اپنے دل میں سوچ رہے ہو کہ یہ دیوانہ ہے، اس نے جو بات کہی ہے اس کا مطلب کچھ ضرور ہوگا۔ اب میں جا کر اپنے استاد سے پوچھوں گا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔

ابراہیم: (اور شرمندہ ہو کر) جی ہاں، یہی سوچ رہا تھا۔

شیخ سرمد: دیکھا!

ابراہیم: مگر سوال نہ کروں تو کیا کروں؟

شیخ سرمد: حقیقت کی ایک طلب وہ ہوتی ہے جو سوال بن کر نکلتی ہے۔ ایک طلب وہ ہوتی ہے جو خود سائل کو سوال کا جواب بنا دیتی ہے۔ یاد رکھو، حقیقت کا کوئی علم نہیں ہے، حقیقت کے صرف عالم ہوتے ہیں۔

ابراہیم: مگر حضور......

شیخ سرمد: بس، بس، بس...... مجھے سوال جواب میں نہ الجھاؤ...... (پیچھے کی طرف دیکھ کر) جزاک اللہ، جزاک اللہ، میرا ساقی آ گیا، میری شراب آ گئی، (ابراہیم سے) بیٹھ، تو بھی کچھ پی لے۔

(علی قوال ایک لڑکے کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اور شیخ سرمد کی قدم بوسی کرتا ہے)

علی قوال: حضور کا مزاج تو اچھا ہے؟

شیخ سرمد: پیاسا ہوں۔ بہت پیاسا ہوں۔

علی قوال: حضور، یہ میرا لڑکا ہے۔ اسے میں ساتھ لے آیا ہوں۔

شیخ سرمد: (ہاتھ جوڑ کر) مجھے ایک ہی ساقی کافی ہے، بس پیاس بجھا دے۔

علی قوال: (ہنس کر) حضور مجھے معلوم ہوتا تو میں پہلے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ حضرت نظام الدین کے عرس کے بعد فوراً ہی چلا آتا۔

(شیخ سرمد کوئی جواب نہیں دیتے، منھ کی طرف بار بار ہاتھ لے جاتے ہیں اور جھومنے لگتے ہیں۔ علی قوال مسکراتا ہے۔ اور لڑکے کے کان میں کچھ کہتا ہے)

علی قوال: حضور حافظ کی ایک غزل سناؤں؟

شیخ سرمد: کسی کی بھی ہو، مجھے بس نشہ چاہیے۔

(علی قوال پہلے گنگناتا ہے۔ پھر گانا شروع کرتا ہے)

نفس برآمد و کام از تو بر نمی آید | فغاں کہ بختِ من از خواب بر نمی آید
نفس برآمد و کام از تو بر نمی آید | فغاں کہ بختِ من از خواب بر نمی آید
مگر بروئے دل آرائے یار من ورنہ | بہ ہیچ گونہ دگر کار بر نمی آید
دریں خیال بسر شد دریغ عمر عزیز | بلائے زلف سیاحت بسر نمی آید
بسے حکایت دل ہست با نسیم سحر | ولے بہ بخت من امشب سحر نمی آید
خدائے دوست نہ کردیم عمر و مال دریغ | کہ کار عشق زما ایں قدر نمی آید

(اس شعر پر شیخ سرمد پر کچھ کیفیت سی طاری ہوتی ہے۔ علی قوال اسے بار بار گاتا ہے)

زبس کہ شد دل حافظ رمیدہ از ہمہ کس | کنوں ز حلقۂ زلفت بدر نمی آید
نفس برآمد و کام از تو بر نمی آید | فغاں کہ بختِ من از خواب بر نمی آید

(علی قوال خاموش ہو جاتا ہے۔ شیخ سرمد جھومتے رہتے ہیں۔ علی قوال چپکے سے اپنے لڑکے کے کان میں کچھ کہتا ہے اور پھر گنگنانے لگتا ہے۔)

شب خیال طرۂ شوخے بدل پیچیدہ رفت
شب خیال طرۂ شوخے بدل پیچیدہ رفت

(شیخ سرمد کو اس مصرعے پر حال آجاتا ہے اور علی قوال کھڑا ہو جاتا ہے
اور اسے برابر گاتا رہتا ہے۔ شیخ سرمد پہلے لیٹ جاتے ہیں، پھر ایک عجیب
رقص کے انداز سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر زمین پر گر پڑتے ہیں
اور بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

(ملا ابوالقاسم کا مدرسہ۔ اس میں بائیں طرف دیوار سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤ تکیہ رکھا ہے۔ اس کے آگے ایک چھوٹا اور سستا سا قالین بچھا ہے۔ قالین پر ملا ابوالقاسم بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے آٹھ دس نوجوان ہیں۔ ایک نوجوان، جو معلوم ہوتا ہے کچھ پوچھنے آیا ہے، ملا ابوالقاسم کے پاس بیٹھا ہے اور کسی کتاب کے ورق الٹ رہا ہے۔ لطف اللہ ہانپتا کانپتا داخل ہوتا ہے)

لطف اللہ: مولانا، غضب ہو گیا۔ شیخ سرمد گرفتار کر لیے گئے۔

(نوجوان سب لطف اللہ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ ملا ابوالقاسم کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ وہ اپنے دانت بھینچ لیتے ہیں۔ اور بڑی مایوسی کے انداز میں سر جھکا لیتے ہیں)

لطف اللہ: اسی وجہ سے مجھے آنے میں دیر ہوئی۔ جامع مسجد کے قریب ایسی بھیڑ تھی کہ راستہ چلنا دشوار تھا۔ میں دوسری طرف سے جامع مسجد کے اندر گیا اور وہاں سے دیکھا کہ چند سپاہی شیخ سرمد کو گھیرے ہیں اور ان کے ہتھکڑیاں ڈال دی ہیں، وہ انھیں قید خانے کی طرف

لے جانا چاہتے تھے مگر چاروں طرف مجمع ایسا تھا کہ وہ چل نہیں پاتے تھے۔ آخر میں انھوں نے تلواریں نکالیں۔ تب لوگ کچھ ڈرے اور رستہ چھوڑنے لگے بہت سے لوگ زاروقطار رو رہے تھے۔ مگر شیخ سرمد کو بچانے کی کوشش کسی نے نہیں کی۔

(سب کچھ دیر خاموش رہتے ہیں۔ پھر ایک نوجوان حفظ الرحمن کہتا ہے)

حفظ الرحمن: مولانا، شیخ سرمد کو بچانے کی کوشش تو ضرور کرنا چاہیے۔

لطف اللہ: جی ہاں، مولانا، اگر آپ کسی طرح سے شیخ سرمد کو چھڑا دیں تو شاہ جہاں آباد کے لوگ آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔

ملا ابوالقاسم: بادشاہ کو شہر والوں کے خیالات معلوم ہیں۔ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ سوچ کر کیا ہوگا۔ اب اس پر کسی کی منت والتجا کا اثر نہ ہوگا۔

لطف اللہ: مگر مولانا، عوام کے دلوں کو اس طرح کچلنا تو بڑا ظلم ہے۔

ملا ابوالقاسم: ہاں مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو ایک کو صریحی ظلم معلوم ہوا سے دوسرا عین انصاف کہے۔

ابراہیم: ایسی حرکت کو کوئی انصاف بھی کہہ سکتا ہے؟

ملا ابوالقاسم: کبھی کبھی نفرت اور بغض کی ایسی وبا پھیلتی ہے کہ وہ رحم اور محبت کے مادے کو بالکل سلب کر لیتی ہے، لوگ ایسے تنگ نظر اور سنگ دل ہو جاتے ہیں گویا ان کی فطرت بدل گئی ہے۔ خانہ جنگی فطرت کے اس طرح بدلنے اور بگڑنے کی علامت ہے۔

ابراہیم: مگر اب تو خانہ جنگی ختم ہوگئی ہے۔

ملا ابوالقاسم: ہاں، اب فوجوں کی لڑائی تو نہیں ہو رہی مگر دلوں میں بغض اور کینہ باقی ہے۔ لطف اللہ نے شیخ سرمد کی گرفتاری پر بہت سے لوگوں کو روتے دیکھا ہے لیکن اس وقت بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جنھیں خوشی ہوگی۔ شیخ سرمد نے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، وہ شیخ سرمد کے خیالات کو سمجھتے بھی نہ ہوں گے۔ پھر بھی انھیں اس پر خوشی ہوگی کہ شیخ سرمد پکڑ لیے گئے اور غالباً شہید کر دئے جائیں گے۔ آج کل لوگ زبان سے کچھ بھی کہیں، انھیں ہر وقت فکر اس کی ہوتی ہے کہ انھیں کوئی مخالف ملے جسے وہ برا کہہ سکیں اور تکلیف پہنچا سکیں۔ کسی پر جھوٹا الزام بھی لگایا جائے تو لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ حقیقت میں وہ ملزم

ثابت ہے، اور چاہتے ہیں کہ وہ ملزم ثابت ہو، اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔ ان کے دلوں میں آگ سی جلتی رہتی ہے جس کے شعلے ان کی آنکھوں سے اور ان کی زبان سے نکلتے ہیں، اور اس آگ کو ایندھن چاہیے، نہیں تو آدمی خود اس میں جلنے لگتا ہے جیسے دیئے میں تیل نہ رہے تو بتی جل جاتی ہے۔

(خاموشی)

ملاابوالقاسم: اس کا علاج یہ ہے کہ خدا پر بھروسہ کرو اور اپنے کام میں لگے رہو، دوسرا علاج یہ ہے کہ شیخ سرمد کی طرح مخالفوں سے ٹکر لو اور دار پر چڑھو۔

حفظ الرحمٰن: مگر مولانا جب کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ شیخ سرمد دار پر کیوں چڑھے تو اس سے کیا فائدہ؟

ملاابوالقاسم: حق کی خدمت کوئی کاروبار نہیں ہے کہ جس کام میں نفع ہو وہ کیا جائے اور جس میں نفع نہ ہو وہ نہ کیا جائے۔ حق کی راہ میں جان دینے والے اپنی الگ الگ طبیعت رکھتے ہیں، کوئی تلقین کرتا ہے، اور ساری عمر اسی میں صرف کرتا ہے، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اس کی محنت اور ایثار کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے یا نہیں، کوئی ہاتھ میں تلوار لے کر اور سر پر کفن باندھ کر نکلتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ اس کی جان سلامت رہے گی اور اسے کامیابی ملے گی یا نہیں، کوئی مخالف عناصر کو اس طرح جمع کرتا ہے جیسے شادی میں مہمان بلائے جاتے ہیں اور برات لے کر قتل گاہ کو جاتا ہے۔

(خاموشی)

(کوئی شخص دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ ابراہیم بدخشانی چپکے سے دروازہ کی طرف جاتا ہے۔ السلام علیکم، وعلیکم السلام کی آواز آتی ہے اور پھر عبدالرحمٰن ابراہیم بدخشانی کے آگے آگے داخل ہوتا ہے۔ ملاابوالقاسم بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہیں اور پھر دونوں قالین پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

عبدالرحمٰن: مولانا صاحب، آپ نے مجھے پہچانا نہ ہوگا، اگرچہ ایک دو دفعہ آپ سے نیاز حاصل ہو چکا ہے۔ آپ کا شاگرد حفظ الرحمٰن میرا لڑکا ہے۔ مجھے آپ سے بڑی عقیدت ہے اور بہت زمانے سے ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میرا لڑکا پڑھنے کے قابل ہوا تو اسے آپ ہی کی

خدمت میں رکھوں گا۔ چنانچہ وہ کئی سال سے آپ کی صحبت سے فیض حاصل کر رہا ہے۔

ملا ابوالقاسم: جی ہاں، حفظ الرحمٰن میرے بہت ہی عزیز شاگردوں میں سے ہے۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ آپ نے اس کی تعلیم و تربیت میرے سپرد کی۔ ماشا اللہ بہت ہونہار نوجوان ہے۔

عبدالرحمٰن: میری دلی خواہش تھی کہ اسے یہیں رکھوں جب تک وہ اپنی تعلیم ختم نہ کر لے۔ مگر اب میرے دوست احباب مخالفت کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولانا صاحب کے خیالات پسند نہیں کیے جاتے، لڑکے کو ان کے یہاں پڑھاتے رہے تو پچھتاؤ گے۔

ملا ابوالقاسم: آپ کے عزیزوں اور محلے والوں کو میرے چند ہی عیب معلوم ہوں گے۔ میں کبھی سوچتا ہوں کہ اپنے عیبوں کی فہرست تیار کروں اور اسے دروازے پر لٹکا دوں۔ پھر کسی کو دھوکا نہ ہوگا۔ مگر مکمل فہرست بنانے کے لیے جتنا کاغذ چاہیے وہ میرے پاس نہیں۔

عبدالرحمٰن: مولانا صاحب آپ کو اس طرح گفتگو نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں آپ کا بہت معتقد ہوں اور میرے تمام جان پہچان والے کہتے ہیں کہ شاہ جہاں آباد میں آپ سے بہتر کوئی استاد نہیں۔ اسی وجہ سے میں چاہتا تھا کہ خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی دشواری بیان کروں آپ کے شایانِ شان نہیں ہے کہ آپ میری عقیدت مندی کو ٹھکرائیں۔ آپ کا حق ہے کہ شاہ جہاں آباد کے لوگ آپ کے علم اور آپ کی شفقت کی قدر کریں، آپ کو چاہیے کہ اپنے عقیدت مندوں کے جذبات کا لحاظ کریں۔

(ملا ابوالقاسم نظریں نیچی کیے بیٹھے رہتے ہیں اور کچھ جواب نہیں دیتے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

عبدالرحمٰن: تو مولانا صاحب، پھر میں کیا سمجھوں؟

ملا ابوالقاسم: آپ یہ سمجھیے کہ جو مصلحت ہو وہی کرنا چاہیے۔

عبدالرحمٰن: مگر میں اپنے لڑکے کو اس فائدے سے محروم نہیں کرنا چاہتا جو اسے آپ کے قدموں پر بیٹھ کر حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال کچھ ایسا بیجا نہیں ہے کہ آپ اسے خاطر ہی میں نہ لائیں۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے بہت افسوس ہوگا اگر میرا لڑکا یہاں کی

تعلیم وتربیت سے محروم رہا۔

ملاابوالقاسم: میرا کام تعلیم دینا ہے اور مجھے بہت خوشی ہوتی ہے، اگر مجھے اپنے فرائض کو انجام دینے کا موقع ملتا ہے لیکن اپنے فائدے اور نقصان کا اندازہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔

عبدالرحمن: مولانا صاحب، آپ تو پھر وہی بات کہہ رہے ہیں۔

ملاابوالقاسم: آپ کا کیا منشا ہے، میں کیا کہوں؟

عبدالرحمن: میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ شاہ جہاں آباد کے لوگ آپ کے علم اور آپ کی تعلیم کی دل سے قدر کرتے ہیں اور سب کو بہت افسوس ہے کہ آپ کے بعض خیالات کی وجہ سے آپ کی شہرت کو نقصان ہو رہا ہے۔

ملاابوالقاسم: میری جو حیثیت اور ملکیت ہے اسے آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی مجھے ضرورت نہیں۔ آپ لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ میرے پاس لڑکوں کو تعلیم کے لیے بھیجنا مناسب نہیں تو یہ تھوڑی سی جگہ مجھے بہت خالی نہ معلوم ہوگی، اگر آپ نے طے کیا کہ میں معلمی کا کام کر سکتا ہوں تو خدا کے فضل سے اس جگہ میں اور میرے دل میں پوری گنجائش نکل آئے گی۔

عبدالرحمن: مولانا صاحب، مجھے شرمندگی ہے کہ میں اپنا مطلب واضح نہیں کر سکا۔ اب کیا عرض کروں۔

ملاابوالقاسم: آپ نے جو کچھ طے کرلیا ہے وہ تو آپ کریں گے لیکن مجھے میرا قصور معلوم ہو جائے تو میں سمجھ لوں گا کہ مجھے سزا کیوں دی جارہی ہے۔ میرے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ میرا طریقہ بھی نہیں بدلا ہے۔ میں ہمیشہ سے بہت برا سمجھتا رہا ہوں کہ مسلمان ایک دوسرے سے لڑیں، چاہے وہ میرے شاگرد ہوں یا کسی سلطنت کے حکمراں۔

عبدالرحمن: چاہے ایک فریق بے دین ہو اور دوسرا دین دار، ایک کافر نواز ہو اور دوسرا حق پرست؟

ملاابوالقاسم: میں خانہ جنگی کو تباہی کی علامت سمجھتا ہوں اس لیے اسے برحق نہیں مان سکتا۔ اگر آپ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ میں دارا کا طرفدار ہوں اور اورنگ زیب عالمگیر کا مخالف تو یہ آپ کا استدلال ہے۔ میرے خیالات کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔

عبدالرحمن: تو پھر آپ اسے صاف صاف کیوں نہیں بیان کر دیتے؟

ملا ابوالقاسم: مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ میں بہت صاف کہتا ہوں ملت اسلامی کے لیے سب سے زیادہ مہلک چیز خانہ جنگی ہے۔

عبدالرحمن: مگر اب تو جنگ کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اب آپ ایسی بات کیوں کہتے ہیں؟

ملا ابوالقاسم: خانہ جنگی ہر وقت اور ہر معاملہ پر ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کی ہر وقت ضرورت ہے۔

عبدالرحمن: اس وقت بھی۔

ملا ابوالقاسم: توبہ گناہ سے بچنے کے لیے کی جاتی ہے، آپ مجھے سمجھا رہے ہیں کہ جب گناہ کر لیا ہے تو پھر توبہ کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔

عبدالرحمن: آپ کا خیال ہے کہ اب جو لڑائی ختم ہو گئی ہے تو نعوذ باللہ عالم گیر بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنا چاہیے؟

ملا ابوالقاسم: میں خانہ جنگی کو بہت برا سمجھتا ہوں۔

عبدالرحمن: اس لیے آپ عالمگیر بادشاہ کو سلطنت کا حق دار نہیں مانتے۔

ملا ابوالقاسم: مجھے تاج و تخت کے حق سے کوئی بحث نہیں، وہ جس کو ملے اسے مبارک ہو۔

عبدالرحمن: لیکن اگر آپ سے رائے لی جائے۔

ملا ابوالقاسم: میں وہی کہوں گا جو آپ سے عرض کر چکا ہوں آپ لوگ چاہیں تو مجھے اس کی سزا دلوا سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ میری باتوں سے ایسا نتیجہ نہ نکالیں کہ میں سزا کا مستحق ہو جاؤں۔ اب آپ کی جو مصلحت ہو وہ کیجیے۔ میں راضی بہ رضا ہوں۔

عبدالرحمن: مولانا صاحب، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے یا کسی اور کو ذرا بھی خواہش نہیں کہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچے، ہم سب آپ کی عزت اور قدر کرتے ہیں۔ اب آپ خود سوچ لیجیے کہ آپ کے لیے کہاں تک مناسب ہے کہ مسلمانوں کے جذبات کا خیال نہ کریں اور انھیں مخالفت پر مجبور کریں۔ بس اب میں آپ کی اور سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے اجازت دیجیے۔ السلام علیکم۔

ملاابوالقاسم: وعلیکم السلام

(عبدالرحمٰن چلا جاتا ہے۔ طالب علم سب حفظ الرحمٰن کی طرف دیکھنے لگتے ہیں، وہ مسکراتا ہے۔)

حفظ الرحمٰن: مولانا، آپ اس سے پریشان نہ ہوں۔ لوگ آآ کر والد صاحب کو پریشان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لڑکے کو ایسے عالم کے پاس بھیجا ہے۔ جو خانہ جنگی کو برا کہتا ہے اور محبت فی اللہ کی تلقین کرتا ہے۔ تو یقین جانو اس کی خبر بادشاہ عالم تک پہنچے گی اور پھر اسے کوئی ملازمت نہ ملے گی...... اصل بات یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو جاسوس سمجھنے لگے ہیں اور انھیں ڈر ہے کہ اگر کوئی بات کہی گئی جو بادشاہ عالم کے خلاف ہوئی تو وہ دربار تک پہنچ جائے گی اور پھر سختی سے باز پرس ہوگی۔

ملاابوالقاسم: خانہ جنگی کی ایک آفت یہ بھی ہے کہ ہر شخص جاسوس بن جاتا ہے، اور اشتعال دینے والی خبریں پھیلانے لگتا ہے۔ اب ہمیں چاہیے کہ فائدے اور نقصان، آرام اور تکلیف کا خیال چھوڑ دیں اور شیخ سرمد کی نصیحت کو ہر وقت ذہن میں رکھیں۔ تمھیں یاد ہے انھوں نے فرمایا تھا کہ حقیقت کی ایک طلب وہ ہوتی ہے جو سوال بن کر نکلتی ہے، ایک طلب وہ ہوتی ہے جو خود سائل کو سوال کا جواب بنا دیتی ہے۔ اب ایسا آدمی بننے کی کوشش کرو کہ جو تمھیں دیکھے اسے یقین ہو جائے کہ ملت اسلامی کی وحدت تمھاری مروت اور شرافت میں قائم ہے، اور ہر صدمہ جو تمھارے دل کو پہنچے گا، اس وحدت میں اور استقلال پیدا کرے گا۔

(باہر سے آواز آتی ہے۔ جناب مولانا ابوالقاسم صاحب تشریف رکھتے ہیں؟ ابراہیم بدخشانی دروازے کی طرف جاتا ہے اور ایک نوجوان کے ساتھ جس کی وضع قطع مولویوں کی سی ہے واپس آتا ہے)

نوجوان: (کمرے اور طالب علموں پر ایک نظر ڈال کر) السلام علیکم! میں یہ عرض کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ جناب صدرالصدور، محتسب شاہی علامہ اعتماد خاں عبدالقوی صاحب آپ سے ملاقات کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

ملا ابوالقاسم: میں حاضر ہوں، مگر......

(اعتماد خاں عبدالقوی داخل ہوتا ہے۔ ملا ابوالقاسم اور طالب علم السلام علیکم کہتے ہیں اور وہ کسی قدر بے پروائی سے جواب دیتا ہے۔)

اعتماد خاں: ملا ابوالقاسم آپ ہی ہیں؟

ملا ابوالقاسم: بندے کا نام ابوالقاسم ہے (گاؤ تکیے اور قالین کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیے۔

(اعتماد خاں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر اس طرح بیٹھ جاتا ہے کہ گویا مسند نشینی اسی کا حق ہے۔ ملا ابوالقاسم اور طالب علم سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ پھر وہ کمرے پر حقارت آمیز نظر ڈال کر ملا ابوالقاسم کو اشارہ کرتا ہے کہ سامنے بیٹھ جائیں۔ ملا ابوالقاسم طالب علموں کو اشارہ کرتے ہیں کہ وہ بھی بیٹھ جائیں۔)

اعتماد خاں: آپ یہاں درس بھی دیتے ہیں؟

ملا ابوالقاسم: جی ہاں، کچھ نوجوان میرے پاس پڑھنے کو آجاتے ہیں۔

اعتماد خاں: (ابراہیم کی طرف اشارہ کر کے) یہ کون ہے؟

ملا ابوالقاسم: یہ میرا ایک شاگرد ہے۔

اعتماد خاں: ہوں، میں نے آپ کے مدرسے کی بہت تعریف سنی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ اخلاقی تربیت کی طرف خاص توجہ کرتے ہیں۔

(ملا ابوالقاسم کوئی جواب نہیں دیتے)

اعتماد خاں: تعلیم دینا ایک بہت اہم کام ہے، اس لیے معلم کو چاہیے کہ وہ عقائد اور اخلاق کے بارے میں صحیح رائے رکھتا ہو۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ مجھے بادشاہ عالم اورنگ زیب عالمگیر نے محتسب مقرر کیا ہے اور پہلا کام جو میرے سپرد کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس بے دینی کے آثار کو مٹاؤں جو دارا شکوہ کی کفر دوستی اور کافر نوازی نے پھیلا دی تھی۔

(اعتماد خاں ملا ابوالقاسم کی طرف اس طرح دیکھتا ہے کہ گویا جواب کا

منتظر ہے۔ ملا ابوالقاسم سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔)

اعتماد خاں: آپ کچھ فرماتے نہیں۔ بہر حال جس شخص کے دل میں دین کی ذرا بھی محبت ہے وہ اس وقت احتساب میں مصروف ہے اور بادشاہ عالم کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوت اور اقتدار کو عقائد اور عمل کی اصلاح کا ذریعہ بنا کر خلافت کے منصب کا حق ادا فرمائیں...... آپ اس کام میں مدد دینے پر کچھ مستعد نہیں معلوم ہوتے۔

ملا ابوالقاسم: میرا علم اس کے لیے بھی کافی نہیں کہ نوجوانوں کی پوری رہنمائی کر سکوں۔ میں جب کبھی اپنی قابلیت اور استعداد کا جائزہ لیتا ہوں تو شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اعتماد خاں: اس طرح کے رسمی انکسار میں پناہ لینا فرائض کی انجام دہی سے گریز کرنا ہے۔ میں آپ سے فقہ کے دقیق مسائل پر بحث کرنا نہیں چاہتا، صرف ایک ایسے معاملے میں رائے لینا چاہتا ہوں جس میں کوئی شخص اختلاف نہ کرے گا، سوا اس کے کہ اس کے اپنے عقائد درست نہ ہوں، یا اس کی نیت میں کوئی خلل ہو...... کافروں میں بعض فرقے ایسے ہیں جو بے حیائی کی تلقین کرتے ہیں اور ان کی اخلاقی بے حسی اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ وہ برہنہ گھومتے ہیں۔ دارا شکوہ کی بدعت پسندی نے یہ خطرہ پیدا کر دیا ہے کہ ایسی بے حیائی کی مثال مسلمانوں میں بھی قائم ہو جائے...... اس کے علاوہ ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ کفر اور اسلام کے درمیان بین فرق اور فصل قائم رکھنا ضروری ہے۔ اور اگر کبھی اس کا اندیشہ ہو کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ کر مل جائیں گے تو مفتی کی رائے اور مجاہد کی تلوار کو درمیان میں آ کر کفر اور اسلام کے فرق کو واضح کر دینا چاہیے...... آپ اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے؟

ملا ابوالقاسم: میری طبیعت میں یہ ایک بڑی خامی ہے کہ میں اصول اور عمل کو جدا نہیں کر سکتا۔ مگر آپ میری اس معذوری کا خیال نہ کریں اور اپنا مطلب بیان فرما دیں۔

اعتماد خاں: خوب۔ میں نے اپنا مقدمہ بیان نہیں کیا ہے اور آپ میری نیت پر شبہ کرنے لگے۔ بہر حال اس معاملہ کا فیصلہ صرف آپ نہیں کریں گے بلکہ شاہ جہاں آباد کے تمام مفتی اور عالم۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ شہر کے بعض لوگ آپ سے خاص

عقیدت رکھتے ہیں اور بادشاہ عالم کا ارشاد ہے کہ میں ہر خیال کے علما کی رائے حاصل کروں، تا کہ یہ اعتراض نہ کیا جاسکے۔ کہ اس معاملے میں یک طرفہ فیصلہ کیا گیا۔

ملا ابوالقاسم: میں ابھی تک یہ نہیں معلوم کر سکا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔

اعتماد خاں: (تیوری پر بل ڈال کر) وہ بھی سن لیجیے۔ معاملہ یہ ہے کہ اس شہر میں ایک شخص جسے سرمد کہتے ہیں کئی سال سے رہتا ہے۔ میں نے اس کے حالات دریافت کیے ہیں۔ وہ آرمینیہ کا یہودی ہے جو مسلمان ہو گیا اور تجارت کی غرض سے ہندستان آیا تھا۔ سندھ کے کسی شہر میں وہ ایک ہندو لڑکے پر عاشق ہو گیا اور چونکہ طبیعت پہلے ہی سے بیہودگی کی طرف مائل تھی، اس نے ایک نئے جذبے سے متاثر ہو کر اپنی شہوانیت کو بے حجاب کر دیا اور بالکل ننگا رہنے لگا۔ سندھ سے وہ آوارہ گھومتا ہوا شاہ جہاں آباد پہنچا۔ اسلامی دارالسلطنت میں ایسی کریہہ بدعت ہرگز گوارہ نہ کی جاتی اگر دارا شکوہ جیسا بے دین سلطنت کے اقتدار کو کفر کا سرپرست نہ بنا دیتا۔ اب اسلام کے اس دشمن کو وہ روسیاہی نصیب ہوئی ہے جس کا وہ سزاوار تھا، اور بادشاہ عالم کا حکم ہے کہ سرمد کے عقائد کے بارے میں تحقیق کی جائے۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ ملحد اور بے دین ہے تو اسے مناسب سزا دی جائے۔ میں سرمد سے ابتدائی سوال و جواب کر کے یہ رائے قائم کر چکا ہوں کہ اس کو علما اور مفتیوں کی ایک عدالت کے سامنے پیش کرنا صرف مناسب نہیں بلکہ ایک دینی فرض ہے، کیونکہ یہ شخص تصوف کی آڑ لے کر اسلامی عقائد کی بیخ کنی کر رہا ہے۔ بادشاہ عالم کا حکم ہے کہ آپ بھی اس عدالت میں شریک ہوں اور صحیح فیصلہ کرنے میں مدد دیں۔

ملا ابوالقاسم: میں شیخ سرمد کے عقائد اور ان کے مسلک سے پوری واقفیت نہیں رکھتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ میرا منصف بن کر بیٹھنا اور انھیں اپنے سامنے طلب کرانا انتہائی گستاخی ہوگی۔ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل نہیں کر سکتا۔

اعتماد خاں: میں آپ سے بیان کر چکا ہوں کہ میں یہ کارروائی بادشاہ عالم کے حکم سے کر رہا ہوں، آپ انکار کریں گے تو یہ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔

ملاابوالقاسم: میرے لیے نافرمانی کی سزا بھگتنا زیادہ آسان ہوگا۔

اعتماد خاں: بہت بہتر...... (کچھ سوچ کر) لیکن آپ میں اتنی جرأت ہے کہ بادشاہ عالم کی عدول حکمی کریں تو آپ عدالت میں آکر اس عقیدت کا حق بھی ادا کرسکتے ہیں جو آپ کو اپنے پیرومرشد سے ہے (کپڑے میں لپٹے ہوئے کاغذ عبا کے اندر سے نکال کر) لیجیے اس شاہی فرمان کو ملاحظہ فرمالیجیے تاکہ آپ کے دل میں کوئی شبہ نہ رہے۔

(ملا ابوالقاسم شاہی فرمان کو غور سے پڑھتے ہیں اور اعتماد خاں کو واپس کردیتے ہیں)

اعتماد خاں: (حقارت آمیز تبسم کے ساتھ) آپ کو زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں۔ خدا حافظ۔

(اعتماد خاں اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ خاموشی)

ابراہیم: مولانا، اب کیا ہوگا؟

ملاابوالقاسم: ہوگا کیا۔ شیخ سرمد شہید ہوں گے۔ خانہ جنگی کی تکمیل ہوجائے گی۔

لطف اللہ: مولانا کیا آپ کو یقین ہے کہ شیخ سرمد شہید کردیے جائیں گے؟

ملاابوالقاسم: ہاں، موحد کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ مادی وجود سے نجات پائے اور حق سے واصل ہوجائے...... شیخ سرمد کوشش کریں گے کہ شریعت کی جو خلاف ورزی وہ کرتے ہیں وہ ایک بڑا جرم ثابت ہو، حقائق کو جس شوخی سے وہ بیان کرتے ہیں اس پر الحاد اور کفر کا قوی گمان کیا جاسکے۔ مدعی خوش ہوں گے کہ ان کا مطلب پورا ہوا، شیطان ہنسے گا کہ حق کی چھری حق کے گلے پر پھیری جارہی ہے...... موحد کا خون کبھی معاف نہیں ہوتا...... سرمد کے قتل کا کفارہ کیا ہوگا...... یا اللہ رحم کر......!

(ملاابوالقاسم کانپتے ہوئے ہاتھ دعا کے لیے اٹھاتے ہیں اور پھر ہاتھوں سے اپنا منھ بند کرلیتے ہیں)

(پردہ)

چوتھا ایکٹ

(عدالت کا ایوان۔ پیچھے کی طرف اونچی مسند پر اعتماد خاں عبدالقوی بیٹھا ہے۔اس کے پیچھے ایک سیاہ پردہ پڑا ہے۔اعتماد خاں کے دونوں طرف ایک نیم دائرے کی شکل میں آٹھ علما بیٹھے ہیں۔ اسٹیج کے بائیں طرف ملا ابوالقاسم دکھائی دیتے ہیں۔دائیں طرف سے شیخ سرمد آتے ہیں اوران کے پیچھے دو سپاہی جوان کی زنجیروں کو پکڑے ہیں جن میں شیخ سرمد کے ہاتھ بندھے ہیں۔ ان کے داخل ہوتے ہی ملاابوالقاسم دست بستہ کھڑے ہوجاتے ہیں۔)

ملاابوالقاسم:السلام علیکم۔

(شیخ سرمد مسکرا کرکورنش بجالاتے ہیں۔مجمع دونوں کو بڑی حیرت سے دیکھتا ہے۔اعتماد خاں کے تیور چڑھ جاتے ہیں۔ملاابوالقاسم شیخ سرمد کے جواب اوران کے انداز سے گھبراجاتے ہیں،مگر ہمت کر کے کھڑے رہتے ہیں۔ اعتماد خاں ان کی طرف غصہ کی نظر ڈال کر علما کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔)

اعتماد خاں: حضرات علما! ملزم آپ کے سامنے حاضر کر دیا گیا ہے، اب آپ اجازت دیں تو میں مقدمہ کو مختصر بیان کر دوں۔ اس شخص کا نام محمد سعید ہے، سرمد تخلص کرتا ہے۔ لوگوں کی روایت ہے کہ یہ شہر کاشاں کا رہنے والا یہودی ہے۔ جو مسلمان ہو گیا اور تجارت کے لیے ہندوستان آیا۔ سندھ کے کسی شہر میں یہ ایک ہندو لڑکے پر عاشق ہو گیا۔ اور اس کے بعد اس نے عریانی اختیار کر لی۔ سندھ سے یہ آوارہ گھومتا گھومتا شاہ جہاں آباد پہنچا اور کئی سال سے جامع مسجد کے پاس پڑا رہتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو دیوانہ اور مجذوب ظاہر کرتا ہے لیکن یہ علوم دینی اور دنیوی میں خاصی دستگاہ رکھتا ہے۔ عربی، عبرانی اور فارسی جانتا ہے اور ہندوستان میں اس نے سنسکرت بھی سیکھی ہے۔ یہ اپنے عقائد کی تبلیغ کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بہت سے لوگوں کو اپنا معتقد بنا کر گمراہ کر دیا ہے۔ جرم کی تفصیل یہ ہے کہ یہ ایک بت پرست لڑکے پر عاشق ہو گیا، یہ ننگا رہتا ہے اگرچہ اسے ستر پوشی کے لیے لباس مل سکتا ہے۔ یہ معراجِ جسمانی سے انکار کرتا ہے، یہ کلمہ طیبہ پورا نہیں پڑھتا اور اس طرح خدا اور رسولِ خدا کا منکر ہے۔ بادشاہ عالم اورنگ زیب عالمگیر، خلد اللہ ملکہ، وسلطنۃ، کا فرمان ہے کہ آپ ان الزامات کی تحقیق کر لیں اور اگر یہ ثابت ہو کہ الزامات صحیح ہیں تو مناسب سزا تجویز فرمائیں۔

پہلا عالم: ملت اسلامی ہمیشہ ہمیشہ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی دین پروری کی شکر گزار رہے گی کہ ایسے شخص کو جس کی بدعتوں نے شہر میں تعفن پھیلا دیا ہے مناسب سزا دینا تجویز کی گئی ہے۔ میرے خیال میں ہم میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو ملزم کی گمراہی اور بداعمالیوں سے واقف نہیں اور اس نے جو فتنہ پیدا کیا ہے اسے دور کرنے کی ایک ہی تدبیر ہو سکتی ہے۔

دوسرا عالم: میں اس رائے سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کو جو انوکھے بھیس بنا کر اور ناقابل فہم باتیں کہہ کر عقائد میں کمزوری اور جماعت میں انتشار پیدا کرتے ہیں علمائے وقت کے سامنے پیش کرنا چاہیے ورنہ ان کا طریقہ راسخ ہو جائے گا اور لوگ سمجھیں گے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں صحیح اور جائز ہے۔ ملزم کے اقوال اور اعمال کا جہاں تک مجھے علم ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس کے متعلق جلد کوئی فیصلہ نہ کیا گیا تو شرعی احکامات کی

خلاف ورزی عام ہوسکتی ہے۔ میرے خیال میں ملزم سے سوال و جواب کے ذریعہ اس کے عقائد اور اعمال کی اصل حقیقت معلوم ہوسکتی ہے۔

اعتماد خاں: اگر آپ اجازت دیں تو میں ملزم سے سوال کروں۔

ملا ابوالقاسم: حضرات علما کو ناگوار نہ ہو تو میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں...... آپ حضرات کو معلوم ہے کہ صوفیوں کے دو فریق ہیں، سالک اور مجذوب۔ شیخ سرمد مجذوب ہیں۔ ان کا قول اور عمل دل کی ایسی کیفیتوں کو ظاہر کرتا ہے جو کسی قانون یا علم سے نسبت نہیں رکھتی ہیں۔ ان کے عقائد سوال و جواب کے ذریعہ دریافت نہیں کیے جاسکتے، کیونکہ ان کے ہر جواب کا ایک ظاہری پہلو ہوگا جس پر غور کرکے ہم فیصلہ کریں گے اور ایک جوہر یا اصل مطلب، جو ہماری توجہ سے محروم رہے گا، اس لیے کہ ہم محتسب بن کر بیٹھے ہیں، علم معرفت کے طالب نہیں ہیں۔ میرے خیال میں ہمارا طریق کار بالکل غلط ہے اور ہمارا فیصلہ عدل پر مبنی نہ ہوگا۔

دوسرا عالم: کیوں نہ ہوگا؟ اسلام میں سالک اور مجذوب اور عام مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ سب یکساں شرعی قانون کے ماتحت ہیں۔

اعتماد خاں: (ملا ابوالقاسم سے مخاطب ہو کر) پھر آپ کیا تجویز فرماتے ہیں؟

ملا ابوالقاسم: عالم کے تصورات کو دوسرے علما جانچ سکتے ہیں۔ سالک کی ہدایت اور تنبیہ دوسرے سالک کرسکتے ہیں۔ شیخ سرمد کے قول اور فعل کی تہہ تک وہی پہنچ سکتا ہے جو خود مجذوب ہو۔ ہم جو رائے قائم کریں گے وہ یقیناً غلط ہوگی۔

پہلا عالم: سبحان اللہ، کیا استدلال ہے! مجرم کے معاملے کو وہی سمجھ سکتا ہے جو خود مجرم ہو۔

اعتماد خاں: میرے خیال میں، ہم سب اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ مجذوب کا حال مجذوب ہی جان سکتا ہے۔ عریانی کی کیفیت اسی کو معلوم ہوسکتی ہے جس نے حیا اور غیرت کا جامہ اتار دیا ہو لیکن اس ملزم کے خلاف یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ دراصل مجذوب نہیں ہے، مجذوب بنا ہوا ہے۔ اس نے شاہ جہاں آباد پہنچنے کے تھوڑے ہی دن بعد دربار شاہی میں رسوخ پیدا کیا اور دارا شکوہ کو دین اور شریعت کی مخالفت پر آمادہ کیا۔ مجذوب سیاست میں

دخل نہیں دیتے، بے دینوں اور باغیوں کو کامیابی کی دعائیں نہیں دیتے، ملزم حقیقت میں مجذوب ہوتا تو اس کے معاملے میں کوئی دخل نہ دیتا۔

ملا ابوالقاسم: فردِ جرم کی جو تفصیل ابھی دی گئی ہے اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر شیخ سرمد کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے باغیوں سے ہمدردی کی تو انھیں دوسری قسم کی عدالت میں پیش کرنا چاہیے۔ ہم اس بارے میں رائے دینے کے اہل نہیں ہیں۔

شیخ سرمد: (ملا ابوالقاسم کی طرف دیکھ کر) راضی دلِ دیوانہ بہ تقدیر نشد!

اعتماد خاں: بادشاہ عالم کی خواہش ہے کہ باغی اور غدار تصوف کو بدنام نہ کرسکیں۔ اگر اس مجلس نے فیصلہ کیا کہ ملزم حقیقت میں صوفی ہے تو بادشاہ عالم اس کے جرم سے درگزر کرسکتے ہیں۔ اگر ہم کو یقین ہوگیا کہ وہ صوفی نہیں ہے بلکہ اس آزادی سے، جو صوفیوں کا حق مانی جاتی ہے، فائدہ اٹھا کر بے دینی پھیلانا چاہتا ہے تو وہ کسی لحاظ اور مروت کا مستحق نہ ہوگا۔ میرے خیال میں اب اس بحث کو ختم کرکے عزم کی طرف رجوع کرنا چاہیے...... ملزم، تمھارا نام محمد سعید اور تخلص سرمد ہے؟

شیخ سرمد: عبدالقوی، اگر تم کو اس کا بھی یقین نہیں تو مجھ کو یہاں پکڑ کر کیوں لائے ہو؟

اعتماد خاں: ہم کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ تم کون ہو، یہ سوال صرف اس لیے کیا جارہا ہے کہ قانون میں اس کی تاکید کی گئی ہے...... کیا یہ صحیح ہے کہ تم کاشان کے رہنے والے ہو، یہودی ماں باپ کی اولاد ہو اور بعد کو مسلمان ہوگئے؟

شیخ سرمد: تم کو یہ بھی معلوم ہوگا۔

اعتماد خاں: ہاں، ہم کو معلوم ہے، اور چونکہ تم اس کی تردید نہیں کرتے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری معلومات معتبر ہیں...... اب تم سے یہ دریافت کرنا ہے کہ تم سندھ کے شہر ٹھٹھ میں ابھے چند نامی ایک ہندو لڑکے پر عاشق ہوگئے تھے؟

شیخ سرمد: (کسی خیال میں)

سرمد درد دیں عجب شکستے کردی ایماں بفدائے چشم مستے کردی

باعجز و نیاز جملہ نقدِ خود را رفتی وشار بت پرستے کردی

اعتماد خاں: اسی زمانے سے تم نے برہنگی اختیار کی۔ اب ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی وجہ کیا تھی؟

شیخ سرمد: عبدالقوی، میں کیا کرتا؟ شیطان قوی ہے۔

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
اودربغل من ست ومن در طلبش دزدے عجبے برہنہ کردست مرا

پہلا عالم: یہ کیا یاوہ گوئی ہے؟ توبہ، توبہ، استغفر اللہ!

اعتماد خاں: ملزم، ادھر اُدھر کی باتیں مت کرو۔ سوال کا ٹھیک جواب دو۔

شیخ سرمد: ٹھیک جواب دوں؟

آں کس کہ ترا تاج جہاں بانی داد مارا ہمہ اسباب پریشانی داد
پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید بے عیباں را لباسِ عریانی داد

اعتماد خاں: یہ جواب فی البدیہہ نظم میں ہے۔ شاید مولانا ابوالقاسم اس کا مطلب سمجھا سکیں؟

ملا ابوالقاسم: اس کا مطلب یہ ہے کہ مجذوب کو ستانا نہیں چاہیے۔

پہلا عالم: کیا آپ کا منشا یہ ہے کہ مجذوب شرع اور اخلاق کا پابند نہیں؟

ملا ابوالقاسم: ہم اس کی پابندی اور آزادی کی حدود مقرر نہیں کر سکتے۔

پہلا عالم: چاہے وہ کسی، بہت ہی مکروہ اور مخرب اخلاق بدعت کا مرتکب ہو؟

ملا ابوالقاسم: مجذوب کا قول اور عمل سند نہیں ہوا کرتا۔ اس کے طریقے کو بدعت کہنا اس لفظ کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ مجذوب کے اصل مطلب کو معلوم کریں اور اسے اپنی اصلاح کا ذریعہ بنائیں۔ شیخ سرمد کئی سال سے شاہ جہاں آباد میں رہتے ہیں، بہت سے لوگ ان کا احترام کرتے ہیں، ان کی وضع کی تقلید کسی نے نہیں کی ہے۔

اعتماد خاں: میں نے آپ سے جو سوال کیا تھا اس کی غرض یہ تھی کہ آپ ملزم کی برہنگی کا اصل مطلب

وَاضح کر دیں تاکہ ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ اگر آپ ثابت کر دیں کہ ملزم کی بدعت ہماری شریعت سے بہتر ہے تو ہم ملزم کی مثال کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنائیں گے، اگر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ملزم کی بدعت کا مقصد اسلامی اخلاق کی بیخ کنی ہے تو ہم اسے وہ سزا دیں گے جو اسلام اور اعلیٰ اخلاق کے دشمنوں کے لیے مقرر ہے۔

ملا ابوالقاسم: میں نے اپنا مطلب جہاں تک کہ بیان ہوسکتا ہے بیان کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت کرنے سے مطلب خبط ہو جائے گا۔

اعتماد خاں: میرا خیال تھا کہ آپ ہم جیسے ناقص العقل لوگوں کو فلسفے اور اخلاق کی باریکیاں سمجھائیں گے، تاکہ ہم ایک خدار سیدہ مجذوب کے بارے میں غلط فیصلہ نہ کریں لیکن کوئی تعجب نہیں کہ آپ اس منصب سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ آپ کے پیر و مرشد نے برہنہ رہنے کی یہ وجہ بتائی ہے کہ نعوذ باللہ وہ ذات باری کی طرح بے عیب ہیں، آپ اس دعوے کی وضاحت کیا کر سکتے ہیں...... بہرحال، آپ کے بیان سے معاملے کی اصل نوعیت ظاہر ہوگئی ہے۔ ملزم کوئی جاہل یا دیوانہ نہیں ہے، اس کا عمل مجذوبوں کا سا ہے، مگر وہ عالم اور فلسفی ہونے کی شہرت رکھتا ہے۔ ہم اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ داراشکوہ کو گمراہ کرنے کا وہ کس حد تک ذمہ دار ہے، آپ نے ایک ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ ایسے لوگ بھی اس کے معتقد ہیں جن کا کام نوجوانوں کی اخلاقی تربیت ہے۔ میرے نزدیک تو ایسی مثالوں کو صفحۂ ہستی سے جس قدر جلد مٹا دیا جائے بہتر ہے۔

دوسرا عالم: نہیں، اس الزام پر تو اسے قتل کی سزا نہیں دی جاسکتی، مگر اس کو سر بازار درے مارنا چاہیے جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے، اور اپنے طریقے کو نہ چھوڑے۔

تیسرا عالم: بے شک یہی مناسب ہوگا۔

اعتماد خاں: جو رسوائی چاہتا ہے، اس کی اصلاح اس طرح نہیں کی جاسکتی کہ ہم اسے اور رسوا کریں...... مگر ہمیں سزا تو اس وقت تجویز کرنا چاہیے جب ہم پورا مقدمہ سن لیں۔ ملزم کے خلاف یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ معراج جسمانی کا منکر ہے۔ ملزم، تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟

شیخ سرمد: وہی کہتا ہوں، جو پہلے کہا تھا۔

ملا گوید کہ برفلک شد احمد سرمد گوید فلک بہ احمد درشد

پہلا عالم: یہ صریحی کفر ہے۔

تیسرا عالم: بے شک یہ عقیدہ غلط ہے مگر کفر نہیں ہے۔

دوسرا عالم: مگر اسے توبہ کرنے کا حکم تو دیا جاسکتا ہے، اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو......!

شیخ سرمد: تم جہالت سے توبہ کرو، میں علم سے توبہ کرلوں گا۔

اعتماد خاں: ہمیں اپنی جہالت کا اعتراف ہے، تم نے اپنے علم کا بھی دعویٰ کردیا۔ ملا ابوالقاسم کو البتہ افسوس ہوگا کہ انھوں نے تمھاری صفائی میں جو کچھ بیان کیا تھا وہ غلط ثابت ہورہا ہے۔ تو یہ الزام صحیح ہے کہ تم معراج بدنی کے منکر ہو؟

شیخ سرمد: میں ہر ناقص خیال کا منکر ہوں۔

اعتماد خاں: یعنی معراجِ بدنی کا عقیدہ، جس پر تمام مستند علما متفق ہیں، تمھاری رائے میں محض ایک ناقص خیال ہے؟

شیخ سرمد: میری رائے میں ہر خیال ناقص، ہر وجود ناقص ہے۔

اعتماد خاں: حضرات علما اس رائے کے نتائج پر غور فرمائیں۔

ملا ابوالقاسم: اور یہ فیصلہ کریں کہ ایسی بدیہی بات کہنے والے کو ضرور کوئی سزا دینا چاہیے۔

(اعتماد خاں جھلا کر کوئی جواب دینا چاہتا ہے، کہ اس کے پیچھے پردہ ہٹتا ہے اور ایک شخص آکر اس کے کان میں کچھ کہتا ہے)

شیخ سرمد: عبدالقوی، پردے کے پیچھے جو حکم دینے والا بیٹھا ہے اس سے کہہ دو کہ میں بھی اس سے متفق ہوں۔ اب قصہ جلد ختم ہوجانا چاہیے (ٹھنڈی سانس لے کر) سرمد، اگر او خدا است خود می آید......

(علما سب چونک پڑتے ہیں۔ اعتماد خاں کچھ گھبرا جاتا ہے)

اعتماد خاں: دنیا میں ہمارے لیے صرف یک حکم دینے والا ہے جس کی ہم سب فرماں برداری کرتے ہیں۔ تم اس کی عدالت میں پیش کیے گئے ہو، جس کے ابدی قوانین کی تم نے خلاف

ورزی کی ہے۔ علما کی جماعت ایسی جماعت نہیں ہے جو وقتی حالات سے اثر لے، ہماری رائے اور ہمارے فتوے اس دین کے مطابق ہوتے ہیں جو قیامت تک ہدایت کا سرچشمہ اور زندگی کی اساس رہے گا۔ ہم تم سے بحث نہیں کرنا چاہتے، تم نے جو قانون شکنی کی ہے اس کی تم سے تصدیق کرانا چاہتے ہیں۔ تم پر اب تک جو الزامات لگائے گئے ہیں ان کو تم نے صحیح تسلیم کرلیا ہے، بس ایک معاملہ ہے جس میں تحقیق کرنا باقی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ تم کلمۂ طیبہ پڑھنے سے انکار کرتے ہو؟

(شیخ سرمد کوئی جواب نہیں دیتے، معلوم ہوتا ہے نشے میں جھوم رہے ہیں)

اعتماد خاں: کیوں، تم جواب کیوں نہیں دیتے؟

پہلا عالم: (جوش کے ساتھ) ملزم، تم سے کلمہ پڑھنے کو کہا گیا ہے۔

دوسرا عالم: کلمہ پڑھو، کلمہ!

شیخ سرمد: (کچھ دیر خاموش رہتے ہیں، پھر سر اٹھا کر کہتے ہیں) لاالٰہ۔

(خاموشی۔ علما سب منتظر معلوم ہوتے ہیں)

پہلا عالم: کیوں پورا کلمہ کیوں نہیں پڑھتے؟

شیخ سرمد: میں ابھی نفی کی منزل سے نہیں گزرا ہوں۔ پورا کلمہ کیسے پڑھوں؟

دوسرا عالم: یہ نفی کی منزل کیا بلا ہے؟ کلمہ طیبہ کو پڑھنے نہ پڑھنے سے اس کو کیا مطلب؟

ملا ابوالقاسم: شیخ سرمد کا منشا یہ ظاہر کرنا ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھنا ایمان لانے کی نشانی ہے۔ ایمان کے لیے صداقت شرط ہے، اور یہ صداقت رسمی طور پر کلمہ پڑھ لینے سے پیدا نہیں ہوتی۔

اعتماد خاں: اور ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خود کلمہ پڑھنے سے انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو انکار کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔

ملا ابوالقاسم: ہم کو شیخ سرمد کی فرد جرم سنائی گئی تھی تو اس میں بیان کیا گیا تھا کہ ان کا نام محمد سعید ہے اور لوگوں کی روایت ہے کہ یہ کاشان کے یہودی ہیں جو مسلمان ہو گئے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو یہ کلمہ پڑھ چکے ہیں اور اس وقت ان کا یہ فرمانا کہ وہ نفی کی منزل سے نہیں گزرے ہیں، صرف لوگوں کو اس کی دعوت دینا ہے کہ وہ بھی اپنے خلوص اور صداقت کو جانچیں۔

اگر یہ روایت صحیح ہے کہ شیخ سرمد مسلمان ہیں تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ ہم ان کا مقدمہ سننے کے مجاز ہیں یا نہیں۔

اعتماد خاں: ملزم، تمھارا اس بارے میں کیا بیان ہے؟

شیخ سرمد: لا إلٰہ۔

اعتماد خاں: یہ کوئی جواب نہیں ہے۔

شیخ سرمد: میں اس سے زیادہ کچھ کہوں گا تو جھوٹ ہوگا۔

اعتماد خاں: گویا پورا کلمہ پڑھنا جھوٹ ہوگا؟

(شیخ سرمد کوئی جواب نہیں دیتے۔)

پہلا عالم: بس۔ اب ہم کافی سن چکے۔ میری رائے میں ملزم سے ایک مرتبہ اور کلمہ پڑھنے کو کہا جائے۔ اگر وہ انکار کرے تو واجب القتل ہے۔

کئی عالم: (ایک ساتھ) بے شک، اگر وہ پھر انکار کرے تو واجب القتل ہے۔

اعتماد خاں: ملزم، تم سے ایک مرتبہ اور کہا جاتا ہے۔ کلمہ پڑھو۔

شیخ سرمد: (ملا ابوالقاسم سے) بتاؤ ملا، جب سچ بولے سے پیا ملے تو سچ بولوں کہ جھوٹ؟

(ملا ابوالقاسم سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں، کوئی جواب نہیں دیتے۔)

اعتماد خاں: ملزم، تم سے جو سوال کیا گیا تھا اس کا جواب دو۔

شیخ سرمد: لا إلٰہ۔

پہلا عالم: ملزم واجب القتل ہے۔

کئی عالم: (ایک ساتھ) بے شک واجب القتل ہے۔

اعتماد خاں: ملزم، ہم نے ان تمام الزامات پر غور کیا ہے جو تم پر لگائے گئے ہیں۔ تم اپنے آپ کو کسی الزام سے بری نہیں کر سکے ہو۔ تمھارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ تم کلمہ پڑھنے سے انکار کرتے ہو، اور ہماری رائے میں اس بنا پر تم واجب القتل ہو۔ (علما کی طرف دیکھ کر) میری رائے میں ہم سب اس فیصلہ پر متفق ہیں۔

(تمام علما سر ہلاتے ہیں۔)

ملا ابوالقاسم: حضرات علما! میں آپ سے پھر درخواست کروں گا کہ ذرا تامل فرمائیں۔ شیخ سرمد ایک مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ ان کے عمل میں جو بدعتیں نظر آتی ہیں، ان کے مرتکب بہت سے مجذوب ہیں جن کی کوئی گرفت نہیں کی جاتی ہے، اور مناسب بھی یہی ہے کہ ہم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ شیخ سرمد کے عقائد اور اقوال سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ راسخ العقیدہ ہیں، مگر وہ کسی کو چھیڑتے یا جھٹلاتے نہیں ہیں اور ان سے کسی قسم کے فتنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ وہ صرف بعض حقائق کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ملت کے لوگ اپنے عقائد اور اعمال پر غور کریں اور ان کی عقل اخلاقی اور دینی مسائل پر حاوی، ان کا باطن صاف اور عقیدہ پختہ ہو۔ میں ڈرتا ہوں کہ ہم نے شیخ سرمد کے معاملے پر جس صورت سے غور کیا ہے اور جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس پر شبہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا مقصد دین کی خدمت کرنا نہ تھا بلکہ سیاست میں یکسوئی پیدا کرنا۔ یہ مقصد ایسا نہیں ہے کہ جس کی خاطر دینی احتساب کے فریضہ کو بدنام کیا جائے۔ ہم جو فیصلہ کریں گے۔ اس سے ایک نظیر ہو جائے گی، اور اس سے بہت سے بے گناہوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اعتماد خاں: حضرات علما اس نکتہ پر غور فرمالیں۔ ملا ابوالقاسم کی رائے معلوم ہوتی ہے کہ ہم بادشاہ عالم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک بے گناہ پر ظلم کر رہے ہیں۔

کئی عالم: یہ ایک صریح تہمت ہے۔ ہم نے کوئی بات عدل وانصاف کے خلاف نہیں کی ہے۔ جو شخص مسلمان ہو اور کلمہ طیبہ پڑھنے سے انکار کرے وہ واجب القتل ہے۔ ہم اس کے لیے ہزار ہا سندیں پیش کر سکتے ہیں۔

اعتماد خاں: میرے خیال میں اب حضرات علما کی رائے لی جاسکتی ہے۔ میں فیصلہ لکھ لیتا ہوں۔ جو حضرات اس سے متفق ہوں وہ اس پر دستخط فرمادیں۔ جو اس سے اتفاق نہ کرتے ہوں وہ اپنی رائے درج فرمادیں۔

(اعتماد خاں ایک کاغذ پر جلد جلد کچھ لکھتا ہے اور اس کے بعد کاغذ اس عالم کو جو اس کے دائیں طرف بیٹھا ہے، دے دیتا ہے۔ اس طرف جتنے عالم بیٹھے

ہیں وہ اس پر دستخط کر دیتے ہیں۔ آخر میں کاغذ ملا ابوالقاسم کو دیا جاتا ہے۔
وہ اسے لینے سے انکار کرتے ہیں)

ملا ابوالقاسم: مجھے جناب صدرالصدور اور محتسب شاہی اعتماد خاں عبدالقوی نے جب فرمان شاہی دکھایا تھا اور علما کی اس مجلس میں شریک ہونے کا حکم دیا تھا اسی وقت میں نے عرض کیا تھا کہ میں اس مجلس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ جناب صدرالصدور نے فرمایا کہ اگر اتنی ہمت ہو تو عدالت میں آ جاؤ اور شیخ سرمد کی حمایت کرو، اس لیے میں حاضر ہو گیا۔ مجھے اس عدالت کی کارروائی میں شریک نہ سمجھا جائے۔ میں فیصلہ کے متعلق کوئی رائے بھی نہیں لکھوں گا اس لیے کہ میں اس عدالت کو اس معاملے پر غور کرنے اور فیصلہ صادر کرنے کا مجاز نہیں سمجھتا۔

اعتماد خاں: اگر آپ میں ہمت ہو تو یہ سب بھی کاغذ پر لکھ دیجیے۔

ملا ابوالقاسم: آپ جہاں اس کاغذ کو پیش کریں وہاں میرے اعتراض کو بھی بیان فرما دیجیے گا۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ میں نے جو کچھ یہاں عرض کیا ہے وہ حضرات علما نے سن لیا ہے اور وہ اس کی شہادت دے سکیں گے۔ میں کاغذ پر کچھ نہ لکھوں تو آپ کو میرا معاملہ پیش کرتے وقت زیادہ آزادی رہے گی۔

اعتماد خاں: (غصہ میں) بہت مناسب ہے۔ کاغذ دوسری طرف دے دیجیے۔

ملا ابوالقاسم: میں اس کاغذ کو ہاتھ لگانا نہیں چاہتا!

(اعتماد خاں اشارہ کرتا ہے، اس کے دائیں طرف کے عالم کاغذ کو دست بدست اسے واپس کر دیتے ہیں اور وہ اسے بائیں طرف کے علما کو دیتا ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے اس پر دستخط کرتے ہیں، اور پھر وہ اعتماد خاں کو واپس دے دیا جاتا ہے۔ اعتماد خاں اسے دیکھ کر ایک کپڑے میں لپیٹ لیتا ہے)

اعتماد خاں: (ایک سپاہی کو مخاطب کر کے) داروغہ، ملزم کو قید خانہ واپس لے جاؤ اور حکم کے منتظر رہو۔

(شیخ سرمد جانے کے لیے مڑتے ہیں تو ان کے چہرے سے انتہائی مسرت ظاہر ہوتی ہے اور وہ ملا ابوالقاسم کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں...... ملا

ابوالقاسم ان کی طرف بڑھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے قدموں پر گر پڑیں، مگر ایک سپاہی ان کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ بے بسی کے عالم میں گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں)

شیخ سرمد: ملا یاد رکھو عاشق وہی ہوتا ہے جو معشوق کی ہر ادا پر جان دے۔

(سپاہی شیخ سرمد کو باہر لے جاتے ہیں۔)

اعتماد خاں: حضرات علما اب ہمارا کام ختم ہو گیا۔ میں بادشاہ عالم کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ملت اسلامی کو کفر نما بدعتوں سے پاک کرنے میں اعانت فرمائی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ دربار میں حاضر ہوں گے تو بادشاہ عالم اپنی زبان مبارک سے آپ کی حق پرستی کی تعریف فرمائیں گے اور مناسب الطاف و اکرام سے سرفراز فرمائیں گے۔

(علما ایک ایک کر کے باہر چلے جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد اعتماد خاں اپنی جگہ سے اٹھ کر ملا ابوالقاسم کی طرف آتا ہے۔ ایک بارگی پیچھے سے آواز آتی ہے 'باادب باملاحظہ ہوشیار' اور اورنگ زیب اس طرف سے آتا ہے جہاں پردہ لٹکا ہے اور چاہتا ہے کہ کورنش بجالائے، مگر اورنگ زیب اسے اشارہ کرتا ہے کہ باہر چلے جاؤ۔ وہ بادشاہ کی طرف جھک کر الٹے قدموں باہر جاتا ہے۔ اورنگ زیب کچھ دیر کھڑا ملا ابوالقاسم کو دیکھتا رہتا ہے)

اعتماد خاں: ملا، ہوش میں آؤ، اب تماشا ختم ہو گیا۔

(ملا ابوالقاسم آہستہ آہستہ سر اٹھاتے ہیں اور منہ پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے ہیں، مگر خوف سے نہیں۔ وہ اورنگ زیب کی طرف دیکھتے ہیں اور تعظیم کے خیال سے کھڑے ہونا چاہتے ہیں مگر کھڑے نہیں ہو پاتے)

ملا ابوالقاسم: تماشا ختم نہیں ہوا، ابھی صرف اس کی خبر آئی ہے۔ تماشا اس وقت شروع ہوگا جب موحد کا خون رنگ لائے گا۔ تب نہ علما کام آئیں گے نہ بادشاہ کی تلوار۔

اورنگ زیب: میں نے کہا ہے ہوش میں آؤ۔ ایک مجذوب کافی دردِسر پیدا کر چکا ہے۔

(ملا ابوالقاسم سر جھکا لیتے ہیں اور کوئی جواب نہیں دیتے)

اورنگ زیب: تمھارے جیسے عالم کے شایانِ شان نہیں کہ وہ بازار کی افواہوں اور جاہلوں کی بے سروپا باتوں پر اعتبار کرے اور ملت کی اعلیٰ مصلحتوں کو نظر انداز کرے۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہمیں شریعت اور طریقت کا علم نہیں، اور ہم حق اور باطل میں تمیز نہیں کر سکتے؟ کیا موحد وہی ہے جو ننگا پھرے اور بادشاہ عادل وہی ہے جو مجذوبوں اور خبطیوں کے قدموں پر گرے؟ سرمد کے معاملے میں تم نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ مجھے شروع سے آخر تک سب معلوم ہے۔ مجھے بہت صدمہ ہے کہ تمھارے جیسا صاحبِ دل اور حق پرست میرے خلاف ہے اور جتنے زمانہ ساز علما ہیں وہ میرے اشاروں پر چلتے ہیں۔ اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اس سے میں درگزر کرتا ہوں۔ مگر اب تمھیں چاہیے کہ ملت اور حکومت کی خدمت کا حق ادا کرو۔

ملا ابوالقاسم: آپ کی خواہش ہے کہ میں خدمت کا حق ادا کروں، تو حکم دیجیے کہ شیخ سرمد سے پہلے میری گردن ماری جائے۔

اورنگ زیب: میں مجذوب کی بَڑ سننا نہیں چاہتا۔ تم سے کہہ چکا ہوں کہ ہوش میں آؤ اور دین اور حکومت کے معاملات کو سمجھو...... یہ سمجھو کہ اگر ملت اور حکومت کے لیے ضروری نہ ہوتا کہ میں تاج وتخت حاصل کروں تو میں کبھی خانہ جنگی کو گوارا نہ کرتا۔ اگر میں یہ نہ جانتا ہوتا کہ دارا کو قتل کیے بغیر فساد دور نہیں کیا جا سکتا تو میں ہرگز اسے قتل نہ کراتا۔ ممکن ہے شیخ سرمد ویسے ہی بزرگ اور موحد ہوں جیسے کہ تم انھیں مانتے ہو، مگر میں انھیں اس کی اجازت کیسے دے سکتا تھا کہ وہ میری رعایا کو میرے خلاف برانگیختہ کریں اور اس کے دل میں میری عزت نہ رہے۔ اگر یہ مصلحتیں اس وقت تمھاری سمجھ میں نہیں آتی ہیں، تو تمھیں صبر کرنا چاہیے اور اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ جو مقاصد ان کی پشت پر ہیں وہ حاصل ہو جائیں۔

ملا ابوالقاسم: میں یہ کیسے مان لوں کہ جسے حکومت کا اختیار مل جائے وہ عالم غیب ہو جاتا ہے، جس کے

ہاتھ میں تلوار ہو وہ منصف ازلی بن سکتا ہے۔ ملت اسلامی کی اساس اور اس کی نشانی اخوت ہے، حاکموں کی مصلحت نہیں۔

اورنگ زیب: یہ باتیں سب تم نے کتابوں میں پڑھی ہیں، دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی تمھیں خبر نہیں۔ لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ خانہ جنگی کا سبب میری الوالعزمی تھی، میں نے صرف بادشاہ بننے کی خاطر اپنے مسلمان بھائیوں کا خون بہایا ہے اور میری حکومت کامیاب ہوئی تب بھی کہا جائے گا کہ باطل نے حق پر فتح پائی تو لو، یہ تلوار لو، اور ظلم اور استبداد کی جڑ کاٹ دو۔

(تلوار میان سے نکال کر ملا ابوالقاسم کے آگے پھینک دیتا ہے۔ ملا ابوالقاسم ساکت بیٹھے رہتے ہیں۔)

اورنگ زیب: اگر تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ مجھے قتل کرو، تو میرے ساتھ میدان میں آؤ، فتنوں کو قابو میں کرو، نادانوں کو مصلحت کے راز سمجھاؤ استعداد والوں کو اتحاد اور خدمت پر آمادہ رکھو۔ حق صرف کتابوں میں نہیں ہے، سیاسی قوت میں بھی ہے، جس کے بغیر ملت اسلامی غالب نہیں رہ سکتی......

(اورنگ زیب جواب کا منتظر معلوم ہوتا ہے۔ ملا ابوالقاسم کوئی جواب نہیں دیتے)

اورنگ زیب: میں دیکھتا ہوں کہ اپنے جیسے اور عالموں کی طرح تم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، اور زندگی تمھارے فیصلوں کا پہلے انتظار کر سکتی تھی نہ اب کر سکتی ہے......تم جہاں اور سب سوچتے ہو وہاں اس پر بھی غور کرو کہ تمھاری اس لیت ولعل سے کتنا نقصان پہنچتا ہے، اور ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو جلد فیصلہ کر کے غلطیوں کی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لیں تو ملت کا کیا حشر ہوگا......بس، اب میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ اب اٹھو، اور یا تو مجھے قتل کر دو یا میری تلوار مجھے واپس دو، کہ میں اپنا کام کر سکوں۔ مجھے سب کچھ گوارا ہے، مگر تمھاری جیسی عاجزی اور بے بسی گوارا نہیں۔

(ملا ابوالقاسم کوئی جواب نہیں دیتے۔ اورنگ زیب کچھ دیر منتظر رہتا ہے۔
پھر کسی قدر حقارت کے ساتھ مسکرا کر اور 'دیوانہ' کہہ کر آہستہ آہستہ اسی
دروازے سے باہر چلا جاتا ہے۔ جس سے داخل ہوا تھا۔ تلوار ملا ابوالقاسم
کے سامنے پڑی رہتی ہے)

(پردہ)

پانچواں ایکٹ

(ملا ابوالقاسم کا مدرسہ۔ لطف اللہ، حفظ الرحمن، سعیدالدین اور چار اور نوجوان خاموش سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ملا ابوالقاسم آہستہ آہستہ اندر آتے ہیں۔ وہ ایک ہاتھ سے لکڑی کا سہارا لیتے ہیں، دوسرا ابراہیم بدخشانی کے کندھے پر ہے۔ بہت کمزور اور نڈھال معلوم ہوتے ہیں۔ طالب علم انھیں دیکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور السلام علیکم کہتے ہیں۔)

ملا ابوالقاسم: (کمرے کے بیچ میں پہنچ کر) تم لوگ یہاں کیوں ہو؟ اپنے گھروں کو کیوں نہیں گئے؟

لطف اللہ: ہمارا مقام آپ کے قدموں پر ہے۔

(ابوالقاسم جہاں کھڑے ہیں وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک طالب علم گاؤ تکیہ لا کر ان کے پیچھے رکھ دیتا ہے۔)

(خاموشی)

ملا ابوالقاسم: اچھا، پھر آؤ، سب مل کر مجھے گھیر کر بیٹھ جاؤ۔ میں اپنی عمر میں کبھی اتنا عاجز اور بے بس نہ

تھا...... شیخ سرمد کی گردن تعصب کی تلوار کے نیچے تھی، میں انھیں بچا نہ سکا۔ سیاست کی تلوار میرے سامنے چمکی، میں اس سے نظر نہ ملا سکا...... اب مجھ میں جان نہیں رہی...... دل کو سردی لگ رہی ہے...... کیا کروں گا، کیسے جیوں گا؟

(خاموشی)

لطف اللہ: مگر مولانا، آپ تو جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔

ملا ابوالقاسم: ہاں، اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ پھر بھی صدمہ بہت ہوا...... ایک پرند جو دوسرے کو آزاد کرنا چاہتا ہے اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے کہ جال میں اپنی گردن پھنسا دے۔ صیاد کی نظرِ انتخاب کو کیا کروں، ایک کو پکڑا، ایک کو چھوڑ دیا۔ اب میں تڑپ رہا ہوں اور اپنی آزادی کو رو رہا ہوں۔

(خاموشی)

سعید الدین: مولانا، جب سے خانہ جنگی شروع ہوئی، آپ فرماتے رہے کہ اب بڑی سخت آزمائش کا وقت آ گیا ہے۔ جب شاہ جہاں آباد میں فرقہ بندی شروع ہوئی تو آپ انتہائی ہمت اور استقلال کے ساتھ فرقہ بندی کی مخالفت کرتے رہے۔ لڑائی ختم ہوئی تو آپ اس تعصب اور تنگ دلی کی مذمت کرتے رہے جو خانہ جنگی نے پیدا کی تھی۔ آج آپ نے عدالت میں شیخ سرمد کی حمایت کی، اگرچہ آپ کو معلوم تھا کہ بادشاہ عالم نے شیخ سرمد کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے خیال میں آپ نے جہاد کا حق پورا پورا ادا کر دیا ہے۔ کامیابی تو بہر حال خدا کے ہاتھ میں ہے۔

ملا ابوالقاسم: اس طرح تسلی دینے سے دل بہت چھوٹا ہو جاتا ہے۔ جہاد کا حق ادا کرنے کے لیے بہت بڑا دل چاہیے، جیسے کہ شیخ سرمد کا ہے۔

حفظ الرحمٰن: مگر شیخ سرمد پر تو ان کے مخالف یہ الزام لگاتے ہیں کہ خانہ جنگی میں وہ ایک فریق کے طرفدار ہو گئے۔

ملا ابوالقاسم: شیخ سرمد کا دل اتنا بڑا ہے کہ وہ اپنے اوپر الزام بھی لے سکتے ہیں۔ وہ ایسے موحد ہیں کہ

کلمہ پڑھنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ ہم اس منزل سے بہت دور ہیں۔ ہمیں تقدیر پر بھروسا نہیں ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہم سے کوئی غلطی نہ ہو، ہماری تدبیریں سلامت روی کی پابند، ہمارے دل مصلحتوں میں گرفتار ہیں۔ اس وقت میں سوچ رہا ہوں کہ ملت اسلامی میں ایک نئی وحدت پیدا کرنا بہت بڑا کام ہے۔ میں اس کام کو انجام دینے کا اہل نہیں ہوں، اور میرے پاس وسائل بھی نہیں ہیں۔ شیخ سرمد نے نئی زندگی کی تعمیر کے لیے مسالا فراہم کر دیا ہے، ہم بنانا چاہیں تو اس سے بہت کچھ بنا سکتے ہیں۔ ہم میں توفیق نہ ہو اور مسالا ضائع ہو جائے تو اس میں شیخ سرمد کا کوئی نقصان نہیں۔

(ایک اجنبی داخل ہوتا ہے)

اجنبی: (ملا ابوالقاسم اور ان کے شاگردوں کو دیکھ کر) ابھی خبر آئی ہے کہ شیخ سرمد کو قتل گاہ کی طرف لیے جا رہے ہیں، آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب جانا چاہیں تو جلدی کریں۔

(اجنبی چلا جاتا ہے۔ خاموشی۔ ملا ابوالقاسم سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ گویا قتل گاہ کا نظارہ کر رہے ہیں)

ملا ابوالقاسم: شیخ سرمد کو کوئی لیے نہیں جا رہا ہے، وہ خود جا رہے ہیں۔ سپاہی زنجیروں کو کھینچ کھینچ کر انھیں روکتے ہیں، مگر ان کا شوق زنجیروں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ انھیں اس کا دکھ نہیں ہے کہ لوگ ان کے حال پر روتے ہیں، کوئی ان کی مدد نہیں کرتا، وہ کسی کی ہمدردی کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی نظر بس جلاد کی تلوار پر ہے اور اپنے قتل پر، اس سے زیادہ انھیں کوئی نہیں دے سکتا۔ اس سے کم وہ لیں گے نہیں...... دیکھو، جان کا سودا کر کے وہ کیسے خوش ہیں! جلاد نے تلوار چمکائی ہے، وہ مسکراتے ہیں۔ اسے بلاتے ہیں، ہنس کر کہتے ہیں، فدائے تو شوم، بیا بیا کہ بہر صورتے کہ می آئی ترا خوب می شناسم! لو اب جلاد کیا کر سکتا ہے، انھوں نے گردن جھکا دی ہے۔ اب سر جدا ہو گیا...... دیکھو، چہرے پر وہی خوشی کا رنگ وہی مسکراہٹ ہے۔ ہونٹ چپکے چپکے ہل رہے ہیں...... لا الہ الا اللہ...... ہاں، ہاں، میں تو جانتا تھا کہ یہ جان دے کر ہی کلمہ پڑھیں گے، اس سے کم کرنا ان کی عاشقی کی

شان کے خلاف تھا......مگر۔ہائے ہائے، یہ کیا،ان کا بدن تڑپ کر کھڑا ہو گیا،ایک ہاتھ نے سر کو اٹھالیا......(کانپتے ہوئے کھڑے ہو کر) آقا،مرشد،محبوب، یہ کیا؟ یہ کون سی ادا ہے؟......(دبی اور بھرآئی ہوئی آواز میں) ایک فقیر اچانک مجمع سے نکلا ہے۔ کہتا ہے،سرمد،بس!!......اب سر الگ گر گیا ہے،دھڑ الگ۔دونوں پر موت طاری ہے......انا للّٰہ وانا الیہ راجعون......

(ملا ابوالقاسم کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں،سر سینے پر گر جاتا ہے،پھر وہ آہستہ آہستہ ایک طرف کو گرنے لگتے ہیں۔اس دوران میں ان کے شاگردوں کی پریشانی بڑھتی رہتی ہے، اب وہ انھیں سنبھال لیتے ہیں اور آرام سے لٹا دیتے ہیں،ایک پنکھا جھلنے لگتا ہے،ایک منہ پر پانی کے چھینٹے دیتا ہے۔ ایک پیر دابنے لگتا ہے)

لطف اللہ:ابراہیم صاحب،میں کسی حکیم کو بلا لاؤں؟

ابراہیم بدخشانی:(ذرا سوچ کر) نہیں،حکیم کیا کرے گا۔

(ملا ابوالقاسم تھوڑی دیر تک بے ہوشی کی سی حالت میں پڑے رہتے ہیں۔ پھر وہ چونکتے ہیں اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ابراہیم بدخشانی جلدی سے ان کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور ان کا سر اپنے کندھوں پر رکھ لیتا ہے)

ملا ابوالقاسم:(بہت کمزور آواز میں رک رک کر) انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

(ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھک لیتے ہیں۔لطف اللہ ایک کٹورے میں پانی پیش کرتا ہے۔ملا ابوالقاسم ایک ایک گھونٹ پیتے ہیں،پھر کٹورا اسے دے دیتے ہیں اور منہ پر ہاتھ پھیرتے ہیں)

حفظ الرحمٰن:اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

ملا ابوالقاسم:تمھاری نظر ہر وقت مجھ پر رہتی ہے، یہ اچھا نہیں ہے۔اب مجھے بھول جاؤ؟ اپنی توفیق پر بھروسا کرو،اور شیخ سرمد کی مثال کو اپنا رہنما بناؤ۔

لطف اللہ: مولانا اب ہماری آرزو یہ ہے کہ آپ ہماری توفیق کو آزمائیں، ہم میں سے جو ناقص ہوں انھیں الگ کردیں، جو کام کے ہوں انھیں اپنی ہدایت سے سرفراز فرمائیں۔

(خاموشی)

ابراہیم بدخشانی: ہم میں سے جو فارغ ہونے والے ہیں وہ اکثر ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے ہیں کہ انھیں خدمت کا کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے میں آپ سے موقع بے موقع پوچھتا رہتا ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، مگر آپ کے کسی جواب سے یہ معلوم نہ ہوا کہ آپ کی اپنی خواہش کیا ہے۔ کبھی آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنی الگ الگ طبیعتیں لے کر آئے ہو۔ میں یہ کیسے حکم دے دوں کہ تم سب فلاں کام کرو۔ کبھی آپ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں کو اپنی کسی رائے یا خواہش کا پابند کرنا نہیں چاہتا۔ کبھی آپ نے نصیحت فرمائی کہ حق پر اور صبر پر متفق رہو اور سمجھو کہ قرآن پاک کا وعدہ ہے کہ تم نقصان میں نہ رہو گے۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ ہم آٹھ دس نوجوان برسوں سے ساتھ پڑھ رہے ہیں، کیا اچھا ہو اگر ہماری جمعیت قائم رہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جمعیت کو قائم رکھنے کے لیے محبت فی اللہ سے بہتر کوئی رشتہ نہیں۔

ملا ابوالقاسم: (ذرا دیر خاموش رہ کر) تم صرف میرا جی بہلانا چاہتے ہو...... اس وقت میرا دوست وہ ہے جو میرے زخموں پر نمک چھڑکے، مجھے درد سے تڑپائے، میرے جسم سے جان کو کھینچ کر نکال لے، جیسے شکاری مچھلی کے حلق سے کانٹا نکالتا ہے۔

لطف اللہ: ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نااہلی کے خیال سے آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ اسی وجہ سے اس وقت اس کا ذکر چھیڑا ہے۔

حفظ الرحمٰن: جی ہاں، مولانا! خانہ جنگی کے دوران میں ہم سب دیکھتے رہے کہ آپ کو کتنا صدمہ ہے، ایک دوسرے سے کہتے رہے کہ ہمیں اس روشن خیالی کا حق ادا کرنا چاہیے، جو ہمیں آپ کی بدولت حاصل ہوئی ہے، مگر کسی نے کچھ کیا نہیں۔ ہم ایسی باتیں سنتے تھے جن سے

دل کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، مگر کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ کبھی اس خیال سے کہ ہم چھوٹے ہیں، ہمیں بڑوں سے حجت نہ کرنا چاہیے، کبھی اس ڈر سے کہ ہمارا مطلب کوئی نہ سمجھے گا اور ہم خواہ مخواہ جھگڑے میں پھنس جائیں گے۔

ملا ابوالقاسم: ہاں، مگر میں جانتا ہوں کہ اگر میں کہہ دیتا تو تم سب جان دینے کو تیار ہو جاتے۔ تم حق کے لیے لڑنے کی عزت سے محروم رہے تو اس میں اصل قصور میرا ہے۔

ابراہیم بدخشانی: اس زمانے میں ہمارے سامنے دو مثالیں تھیں، ایک شیخ سرمد کی، ایک آپ کی۔ شیخ سرمد کا طریقہ آپ نے ہم کو سمجھایا، ورنہ شاید ہم بھی ان گمراہوں میں ہوتے جو انھیں صرف داراشکوہ کا طرفدار اور بادشاہ عالم کا مخالف سمجھتے ہیں۔ آپ کا طریقہ ہماری اپنی طبیعتوں سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، ہم اسی کی طرف مائل رہے۔

ملا ابوالقاسم: (بیٹھ کر) لیکن اس کا یقین رکھو کہ یہ دونوں طریقے ایک ہیں۔ میرا تم پر جو حق ہے اس سے کہیں زیادہ حق شیخ سرمد کا ہے۔ تمھارا اپنا طریقہ کوئی بھی ہو، تمھیں اس انجام کے لیے تیار رہنا چاہیے جو شیخ سرمد کا ہوا۔ اس لیے نہیں کہ تم شہادت کا شرف حاصل کرو، بلکہ اس لیے کہ جماعت میں نئی روح اسی طرح پھونکی جاتی ہے۔ ایک زندگی حق اور باطل کی جنگ کا میدان ہے، دوسری اور اس سے کہیں اعلیٰ زندگی وہ ہے جہاں حق کو حق کی طلب ہوتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا...... دعا کرو کہ عمر بھر کی کوششوں کے بدلے تمھیں اس زندگی کا تصور نصیب ہو جائے اور تم ان طبیعتوں میں جنھیں خانہ جنگی نے بگاڑ دیا ہے، ایک نئی دنیا بنانے کی آرزو پیدا کر سکو...... (گھبرا کر اٹھتے ہیں) چلو، چلو، شیخ سرمد کے جنازہ کی نماز ادا ہونے والی ہے۔ اس میں شریک ہونا چاہیے...... آج یہی اصل نماز ہے۔

(پردہ)

حبہ خاتون

پیش لفظ

یہ ڈراما حبہ خاتون اس سوانح عمری کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے جسے مولانا مجبور صاحب نے حال ہی میں مرتب فرمایا ہے۔ ڈراما لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ حبہ خاتون کی شخصیت کا اندازہ ہو جائے۔ اس میں صرف چند واقعات لیے گئے ہیں جو میرے خیال میں مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور وہ اہم اور غیر اہم باتیں جو ڈرامے کا موضوع نہیں ہیں یا نہیں بنائی جا سکتی تھیں، سب چھوڑ دی گئی ہیں۔ واقعات کی ترتیب میں تاریخی سلسلے کی پابندی سے زیادہ ضروری یہ سمجھا گیا ہے کہ ان کا معنوی پہلو واضح ہو جائے۔

ہندوستانی تہذیب میں عورت کا ایک خاص منصب مقرر کر دیا گیا ہے اور شخصیت کے خاکے اسی کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ حبہ خاتون اس لحاظ سے نمونے کی شخصیت نہیں تھی۔ سماجی قاعدوں اور زندگی کے حادثوں کے باوجود اس کی طبیعت آمادی کے ساتھ نشو و نما پاتی رہی۔ اس لیے کہ اس میں نمو کی بڑی قوت تھی۔ اگر وہ ملکہ نہ بن جاتی تو کسی خانقاہ کی زینت ہوتی۔ محل میں رہنے سے اس کے اندر ایک سیاسی شعور پیدا ہو گیا جو صرف اس کے زمانے کے لحاظ سے قابل قدر نہیں ہے بلکہ ہر زمانے میں بہت کمیاب ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس ڈرامے سے ظاہر ہوتا ہے، میرا اندازہ یہ ہے کہ

حبہ خاتون کے سیاسی خیالات تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔اس کی نظر میں مدی قدریں نہیں تھیں بلکہ وہ انسانیت جس کو پیدا کرنا مذہب، اخلاق، سیاست، سب کا مقصد ہونا چاہیے۔اس طرح انسان زندگی کی بنیادی قدر بن جاتا ہے اور زندگی کے ہر میدان میں ایسا رویہ اختیار کرنا لازمی ہو جاتا ہے جس سے انسانیت کو ترقی ہو۔کشمیر کی آزادی حبہ خاتون کے لیے انسان کی آزادی کی مثال ہوگی۔ یہ آزادی وہ منزل ہے جہاں اسی کو پہنچنا نصیب ہوسکتا ہے جو اسے اپنے مقام سے بہت دور سمجھتا رہے۔

حبہ خاتون، اکبر کی ہم عصر تھی۔ ہمیں اس کی پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں۔اس کی وفات اکبر کے ایک سال بعد ہوئی۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے لیے یہ ترقی کا زمانہ تھا۔صوبائی اور مقامی حکومتوں کے لیے زوال کا۔انھیں میں سے کشمیر کی حکومت تھی۔ یہاں مذہبی تعصب، سیاسی بے شعوری اور طبیعتوں کی انتہا پسندی کی وجہ سے ایک کیفیت پیدا ہوگئی تھی جس کا کوئی علاج سمجھ میں نہ آتا تھا۔حبہ خاتون کی حسین شخصیت اس کے گیتوں اور اس کے علم معرفت کی قدر اس وجہ سے ذرا بھی کم نہیں ہوتی کہ بالآخر کشمیر پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔شخصیتوں کے پیدا ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔عام طور سے وہ ایسے دور میں پیدا ہوتی ہیں جب جماعتی زندگی کسی بڑی مشکل میں ہوتی ہے۔ ایسے مرحلے طے نہیں ہو سکتے جب تک کہ پرانی قدروں کو ایک نئی شکل نہ دی جائے اور شخصیتوں کا منصب یہ ہوتا ہے کہ پرانے معیاروں کے قالب میں نئے مقاصد کی جان ڈالنے کی جیتی جاگتی مثال بنیں۔یہ لازمی نہیں ہے کہ نئے مقاصد اخلاقی اعتبار سے اعلیٰ ہوں۔ہٹلر اور مسولینی اپنے اقتدار اور اثر کے لحاظ سے شخصیتیں کہلانے کے مستحق ہیں۔

جو مقاصد ان کی نظر میں تھے ان کو انھوں نے قومی زندگی پر بالکل حاوی کر دیا لیکن اخلاق اور انسانیت کے اعتبار سے ان مقاصد کی کوئی خاص وقعت نہیں اور انھیں حاصل کرنے کی جو تدبیریں اختیار کی گئیں ان سے دنیا کو خاصا صدمہ پہنچا۔شخصیت کو جانچنے کا صحیح معیار یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ وہ اپنے آپ کو کیسے مقاصد کا خادم بناتی ہے اور انھیں حاصل کرنے کے لیے کیسے وسائل منتخب کرتی ہے۔صحیح مقاصد کو صحیح اخلاقی طریقوں سے حاصل کرنا شخصیت کی معراج ہے لیکن اگر پوری کامیابی نہ ہو تو ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے شخصیت کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ سچی شخصیت اپنی ناکامیوں کو بھی

اپنے حسن اور قوت کو بڑھانے کا ذریعہ بنالیتی ہے اور اجتماعی زندگی سے اس کا جو رشتہ ہوتا ہے اس میں بہت ہی لطیف کیفیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ حبہ خاتون نے مغلوں کو کشمیر سے نکال کر اپنی حکومت قائم کی ہوتی تو اس کی عظمت بڑھ جاتی، لیکن اسی وجہ سے وہ ہم سے دور بھی ہو جاتی۔ اس کی ناکامی کا دل پر خاص اثر ہوتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ایک اعلیٰ مقصد میں شریک ہونے کی دعوت دے رہی ہے۔ وہ ہمدردی، محبت اور ہماری قدر شناسی کی محتاج ہے اور ہم اس کے غم کو اپنا غم بنا کر اپنی طبیعتوں اور اپنی زندگی کو سنوار سکتے ہیں۔ شخصیت اور جماعتی زندگی کا تعلق ایک راز ہے جو کبھی پوری طرح بیان نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اس کی پوری حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی لیکن ہم جماعتی زندگی سے رشتہ پیدا کر کے شخصیتوں کے راز داں بن سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے شخصیتوں کی یاد تازہ کی جاتی ہے اور اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملکی زندگی پر ان کا بصیرت افروز اثر پڑتا رہے۔

پروفیسر محمد مجیب

☆☆☆

کردار (اشخاص)

زون (حبہ خاتون)	:	
اس کی ماں	:	
تین آدمی	:	
سید مبارک	:	ایک صوفی
عطا محمد	:	ان کا شاگرد
عبداللہ راتھر	:	زون یعنی حبہ خاتون کا باپ
شہزادہ یوسف (بعد کو یوسف شاہ)	:	
محمد بٹ	:	
علم شیر خاں ماگرے	:	
علی خاں چک	:	
عزیز راتھر	:	حبہ خاتون کا شوہر
ولی عہد	:	یعقوب شاہ

ایک جوان عورت	:	عطا محمد کی بیوی
بابا خلیل اللہ	:	ایک صوفی
قاضی ابو محمد	:	
ان کے شاگرد	:	
دل نواز	:	قوال
اس کے دو ساتھی	:	
چوب دار	:	
نسرین	:	ایک خواص
دو اور خواصیں	:	
دو نو جوان	:	
مجمع کے لوگ	:	

پہلا ایکٹ

پہلا سین

(اسٹیج کے دائیں طرف ذرا پیچھے مکان کا دروازہ، بائیں طرف چشمہ، اس کے کنارے شمشاد کا درخت، پشت پر پہاڑوں کا منظر، زون گھر سے اچھلتی، کودتی نکلتی ہے جیسے تار سے سُر نکلتا ہے۔ چشمے کے پاس جاتی ہے۔ مسکراتی ہوئی، رُک رُک کر کچھ کہتی ہے۔ پھر لپک کر شمشاد سے لپٹ جاتی ہے۔ اس کے تنے پر گال رکھ دیتی ہے، اس سے پیار کی باتیں کرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی نظر پہاڑوں پر پڑتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ان کے بھی گلے ملے، مگر ٹھٹھک کر رہ جاتی ہے)

زون: (شکایت کے لہجے میں شمشاد سے) دیکھو تو ان پہاڑوں کو، جانتے ہیں کہ میرا ان سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے مگر وہ چپ سادھے بیٹھے رہتے ہیں۔ نہ ایک قدم آگے نہ پیچھے۔ میں بھی ان کی طرف پیٹھ پھیر لوں گی (کچھ دیر سوچ کر) وہ ہیں بھی تو بے تکے۔ کہیں ایسا

سناٹا کہ آدمی آواز کے نام تک کو بھول جائے۔ کہیں ایسا شور کہ پیڑ لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ کبھی نظر کو اوپر چڑھاتے چڑھاتے تھکا دیتے ہیں۔ کبھی اتنے زور سے نیچے ڈھکیلتے ہیں کہ نظر کے ساتھ آدمی خود بھی گرنے لگتا ہے۔ یہ بھی بھلا کوئی طریقہ ہے۔ (پہاڑوں کی طرف پیٹھ کر لیتی ہے اور اس طرح منتظر رہتی ہے گویا پہاڑ اس کی شکایت سن کر اس سے کچھ کہیں گے پھر انکھیوں سے پیچھے کی طرف دیکھتی ہے۔ اسے کوئی جواب نہیں ملتا) اچھا نہ بولو، دیکھوں کب تک چپ رہتے ہو!

(زون، شمشاد سے لگ کر چشمے کے پاس بیٹھ جاتی ہے اور اس کے بہاؤ کو دیکھنے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے سے ہر جذبے کے آثار مٹ جاتے ہیں۔ پھر وہ اس طرح بولنے لگتی ہے کہ گویا اندر سے کوئی طاقت اسے مجبور کر رہی ہے)

زون: میرے دل سے گیت نکلتے، تیرے ساتھ بہتے۔ نہ جانے کہاں تک بہتے...... کسی کو پتا نہ چلتا۔ کہاں سے آئے ہیں۔ کس کے دل سے نکلے ہیں۔ کوئی سمجھتا، یہ وہ ہوا ہے جو جنگلوں کو گدگدایا کرتی ہے۔ کوئی کہتا، یہ پہاڑوں کا سناٹا ہے چشمے کے ساتھ بہ کر آ گیا ہے، دل کو آرام پہنچانے، محنت کا پسینہ پونچھنے...... میرے دل سے گیت نکلتے...... عورتیں انھیں گود میں اٹھا لیتیں لڑکیاں ان کے ساتھ کھیلتیں...... مرد آنکھیں نیچی کر لیتے...... میرے گیت...... کہاں، میں، میرے گیت؟ (خاموشی) توبہ! دل سے کچھ نکلتا نہیں۔ بس بوجھ بڑھتا جاتا ہے (چہرے پر تکلیف کے آثار) مر جانا آسان ہے، چپ رہنا مشکل...... کوئی ان گیتوں کو میرے دل سے نکال لیتا، نکال کر پھینک دیتا! آخر ان سے فائدہ کیا؟ (آہستہ آہستہ نظر اٹھا کر پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے۔) اور ان پہاڑوں سے کیا فائدہ؟ لاکھ محبت کرو دور ہی رہتے ہیں۔ ان کی طرف دیکھو تو نظر کو پکڑ لیتے ہیں، دل کو مسوس لیتے ہیں۔ کوئی تسکین نہیں، کوئی تسلی نہیں، اکیلے کو اکیلا چھوڑ دیتے ہیں...... ہم تو موت کا اچار کھا کر زندہ رہتے ہیں (یکبارگی کیفیت بدل جاتی ہے۔ شمشاد کی شاخوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر) اچھا خیال ہے موت کا

اچار۔ کچھ نہ ہو تو اچار ہی کھاؤ (کھڑی ہو کر آنکھیں چمکاتے ہوئے) اچار!

ماں: (اندر سے) زون! زون!

زون: جی اماں۔

ماں: (دروازے کے پاس سے) اری کیا کر رہی ہے باہر!

زون: باتیں کر رہی ہوں!

ماں: (باہر آ کر) باتیں کر رہی ہے! کس سے؟

زون: (جوش کے ساتھ بتا بتا کر) چشمے سے، شمشاد سے، پہاڑوں سے، اپنے آپ سے!

ماں: (زون کی طرف بڑھتے ہوئے) تجھے کیا ہو گیا ہے لڑکی! دیوانوں کی طرح چلا رہی ہے معلوم نہیں آج لوگ آ رہے ہیں؟

زون: کیسے لوگ؟

ماں: کیسے لوگ آئیں گے؟ تجھے معلوم نہیں کہ تو سیانی ہو گئی ہے۔ سید صاحب، تیرے استاد کی خوشی تھی کہ تجھے فارسی پڑھا لکھا دیں تب تیرا بیاہ ہو۔ نہیں تو اب تک تو سسرال میں کئی سال گزار چکی ہوتی۔

(زون منہ بنا کر چپ ہو جاتی ہے، تھوڑی دیر میں اسٹیج کے بائیں طرف پیچھے تین آدمی نظر آتے ہیں۔ ماں زون کو اپنے کپڑوں میں چھپا لیتی ہے۔ آدمی مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور پھر کوئی انھیں اندر بلا لیتا ہے)

ماں: (رازدارانہ لہجے میں) تیرے ابا کے ایک بہت عزیز دوست ہیں۔ عمر بھر ان کا ساتھ رہا ہے۔ تبت کے کئی سفر ساتھ کر چکے ہیں، تو تو خود ہی جانتی ہے کہ تو پیدا بھی نہیں ہوئی تھی جب انھوں نے طے کر لیا تھا کہ اس طرح کا رشتہ ہوگا۔ اچھے، خوش حال لوگ ہیں، بستی میں ان کی عزت ہے۔ تیرے ابا نے آج شاہ صاحب کو بھی بلایا ہے۔ ان کی دعا میں بہت اثر ہے (خاموشی) اچھا اب تو یہاں چپکی بیٹھی رہ مجھے جا کر مہمانوں کی خاطر کرنا ہے۔

(ماں مکان کے اندر چلی جاتی ہے۔ زون سر جھکا کر پھر چشمے کے بہاؤ کو دیکھنے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ہاتھ اس طرح حرکت کرنے لگتا ہے گویا

وہ ایک لے کی روانی کو بتا رہی ہو)

دن تو ژہ دین دن کہہ برے......(بتا تو سہی، میں تیرے بغیر دن کیسے گزاروں گی۔)
...... دن تو ژہ دین دن کہہ برے...... دل تارہ کرو تھم دلبرے......(اے دلبر تو نے میرا دل لے لیا۔)......دل تارہ کرو تھم دلبرے......دن تو ژہ دین دن کہہ برے......
بر یو کہ چھس......آمیو برے......(میں تیری محبت سے بھرپور ہوں۔)......اژتم برے مارے برے......(تو میرے گھر کے اندر داخل ہو جا۔ میں تیرے لیے چھوٹے چھوٹے بھیڑ ذبح کروں گی۔) دل تارہ کرو تھم دلبرے......اژتم برے مارے برے......(تو میرے گھر کے اندر داخل ہو جا۔ میں تیرے لیے چھوٹے چھوٹے بھیڑ ذبح کروں گی۔)
......دل تارہ کرو تھم دلبرے......(سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ گانا بند ہو جاتا ہے۔ صرف ہاتھ حرکت کرتا رہتا ہے) کھ......چاند...... سکھ...... کھ چاند سکھ...... کوتاہ برے......(تیرے چندر کھ سے میری راحت پیدا ہو گی۔)......دن تو ژہ دین دن کہہ برے......

(اسی دوران میں سید مبارک ایک نوجوان مرید عطا محمد کے ساتھ آتے ہیں۔ اور زون کی کیفیت دیکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زون کی نظر ان پر پڑتی ہے تو وہ گھبرا کر چپ ہو جاتی ہے۔ اور اپنا منہ چھپا لیتی ہے)

سید مبارک: مجھے معلوم تھا کہ عبداللہ راتھر کے مکان کے سامنے چشمہ ہے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ اس میں سُر بہتے ہیں (زون کے قریب جا کر) کیوں بیٹی! تمھارا ہی نام زون ہے نا؟ (زون کوئی جواب نہیں دیتی) میں تمھارے لیے دعا کرنے آیا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے بہت سی دعائیں دینا ہوں گی...... میں پچھلی دفعہ آیا تھا تو تم کھیلتی پھرتی تھیں۔ ایک مرتبہ تمھیں استاد سے فارسی پڑھتے دیکھا تھا۔ خدا تمھیں یہ علم، یہ طبیعت مبارک کرے (زون کے پاس دوزانو بیٹھ کر) اچھا اب شرماؤ نہیں۔ گیت کو اپنے گلے میں چھپا کر نہ رکھو۔ مجھے گیتوں کا بہت شوق ہے اور کشمیری گیت میں نے سنے ہی نہیں۔
(سید مبارک اس کے منتظر ہیں کہ زون گانا شروع کرے۔ وہ سر جھکائے

بیٹھی رہتی ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

عطا محمد: حضور، آپ اجازت دیں تو مولا نا روم کی وہ غزل سنادوں جو آپ کو بہت پسند ہے۔

سید مبارک: بہت اچھا خیال ہے۔ ضرور سناؤ۔

(عطا محمد ذرا دیر گنگنانے کے بعد، دھیمی مگر جذبات سے لبریز آواز سے گانا شروع کرتا ہے زون چونک پڑتی ہے۔ غزل سنتے سنتے اس کی جھجک بالکل دور ہو جاتی ہے اور وہ اس کے معنی سے لطف اٹھانے لگتی ہے)

عطا محمد:

چرا ز اندیشہٗ، بے چارہ گشتی   فرو رفتی بہ غم، غم خوارہ گشتی
چرا زاندیشہٗ، بے چارہ گشتی   فرو رفتی بہ غم، غم خوارہ گشتی
ترامن پارہ پارہ جمع کردم
ترامن پارہ پارہ جمع کردم   چرا از وسوسہ صد پارہ گشتی
زدارالملک عشقم رخت بستی   دریں غربت چنیں آوارہ گشتی
زمین را بہر تو گہوارہ کردم
زمین را بہر تو گہوارہ کردم   فسردی تختۂ گہوارہ گشتی
رواں کردم ز بہرت آب حیواں   تو سوے خشک رود خارہ گشتی
چرا ز اندیشہٗ، بے چارہ گشتی   فرد رفتی بہ غم، غم خوارہ گشتی
ترا من پارہ پارہ جمع کردم   چراا ز وسوسہ صداپارہ گشتی
چرازاندیشہٗ، بے چارہ گشتی

(گانے کی آواز سن کر عبداللہ راتھر گھر سے نکل آتا ہے اور سید مبارک کی طرف لپکتا ہے۔ اس کے پیچھے وہ تین آدمی بھی جو پہلے آئے تھے نکل پڑتے ہیں۔ آخر میں زون کی ماں گھر سے نکلتی ہے۔ تینوں آدمیوں کو سماع کی محفل ذرا بھی پسند نہیں آتی اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چہرے اور آنکھوں

سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں)

عبداللہ راٹھر: (غزل ختم ہونے کے بعد مصافحہ کرتے ہوئے) حضور شاہ صاحب یہ آپ نے مجھ پر کیا غضب کیا کہ تشریف لائے اور یہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ آپ نے تو مزاج پرسی کا موقع بھی نہ دیا۔ غفلت کی معافی چاہتا ہوں۔

سید مبارک: مہمان مطمئن ہو تو میزبان کے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ میں جس غرض سے یہاں آیا تھا وہی کر رہا ہوں...... زون کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس کی پیشانی پر شخصیت کا جلوہ ہے۔ خدا نے چاہا تو یہ صرف اپنے زمانے کے لوگوں کو نہیں متاثر کرے گی بلکہ بعد کو آنے والی نسلیں بھی اسے یاد کریں گی۔

عبداللہ راٹھر: حضور کی دعا سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔

سید مبارک: (ذرا سوچ کر) اس وقت مجھے نہ معلوم کیوں خیال آ رہا ہے کہ زون کا نام حبہ ہو تو بہتر ہے، ہاں، اسے آج سے حبہ کہا کریں گے۔

عبداللہ راٹھر: حضور کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ آج سے یہ حبہ کہلائے گی۔ اب حضور اندر تشریف لے چلیں اور خادم کو کچھ تو اضع کرنے کا موقع عنایت فرمائیں۔

سید مبارک: نہیں میرا تو یہیں بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ جگہ بہت اچھی ہے۔

(تینوں آدمی، جواب تک عبداللہ کے پیچھے کھڑے رہے ہیں بڑھ کر سید مبارک سے مصافحہ کرتے ہیں۔ سید مبارک ان پر ایک نظر ڈال کر پھر توجہ نہیں کرتے اور حبہ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ شمشاد کے پیچھے منہ چھپائے ہے۔ تینوں آدمی ہٹ کر اسٹیج کے دائیں طرف آ جاتے ہیں۔ عبداللہ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی طرف متوجہ ہو یا سید مبارک کی طرف)

پہلا آدمی: (اپنے ساتھیوں سے) اب ہمیں رخصت ہو جانا چاہیے۔

دوسرا آدمی: اور نہیں تو کیا، مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ لڑکی اس طرح بیٹھ کر گانا سنے

تیسرا آدمی: ہاں! دیکھو کیسی بے شرم ہے، خود بھی گا رہی ہے.....

دوسرا آدمی: کہیں یہ لڑکی ہماری لڑکیوں کو خراب نہ کر دے۔

پہلا آدمی: نہیں، میں سمجھتا ہوں سسرال میں اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ بہر حال شاہ صاحب کی
موجودگی میں تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔

(آخر کار عبداللہ راتھر طے کر لیتا ہے کہ اسے ان تینوں سے مخاطب ہونا چاہیے
اور وہ اٹھ کر ان کی طرف آتا ہے)

پہلا آدمی: عبداللہ! بھئی اب، ہمیں اجازت دو۔

عبداللہ: ایسی جلدی کیا ہے۔ ذرا دیر تو اور ٹھہرو۔

تیسرا آدمی: نہیں اب ہمیں جانے دو۔

دوسرا آدمی: ہاں ہمارا چلا جانا ہی بہتر ہے۔

(عبداللہ کے چہرے سے پریشانی اور تکلیف ظاہر ہوتی ہے۔ مگر کوئی جواب
اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ تینوں آدمی اس سے مصافحہ کر کے اور سید مبارک
کو سلام کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں)

سید مبارک: عبداللہ راتھر! بھئی مجھے بہت افسوس ہے کہ میرا ایسے وقت آنا ہوا جب یہ لوگ یہاں
موجود تھے۔

عبداللہ راتھر: حضور، آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کا تشریف لانا کبھی بے موقع ہو سکتا ہے۔ ہمارے
لیے تو آپ جس وقت بھی تشریف لائیں بڑی سعادت ہے۔

سید مبارک: نہیں، میں اس وقت نہ آتا تو بہتر تھا۔ میرے لیے اب ایک بڑا اخلاقی مسئلہ پیدا ہو گیا
ہے...... حبہ کو میں نے ابھی گاتے سنا تھا۔ اس کی آواز معمولی آواز نہیں۔ اس کا شوق
معمولی شوق نہیں...... مگر تمھیں بات کیسے سمجھاؤں۔

ماں: حضور، زون، لیجیے وہی پرانا نام زبان پر آ گیا۔ حبہ کو میں نے کبھی کبھی گنگناتے سنا ہے۔ بچی ہے
میں نے منع نہیں کیا۔

سید مبارک: عبداللہ! برا نہ مانو...... تو تم سے ایک بات کہوں۔

عبداللہ راتھر: حضور ارشاد فرمائیں۔

سید مبارک: میں جانتا ہوں کہ اس میں نقصان کا بھی اندیشہ ہے لیکن آدمی کو جی بھر کے آدمی ہونا چاہیے۔

عبداللہ راتھر: جی حضور، بجا ہے۔

سید مبارک: نہیں میری بات کو اچھی طرح سمجھ لو، ممکن ہے لوگ اسے برا مانیں کہ حبہ کو گانے کا شوق ہے، مگر تم اسے منع نہ کرنا۔ بعد کو جو کچھ ہو سمجھنا خدا کی مرضی ہے...... خدا جس کو جیسا پیدا کرے اس کو ویسا ہی ہونا چاہیے۔ کسی توفیق سے انکار کرنا، کسی سچے شوق کو مارنا کفرانِ نعمت ہے۔

عبداللہ راتھر: (مجبوراً) جی حضور، ان معاملوں کو آپ بہتر سمجھتے ہیں۔

سید مبارک: اچھا اب مجھے اجازت دو۔ میری طبیعت ذرا بے چین ہوگئی ہے۔

(سید مبارک اور عطا محمد رخصت ہوتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

ماں: اب چلو، اندر چلو۔ میرا گھر کا سارا کام پڑا ہے۔

عبداللہ راتھر: ہاں چلو۔

ماں: شاہ صاحب نے نام اچھا رکھا ہے...... حبہ...... خدا لڑکی کو یہ نام مبارک کرے۔ کیوں حبہ، تو یہاں کتنی دیر بیٹھے گی؟

حبہ: جب تک چشمہ بہتا رہے گا۔

ماں: اب یہ پھر دیوانی باتیں کرنے لگی۔ آ جا جلدی سے۔

(ماں اور باپ اندر چلے جاتے ہیں۔ حبہ شمشاد کی ٹیک لگائے سوچ میں کھڑی رہتی ہے)

(پردہ)

دوسرا سین

(ایک نیچا ٹیلہ جس کی اوپر کی سطح ہموار نظر آتی ہے۔ ذرا دائیں پر اس کے پیچھے سے ایک راستہ آتا ہے۔ جو گھوم کر سامنے کو نکلتا ہے۔ ٹیلے پر درخت، گھاس کچھ بھی نہیں۔ اس کا ٹیالا رنگ منظر پر حاوی ہے۔ پیچھے بہت دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر تھوڑی تھوڑی برف دکھائی دیتی ہے۔ دوپہر کا وقت ہے اور دھوپ بہت تیز ہے۔ حبہ خاتون تھکی ماندی اور نڈھال راستے کے کنارے بیٹھی ہے۔ اس طرح کہ اگر کوئی ٹیلے کے پیچھے سے آئے تو وہ اسے دیکھ نہ سکے)

حبہ خاتون: (پہلے دھیمی، کسی قدر روہانسی آواز میں، پھر پورے گلے سے)

چارہ کرو میوں مالنو ہو
چارہ کرو میوں مالنو ہو (میکے والو میرا چارہ کرو)

وارہ دیں سیت وارہ چھس تو (سسرال والوں کے ساتھ میں اچھی حالت میں نہیں ہوں)

چارہ کرو میوں مالنو ہو

چارہ کرو میوں مالنو ہو

(اور بھی زیادہ تھکی آواز میں)

چارہ کرو میوں مالنو ہو

وڈر کہسن، کذر گولو (کریوے پر چڑھنا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے)

چارہ کرو میوں مالنو ہو

حبہ خاتونہ دِنوا اشارہ (حبہ خاتون نے اشاروں میں سب کچھ بتایا)

دل ہشارا مالنو ہو (ہشیار دل میکے والو۔)

(ترنم سے سرشار ہو کر حبہ خاتون پورا گیت دوبارہ گاتی ہے۔ اسی دوران میں شہزادہ یوسف ٹیلے کے پیچھے سے دبے پاؤں آتا ہے اور حبہ خاتون سے کچھ دور خاموش کھڑا رہتا ہے جب حبہ خاتون تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتی ہے تو وہ اور آگے بڑھتا ہے۔ مگر اب بھی وہ حبہ خاتون کے پیچھے ہے اور وہ اس کو دیکھ نہیں سکتی)

یوسف: یہ آواز تو کسی حور کی ہوتی اگر اس میں اتنا درد نہ ہوتا۔ میں کہتا کہ صورت بھی کسی حور ہی کی سی ہے۔ اگر وہ میری نظروں سے چھپائی نہ جاتی۔

(حبہ خاتون اور مڑ جاتی ہے اور اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کرتی ہے ہو

یوسف: اے حور تیرا نام کیا ہے؟

(حبہ خاتون کوئی جواب نہیں دیتی)

یوسف: مجھے معلوم نہیں تھا کہ حوریں کشمیری زبان میں گیت گا لیتی ہیں، مگر بات نہیں کر سکتی ہیں۔

حبہ خاتون: میں آدمی ہوں۔ مجھ سے آدمی کی طرح بات کیجیے۔

یوسف: (ذرا جز بز ہو کر) مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کا لڑکا آدمی کی طرح بات نہ کرے۔

حبہ خاتون: اجنبی کو شریف عورتوں سے بات نہ کرنا چاہیے۔ میرے لیے بادشاہ کا لڑکا بھی اجنبی ہے۔

یوسف: میں نے بتا دیا کہ میں کشمیر کا شہزادہ یوسف ہوں۔ اب میں اجنبی نہیں رہا۔ اب تم بتاؤ کہ تمھارا نام کیا ہے۔

حبہ خاتون: میرا نام میرے گھر والوں سے پوچھیے۔

یوسف: تمھارے میکے والوں سے یا سسرال والوں سے؟

(حبہ خاتون شرمندہ ہو کر سر نیچا کر لیتی ہے)

یوسف: میں تمھارے اوپر کوئی ظلم نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے تمھیں ایسا گیت گاتے سنا جیسا کہ میں نے اب تک نہیں سنا ہے۔ تمھاری آواز اتنی سریلی ہے کہ آدمی کی آواز ہو نہیں سکتی۔ میں شہزادہ اور اجنبی ہوں تب بھی آدمی تو ہوں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں تمھیں آسمانی دولت نہ سمجھوں، تمھیں حور نہ کہوں، تمھارا پتہ نشان معلوم کرنا نہ چاہوں۔

حبہ خاتون: اچھا اب بس کیجیے میں مٹی تھی، مٹی میں مل گئی، میرا کوئی پتہ نشان نہیں۔

(محمد بٹ، علم شیر خاں ماگرے اور علی خاں چک ٹیلے کے پیچھے سے آتے ہیں۔ یوسف انھیں دیکھ کر محمد بٹ کو اپنے پاس بلاتا ہے)

یوسف: یہاں قریب کوئی بستی ہے؟

محمد بٹ: ہے عالی جاہ! کوئی دو میل پر۔

یوسف: یہ عورت وہیں رہتی ہوگی۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کون ہے۔ تم ذرا جلدی سے جاؤ اور وہاں پوچھو کہ ایسی کوئی عورت ہے، جو کشمیری میں گیت گاتی ہے۔ اگر پتا چلے تو اس کے گھر والوں کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ یہ خود کچھ بتاتی نہیں اور میں اس کا پتا نشان معلوم کیے بغیر جا نہیں سکتا۔

محمد بٹ: عالی جاہ! آپ اس دھوپ میں تکلیف کیوں اٹھایئے۔ یہ عورت آسانی سے آپ کے ساتھ چلنے پر راضی ہو جائے گی۔ سری نگر پہنچ کر آپ حکم دیجیے گا کہ اس کے گھر والے دربار میں حاضر کیے جائیں۔

یوسف: اور اگر یہ ہمارے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئی۔

محمد بٹ: (حبہ خاتون کی طرف بڑھتے ہوئے) میں اسے ابھی راضی کرتا ہوں۔

علم شیر خاں: محمد بٹ، سوچ سمجھ کر کام کرو۔ ہم اس وقت کل چار ہیں اور شکار کے لیے نکلے ہیں۔
اگر یہ عورت چیخی چلائی اور گاؤں والوں نے ہم کو گھیر لیا تو مشکل پڑ جائے گی۔ ایسے
شکار کو لاد کر لے جانے کے لیے ذرا انتظام کی ضرورت ہے۔

علی خاں چک: ہر طرح کے شکار کے لیے الگ سے مشق کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ
سب کچھ کر لو گے۔

محمد بٹ: میں دہقانوں کی سرشت کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ تم لوگ خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔

علم شیر خاں: ہم سب جانتے ہیں کہ تم کتنے بہادر ہو۔ مگر اس وقت تو عالی جاہ کے ارشاد ہی پر عمل
کرو۔

یوسف: (حکم دینے کا انداز اختیار کر کے) ہاں، ہم نے تمھیں جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل کرو (حبہ
خاتون سے) تم نے کہا تھا کہ میرا نام گھر والوں سے پوچھو۔ وہی کر رہا ہوں۔

حبہ خاتون: یہ ظلم ہے۔

یوسف: ظلم؟ میرے منہ پر کہتی ہو کہ میں ظلم کرتا ہوں۔ ظالم ہوں۔ یہ ہمت تم میں کہاں سے آئی؟

حبہ خاتون: (غصے میں کھڑی ہو کر، یوسف کی آنکھ سے آنکھ ملا کر) جی ہاں یہی کہتی ہوں کہ یہ ظلم ہے۔
اور آپ کا جی چاہے تو اپنی تلوار سے میری ہمت آزما لیجیے۔

یوسف: (تلوار پر ہاتھ رکھتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر) معلوم ہوتا ہے کہ تم نے سسرال میں اتنا ظلم سہا
ہے کہ اب بادشاہ کے ظلم سے بھی نہیں ڈرتی ہو۔ (حبہ خاتون سر جھکا لیتی ہے۔) نہیں، یہ
بھی نہیں، مجھے تمھاری شرافت کی داد دینی چاہیے۔ تمھیں اپنی سسرال کے لوگوں کا اعتبار
نہیں، مجھے ظلم کی دعوت دے کر اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہو۔ (پھر کچھ سوچ کر) اچھا،
اگر تمھاری سسرال کے لوگ تمھاری طرح شریف نکلے تو میں تمھارے قدموں پر تاج رکھ
کر چلا جاؤں گا، سمجھوں گا کہ ایک حور نے اپنا گیت سنایا اور نظر سے غائب ہو گئی۔ ورنہ
تمھیں اپنے ساتھ لے جا کر تمھارے سر پر تاج رکھوں گا اور کہوں گا کہ آسمان سے ایک
حور میری ملکہ بننے کے لیے اتر آئی ہے۔

حبہ خاتون: اس میں میری کوئی عزت نہیں۔ عورت کی عزت اس کے گھر میں ہوتی ہے۔

یوسف: تمھارے گھر میں تمھاری عزت ہوتی تو تم مجھے فخر کے ساتھ بتاتیں کہ میں فلاں گھر کی ہوں۔

حبہ خاتون: میں آپ کے ظلم سے ڈرتی ہوں۔

یوسف: یہ بہانہ ہے۔ تم مجھ سے نہیں ڈرتی ہو........ (احساس کم تری کو مٹانے کے لیے) مگر تم یہ نہ سمجھو کہ میں تم سے ڈرتا ہوں۔ تم شریف ہو تو میں شہزادہ ہوں۔ تم گاتی ہو تو میں موسیقی کا قدردان ہوں۔ تم کشمیری میں گیت کہتی ہو تو میں فارسی میں غزل کہتا ہوں........ تم مجھے اپنی محبت دو گی تو میں تمھیں اپنی سلطنت دے دوں گا۔

حبہ خاتون: میں ایسا سودا نہیں کر سکتی۔

یوسف: آدمی مجبور ہو کر کبھی کچھ کر لیتا ہے۔

حبہ خاتون: جی ہاں! ظالم کے ظلم کو بھی سہہ لیتا ہے۔ مگر ظالم کو بھی سوچنا چاہیے اس کا اختیار کب تک چلے گا۔

یوسف: تم سے حجت کرتے کرتے میری زبان خشک ہو گئی ہے۔

حبہ خاتون: میں مظلوم کا خون پہلے ہی حاضر کر چکی ہوں۔

(محمد بٹ، عزیز راتھر (حبہ خاتون کا شوہر) کے ساتھ واپس آتا ہے۔ عزیز پر وحشت طاری ہے۔)

محمد بٹ: عالی جاہ! یہ دہقان مجھے ٹیلے کے قریب ہی مل گیا۔ یہ اس عورت کا شوہر معلوم ہوتا ہے۔

یوسف: (عزیز کو گھور کر اوپر سے نیچے تک دیکھتا ہے) مجھے تو نہیں معلوم ہوتا۔ تیرا نام کیا ہے اور تو کیا کرتا ہے؟

(عزیز جواب دینا چاہتا ہے۔ مگر اس کی گھگی بندھ جاتی ہے وحشت میں، وہ ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں پر گر جاتا ہے)

محمد بٹ: عالی جاہ! یہ زمیندار ہے۔ اور اس کا نام عزیز راتھر ہے۔

یوسف: (عزیز راتھر سے) کیوں، یہ عورت تیری بیوی ہے؟

(عزیز جواب دینا چاہتا ہے مگر آواز نہیں نکلتی۔ صرف سر ہلا دیتا ہے)

یوسف: مجھے تو اس قابل نہیں معلوم ہوتا کہ ایسی عورت تیرے گھر میں رہے۔ تجھے اس کو طلاق دے دینا چاہیے۔

(یوسف، محمد بٹ کے کان میں کچھ کہتا ہے)

محمد بٹ: (عزیز سے) چل تیری قسمت جاگ اٹھی۔

(عزیز کا ہاتھ پکڑ کر الگ لے جاتا ہے اور ماگرے اور علی خاں چک کو اشارے سے بلاتا ہے۔ پھر وہ عزیز کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ عزیز اقرار کے لیے سر ہلاتا ہے اور دونوں مصاحب بھی اس کے بعد سر ہلاتے ہیں۔ محمد بٹ جیب سے ایک تھیلی نکال کر عزیز کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے اور اشارہ کرتا ہے کہ چلتا بنے۔ حبہ خاتون بڑی مایوسی کے ساتھ یہ تماشا دیکھتی ہے اور یوسف برابر حبہ خاتون کو دیکھتا رہتا ہے)

یوسف شاہ: (حبہ خاتون سے بڑی نرمی کے ساتھ) آپ نے مجھے ظالم کہا تھا۔ اب بتائیے کہ ظالم کون ہے۔

(حبہ خاتون بے بس ہو کر بیٹھ جاتی ہے اور رونے لگتی ہے۔ یوسف اپنے مصاحبوں کے پاس جاتا ہے اور سب دبی آواز میں مشورہ کرتے ہیں)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

(یوسف باغ کے محل میں دیوان خاص۔ دائیں طرف درباری اور وزیر دست بستہ بیٹھے ہیں۔ان میں ولی عہد یعقوب شاہ اور محمد بٹ سب کے آگے ہیں۔ان کے کچھ پیچھے علم شیر خاں ماگرے اور علی خاں چک دکھائی دیتے ہیں۔اسٹیج کے بائیں طرف فرش سے ایک قدم اونچا پلیٹ فارم ہے۔ جس پر شاہی تخت رکھا ہے۔تخت کے پیچھے اوٹ ہے اور اوٹ کے دوسری طرف گاؤ تکیہ اور قالین ہے۔تخت پر یوسف شاہ، گاؤ تکیے کا سہارا لیے حبہ خاتون بیٹھی ہے۔)

یوسف شاہ: محمد بٹ! اب اور کیا کام باقی ہے۔

محمد بٹ: میری عقل جن معاملوں کی وجہ سے حیران تھی۔ وہ سب ظل اللہ کی روشن ضمیری نے طے کر دیے ہیں۔اب غلام کا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے(ولی عہد کی طرف دیکھتا ہے۔)

ولی عہد: عالی جاہ! میں ایک فریاد لے کر آیا ہوں...... دنیا کا کوئی حصہ جہاں انسان آباد ہیں شر و فساد سے خالی نہیں۔ عالی جاہ جیسے رعایا پرور، اور صاحب بصیرت حکمراں امورِ سلطنت کی طرف پوری توجہ کرتے ہیں، عدل و انصاف کا نمونہ بن جاتے ہیں تو مخالفت کرنے والے اور کوئی بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ عالی جاہ کی فرض شناسی اس کا موقع نہیں دیتی ہے کہ رعایا کی شکایتوں کو بغاوت کا حیلہ بنایا جائے۔ اس لیے حضور کے اور ملکہ جہاں کے ذوق کو اعتراض کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ رعایا کو جان اور مال اور معاش کی طرف سے پورا اطمینان ہے۔ وہ راگ اور غزل گوئی کا شوق کیوں نہ کرے۔ مگر نہیں حضور کا ایک مخالف جس کے سر پر نہ جانے کیوں علم کا عمامہ باندھ دیا گیا ہے، یہ کہتا ہے کہ راگ اور موسیقی اور سمع سب حرام ہیں، اس کا چرچا کرنے والے بے دین ہیں، اور اگر کوئی بادشاہ اس کا چرچا کرے تو اس کے خلاف بغاوت کر کے اسے تخت سے اتار دینا چاہیے۔
یہ بات میرے کانوں تک میرے مطربوں اور قوالوں نے پہنچائی۔ ان کا بیان تھا کہ ظلّ اللہ کی مخالفت کے لیے ایک جماعت تیار کی گئی ہے جو اس معاملے میں لڑنے مرنے پر تلی ہے۔ بعض گویوں پر اس طرح حملے کیے گئے کہ وہ ڈر کر شہر سے بھاگ گئے۔ جو ہیں وہ اپنی جان خطرے میں سمجھتے ہیں۔ ظلّ اللہ کا ارشاد ہو تو میں اپنے مطربوں اور قوالوں کو حاضر کراؤں۔

یوسف شاہ: نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ تم بتاؤ کہ تم نے کیا کیا؟

ولی عہد: ظلّ اللہ! میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں اور اس شورش کو رفع کر دوں، مگر ملکہ جہاں نے منع فرمایا۔

یوسف شاہ: ملکہ جہاں نے کس بنا پر منع فرمایا؟

حبّہ خاتون: عالی جاہ! قاضی ابو محمد بہت بڑے عالم ہیں۔ ساری دنیا میں ان کی شہرت ہے۔ جو بات وہ کہتے ہیں دین اور اخلاق کی بات ہے۔ ان پر ہاتھ اٹھانا علم اور دین کی ایسی توہین ہوگی جس سے عالی جاہ سارے جہان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدنام ہو جائیں گے۔ عالی جاہ کو قوت کے بجائے تدبیر سے کام لینا چاہیے۔

یوسف شاہ: پھر آپ نے کوئی تدبیر بھی سوچی؟

حبہ خاتون: جی ہاں۔ میں نے سنا تھا کہ قاضی صاحب شاعر ہیں۔ اب دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ ان میں اتنا ترنم ہے کہ قاضی صاحب پر راگ کا اثر ضرور ہوگا۔ وہ راگ اس لیے نہیں سنتے کہ اپنے علم کے مطابق وہ اسے حرام سمجھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ کبھی راگ سن لیں گے تو ان کا دل ان کے علم کا حکم نہ مانے گا۔ ان کا حال ان کے قال کو رد کر دے گا۔ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ قاضی صاحب کو غزل سن کر وجد آ گیا تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ موسیقی کا دین سے بھی تعلق ہے۔ اس کے بعد قاضی صاحب ہم پر اعتراض نہ کر سکیں گے۔ آپ بابا خلیل اللہ سے درخواست کیجیے کہ وہ قاضی صاحب کے پاس تشریف لے جائیں اور ان سے فرمائیں کہ عالی جاہ پر ان کی تلقین کا بہت اثر ہوا ہے۔ وہ آج خلوت میں ان سے ملنا چاہتے ہیں۔

یوسف شاہ: میں خلوت میں ایک عالم دین سے ملنا چاہتا ہوں۔

حبہ خاتون: جی ہاں، میں آپ کے قریب رہوں گی۔ بابا خلیل اللہ بھی موجود رہیں گے۔

یوسف شاہ: ملکہ جہاں فرماتی ہیں کہ وہ اس معاملے کو حسن تدبیر سے طے کر دیں گی۔

ولی عہد: مجھے ملکہ جہاں کی کامیابی کا پورا یقین ہے۔

(محمد بٹ کچھ کہنا چاہتا ہے کہ پیچھے شور سنائی دیتا ہے۔ ایک چوبدار داخل ہوتا ہے اور آداب بجا لاتا ہے۔)

چوبدار: ظل اللہ محل کے چوکیداروں نے ایک بدمعاش کو پکڑا ہے جو حرم سرا میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

محمد بٹ: اس کے لیے ظل اللہ کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ تھی۔ بدمعاش کی وہیں پر گردن مار دینا چاہیے تھا۔

یوسف شاہ: ہاں، ہاں اور نہیں تو کیا۔

حبہ خاتون: عالی جاہ! اس بدمعاش کو میں خود سزا دینا چاہتی ہوں۔

یوسف شاہ: ملکہ عالم، سزا دینا آپ کا کام نہیں۔

حبہ خاتون: یہ بدمعاش حرم سرا میں گھسنا چاہتا تھا۔ اس لیے میری اور حرم شاہی کی دوسری عورتوں کی

آبرو پر حملہ کیا۔ اس کی سزا خود تجویز کرنے کی اجازت دیجیے۔

یوسف شاہ: ملکہ جہاں کی خواہش ہے کہ اس بدمعاش کی سزا خود تجویز فرمائیں۔ اسے ان کے سامنے حاضر کرو۔

محمد بٹ: ظل اللہ اب خادموں کو دربار برخاست کرنے کا حکم دیں۔ خدا ظل اللہ کو شاد اور سلطنت کو آباد رکھے۔

(وزیر اور درباری آداب بجالاتے ہیں اور رفتہ رفتہ چلے جاتے ہیں۔ ایک خواص آکر اوٹ کو ہٹا دیتی ہے۔ دوسری نیچی نقشین میز لا کر رکھ دیتی ہے۔ تیسری ایک تشت میں صراحی اور پیالہ اور قہوے کی پیالی لا کر رکھ دیتی ہے۔ تینوں خواصیں چلی جاتی ہیں حبہ خاتون ذرا بائیں طرف ہٹ کر یوسف شاہ کے لیے جگہ کرتی ہے)

حبہ خاتون: آیئے عالی جاہ! اب سنیے کہ مجرم کے لیے میں نے کیا سزا تجویز کی ہے۔

یوسف شاہ: پہلے اپنی قہوے کی پیالی لو، پھر مجھے میرا پیالہ دو۔ اس کے بعد جرم و سزا کے معاملے پر غور کریں گے۔

حبہ خاتون: میں آپ سے کہتی رہتی ہوں کہ نشہ میں نشہ نہ ملایئے آپ نہیں مانتے۔

یوسف شاہ: (پیالے میں شراب انڈیل کر اور حبہ خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے اسے خالی کر کے) تم جانتی ہو میرے سر پر تاج ہے مگر اس تاج سے میرے سر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ پھر بھی ایسی باتیں کرتی ہو جو میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ ایک نشہ تو میرے سامنے موجود ہے، یہ دوسرا نشہ کیسا ہے؟

حبہ خاتون: میرے لیے سمجھانا کچھ آسان نہیں ہے...... کئی سال ہوئے ایک روز صبح کو اٹھی تو اسی نشے میں چور تھی۔ میرے گھر کے پاس ایک چشمہ بہتا تھا۔ چشمے کے کنارے ایک شمشاد کا درخت تھا۔ میں نے چشمے کو پیار کیا، شمشاد سے لپٹ گئی۔ چاہتی تھی کہ پہاڑ میرے پاس آجائیں، مجھ سے گلے ملیں۔ وہ نہیں آئے تو روٹھ گئی۔ پھر میں شمشاد کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گئی اور چشمے کے بہاؤ کو دیکھنے لگی۔ اس کی ہر لہر کے ساتھ معلوم

ہوتا تھا کہ میرے دل ودماغ میں نشے کی لہریں اٹھتی ہیں۔ دل میں ایک شوق بھرا ہے جو سینے کو چیر کر نکلنا چاہتا ہے۔ میں نے گنگنانا شروع کیا۔ میرے ہاتھ پاؤں ساز کے تاروں کی طرح کانپنے لگے۔ میرا پہلا گیت چشمے کی طرح پھوٹ نکلا...... کیا دیکھتی ہوں کہ ایک صوفی اپنے نوجوان مرید کے ساتھ سامنے کھڑے ہیں۔ انھوں نے میرے نشے کی کیفیت پہچان لی۔ میرے پاس اس طرح بیٹھ گئے کہ گویا میرا گانا سننا چاہتے ہیں مگر میں گھبرا گئی۔ دل سے جو سُر نکلنا چاہتے تھے وہ گلے میں پھنس گئے۔ جیسے آپ کی پتلی گردن کی صراحی میں شراب پھنس جاتی ہے...... نوجوان مرید نے کہا: مولانا روم کی ایک غزل سناتا ہوں اور بڑی خوش الحانی سے ایک غزل سنائی...... مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا۔ شاید میں بھی اس کے ساتھ گانے لگی......

(یوسف شاہ باتیں کرتے کرتے ایک اور پیالہ خالی کر دیتا ہے۔)

یوسف شاہ: (مسکرا کر) کیا اس موقع پر کسی نے نشے میں نشہ نہیں ملایا تھا؟

حبہ خاتون: جی نہیں، ایک سچے سُر نے زندگی کے ساز کو جگا دیا...... اب ایک اور کہانی سنیے۔ ایک نوجوان مرید اپنے پیر کے ساتھ کسی زمیندار کے گھر گیا۔ وہ سوچتا ہوگا کہ تواضع کی جائے گی۔ دعائیں کرنے کی درخواستیں کی جائیں گی، جیسا کہ معمولاً ہوتا ہے۔ گھر کے سامنے اس نے ایک لڑکی کو بیٹھے دیکھا اس کے پیر اس لڑکی کے پاس جا کر بیٹھ گئے، اور پیر اور لڑکی کی کیفیتیں دیکھ کر اس نے ایک غزل چھیڑ دی۔ بہار کی ہوا کے جھونکے آئے، کلی چٹک گئی...... کئی برس بعد جب اس نوجوان کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کا گھر بار تھا، بچے تھے اس نے لوگوں کو کشمیری گیت گاتے سنا...... کسی گیت کی لے، کسی کے ترنم، کسی کی غمگینی نے اسے وہ صبح، وہ چشمہ، وہ غزل یاد دلا دی...... نادان، ملکہ جہاں پر عاشق ہو گیا۔ بیوی بچوں کو بھول گیا۔ دیوانہ ہو گیا۔ یہ بھول گیا کہ ایک نشے کو دوسرے میں نہیں ملانا چاہیے۔

یوسف شاہ: (کچھ رقابت کچھ غصے میں) واقعی اس بدمعاش کا سر اس کے بدن سے جدا کر دینا چاہیے تھا۔

حبہ خاتون: اس کی بیوی میرے پاس فریاد لے کر آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ جاؤ اپنے شوہر سے کہو

کہ آج رات کو حرم سرا میں آ جائے، اسے ملکہ جہاں کا وصل نصیب ہوگا، شرط یہ ہے کہ خواب گاہ بالکل تاریک رہے اور وہ ملکہ جہاں سے کوئی بات نہ کرے۔

یوسف شاہ: (غصے کو دباتے ہوئے) اور یہ سب آپ مجھ سے بیان کر رہی ہیں۔

حبہ خاتون: جی ہاں، آپ کی داد چاہتی ہوں......نسرین!

(نسرین اندر آ کر آداب بجالاتی ہے۔ حبہ خاتون آنکھ سے اشارہ کرتی ہے۔ نسرین باہر جا کر ایک جوان عورت کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ وہ شاہانہ لباس پہنے ہے۔ اس کا بدن زیوروں سے جگمگا رہا ہے۔ بادشاہ کو دیکھ کر وہ سر جھکا لیتی ہے)

حبہ خاتون: عالی جاہ! آج رات کی ملکہ جہاں سے ملاقات کیجیے۔

(یوسف شاہ حیرت سے کبھی حبہ خاتون، کبھی جوان عورت کو دیکھتا ہے، پھر کبھی سانس لیتا ہے اور مسکرا کر اپنے سر سے تاج اتار کر حبہ خاتون کے سر پر رکھ دیتا ہے۔)

یوسف شاہ: اب میں سمجھا، یہ اسی آدمی کی بیوی ہے.....اچھا اب اس مجرم کو بھی پیش کیجیے۔

حبہ خاتون: عالی جاہ! کشمیری گیت ہے۔ فارسی کی غزل نہیں ہے۔ میں اپنی تدبیر کو رسوا نہیں کر سکتی۔ میں نے حکم دیا ہے کہ اس مجرم کو غسل دیں۔ اس کے بدن پر خوشبوئیں ملیں۔ اسے ملکہ جہاں کے لائق بنائیں۔ اس کے بعد وہ ایک حجرے میں جو اس کے لیے آراستہ کیا گیا ہے ملکہ جہاں کا انتظار کرے گا۔

یوسف شاہ: (شرما کر) میرا تاج مجھے واپس کر دیجیے۔ اسے اتارنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

(حبہ خاتون کے سر سے تاج اتار کر اپنے سر پر رکھ لیتا ہے۔ حبہ خاتون کے اشارے پر خواص جوان عورت کو لے کر چلی جاتی ہے)

یوسف شاہ: اچھا! اب کیا کریں؟

حبہ خاتون: بابا خلیل اللہ قاضی ابو محمد کو بادشاہ اور ملکہ کے تائب ہونے کی مبارک خبر سنا چکے ہوں گے۔ قاضی صاحب نیک کام میں دیر کیسے لگا سکتے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔

یوسف شاہ: (صراحی اور پیالے کی طرف دیکھ کر) اور یہ جو ہے اس کو کیا کروں؟

حبہ خاتون: اب تو آپ کی توبہ خالی پیٹ پر نہ ہوگی۔ برتن ہٹوا دیجیے۔

یوسف شاہ: مگر میں عالم دین سے تو گفتگو نہیں کر سکتا۔

حبہ خاتون: تائب کے لیے خاموشی زیادہ مناسب ہے۔ قاضی صاحب آپ کی زبان کو عاجز دیکھ کر بہت مطمئن ہوں گے۔

یوسف شاہ: اور کیا قاضی صاحب اس کو پسند کریں گے کہ آپ ان سے گفتگو کریں۔

حبہ خاتون: میری زبان میری مضراب ہے...... آپ پریشان نہ ہوں میں نے باباخلیل اللہ کو معاملہ اچھی طرح سمجھا دیا ہے...... آپ نے وہ قصہ نہیں سنا ہے کہ ایک شرابی کسی عالم کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے طبیب نے انگور کا رس پینے کو کہا ہے۔ مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس میں نشہ نہ پیدا ہو جائے۔ آپ میری ہدایت کیجیے۔ عالم کے پاس وہ روز نئی قسم کا رس لاتا اور اس کے نشے کے بارے میں فتوا لیتا۔ آخر میں دونوں ہم مشرب ہو گئے۔

یوسف شاہ: یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا مطلب کیا ہے؟

حبہ خاتون: مطلب بیان کرنے سے بات بگڑ جائے گی۔ ذرا صبر کیجیے۔

یوسف شاہ: قاضی صاحب چاہے جتنی دیر نہ آئیں۔ میں صبر کر لوں گا۔ (پیالہ بھر کر پیتا ہے پھر کچھ گنگنانے لگتا ہے۔ آخر میں یہ مصرع سنائی دیتا ہے):

بریاد دو زلفِ بتِ کشمیر نژادے

(نسرین اندر آتی ہے اور آداب بجالا کر حبہ خاتون کے کان میں کچھ کہتی ہے۔ حبہ خاتون صراحی اور پیالے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور خواص تشت اٹھا لیتی ہے)

یوسف شاہ: ہائیں کیا قاضی ابو محمد آ گئے؟

حبہ خاتون: جی ہاں، جب تک نسرین اوٹ کھڑی کر دے گی اور اگر کی بتیاں جلائے گی اس وقت تک قاضی صاحب پہنچ جائیں گے۔ (نسرین اگر کی بتیاں جلاتی ہے اور اوٹ کھڑی کر کے چلی جاتی ہے)

یوسف شاہ: اور وہ آ جائیں گے تو میں ان سے کہوں گا کیا؟ آپ نے تو کچھ بتایا نہیں؟

حبہ خاتون: آپ بڑھ کر ان سے مصافحہ کیجیے گا۔ 'السلام علیکم' اور 'تشریف لایئے' اور تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں، کہہ کر انھیں تخت کی طرف لے آیئے گا۔ پھر کہیے گا کہ 'آج اس تخت کو زینت بخشیے'۔

یوسف شاہ: بے چارہ تخت!

حبہ خاتون: آپ یہ کہہ دیں گے تو قاضی صاحب کو تخت سے بڑی ہمدردی ہو جائے گی اور اس کے پائے مضبوط ہو جائیں گے۔

یوسف شاہ: اچھا......اچھا......اب باقی سبق بھی پڑھا دیجیے۔

حبہ خاتون: آپ ان سے تخت پر بیٹھنے کو کہیں گے تو وہ بہت خوش ہو جائیں گے اور فرش پر بیٹھ جائیں گے۔

یوسف شاہ: میں ان سے جتنی دور بیٹھوں بہتر ہوگا نا؟

حبہ خاتون: بابا خلیل اللہ کو اپنے اور ان کے درمیان بٹھا لیجیے گا۔ آپ دور بیٹھیں گے تو ان کی نظر آپ پر زیادہ رہے گی۔

یوسف شاہ: پھر؟

حبہ خاتون: ان کی خدمت میں حبہ خاتون کا دست بستہ سلام عرض کر دیجیے گا۔

یوسف شاہ: اچھا، یہ تو سمجھ میں آ گیا۔ اب یہ بتا دیجیے کہ توبہ کن کن چیزوں سے کروں اور کب کروں؟

حبہ خاتون: توبہ کرنا ہو تو اسی وقت کر لیجیے۔ اس کے بعد کی توبہ سے مجھے دلچسپی نہیں۔

یوسف شاہ: مگر قاضی صاحب اس کے بغیر راضی کیسے ہوں گے۔

حبہ خاتون: یہ آپ بابا خلیل اللہ پر چھوڑ دیجیے گا۔

یوسف شاہ: اچھا، ان کو آپ سبق پڑھا چکی ہیں۔

(چوبدار اندر آتا ہے اور آداب بجالاتا ہے)

چوبدار: ظل اللہ! حضرت بابا خلیل اللہ، قاضی ابو محمد اور ان کے چند شاگرد تشریف لائے ہیں۔ فرماتے ہیں ظل اللہ نے انھیں یاد فرمایا ہے۔

حمہ خاتون: انھیں بلوالو۔

(چوبدار چلا جاتا ہے۔ یوسف شاہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ اپنے کپڑے درست کرتا ہوا اوٹ کی دوسری طرف آتا ہے اور ایک دو قدم دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

یوسف شاہ: (ذرا جھوم کر)

کردم ز شراب ناب توبہ وز گفتنِ ناصواب توبہ

حمہ خاتون: بس بس عالی جاہ، اتنی توبہ کافی ہے۔

(دروازے سے پہلے چوبدار داخل ہوکر آداب بجالاتا ہے۔ پھر بابا خلیل اللہ آتے ہیں۔ ان کے پیچھے قاضی ابومحمد اور ان کے چند شاگرد۔ بابا خلیل اللہ مسکرا کر، قاضی ابومحمد غیر جانب دار لہجے میں 'السلام علیکم' کہتے ہیں۔ قاضی صاحب اور ان کے شاگرد دیوانِ خاص کی دیواروں اور چھت کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ اسی دوران تین آدمی اور جو اپنے کپڑوں میں ساز چھپائے ہیں چپکے سے داخل ہوتے ہیں اور ایک کونے میں بیٹھ جاتے ہیں۔)

یوسف شاہ: (قاضی ابومحمد کی طرف بڑھ کر) السلام علیکم (مصافحہ کرتا ہے) آپ نے میرے اوپر بڑا کرم کیا جو اس وقت تشریف لائے۔ تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں (تخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آج اس تخت کو زینت بخشیے۔

(قاضی ابومحمد کے چہرے سے خوشی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر وہ سر ہلا کر فرش پر دوزانو بیٹھ جاتے ہیں)

بابا خلیل اللہ: عالی جاہ! علم اور عالم کے احترام کے لیے کافی ہے اگر آپ ہمارے ساتھ فرش پر تشریف رکھیں (بابا خلیل اللہ قاضی ابومحمد کی بغل میں بیٹھ جاتے ہیں اور یوسف شاہ کو اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں) چوبدار پیالیوں میں چائے لاتے ہیں اور سب کو پیش کرتے ہیں جب سب چائے کے دو ایک گھونٹ پی چکتے ہیں تو بابا خلیل اللہ قاضی ابومحمد سے مخاطب ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب یہ تکلف کرنے اور بات کو طول دینے کا وقت نہیں ہے۔ جیسا کہ میں آپ

سے عرض کر رہا تھا آپ کی تلقین کا عالی جاہ اور ملکہ جہاں......

یوسف شاہ: قاضی صاحب، حبہ خاتون آپ کی خدمت میں دست بستہ سلام عرض کرتی ہیں۔

قاضی ابو محمد: (اسی غیر جانب دار لہجے میں) وعلیکم السلام۔

باباخلیل اللہ: عالی جاہ اور ملکہ جہاں پر آپ کی تلقین کا بہت اثر ہوا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دربار کی پرانی روایتیں چلی آ رہی ہیں۔ بہت سے لوگوں کی پرورش اس پیشے کے ذریعے ہوتی ہے جسے آپ نے حرام قرار دیا ہے۔ عالی جاہ اور ملکہ جہاں کی درخواست ہے کہ آپ انھیں اس بارے میں ہدایت دیں کہ راگ اور گانے کی کون سی شکل جائز ہے اور کون سی نہیں ہے۔ غزل کے کون سے مضمون مناسب ہیں کون سے نہیں ہیں۔ مثلاً غزل میں معشوق کا ذکر تو جائز ہے؟

قاضی ابو محمد: اگر اس سے مراد معشوق حقیقی ہو۔

باباخلیل اللہ: معشوق حقیقی کا تصور انسان کو بےخود کر سکتا ہے؟

قاضی ابو محمد: بے شک کر سکتا ہے۔

باباخلیل اللہ: معشوق حقیقی سے لگاؤ پیدا کرنے کے لیے انسان لَے سے غزل پڑھ سکتا ہے۔

قاضی ابو محمد: ہاں مگر اس طرح نہیں کہ گانے کا مزا غالب آ جائے۔

باباخلیل اللہ: عالی جاہ اور ملکہ جہاں چاہتے ہیں کہ آپ چند غزلیں سن لیں اور ان کے بارے میں ارشاد فرمائیں کہ کس کا مضمون مناسب ہے، کس کا نہیں، بعض غزلیں تحت اللفظ پڑھی جائیں گی۔ بعض لے سے۔ آپ نغمے کی حد بھی مقرر فرما دیجیے۔ عالی جاہ اور ملکہ جہاں وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کی ہدایت کی ہر طرح پابندی کی جائے گی اور لہو و لعب سے پرہیز کیا جائے گا......دل نواز ذرا قریب آ جاؤ۔

(ان تینوں آدمیوں میں سے ایک، جو کونے میں بیٹھے ہیں، آ کر سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ساز بھی ہے)

قاضی ابو محمد: ساز کے ساتھ غزل پڑھنا بھی حرام ہے۔ ساز کو الگ رکھ دو۔

(دل نواز ساز کو الگ رکھ دیتا ہے)

دل نواز: (پہلے تحت اللفظ، اور رفتہ رفتہ لَے کے ساتھ)

اے نسیمِ سحر آرام گہِ یار کجاست
منزلِ آں مہِ عاشق کش عیار کجاست

قاضی ابو محمد: اس شعر کا مضمون مشتبہ ہے۔

شب تار است ورہِ وادیِ ایمن درپیش
آتشِ طور کجا، وعدۂ دیدار کجاست

قاضی ابو محمد: اس شعر پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہر کہ آمد بہ جہاں نقشِ خرابی دارد
درخرابات بُپرسید کہ ہشیار کجاست

قاضی ابو محمد: (ذرا متاثر ہو کر) اس میں 'خرابات' کا لفظ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

بابا خلیل اللہ: اب کوئی اور غزل سناؤ۔ رنگ بدلتا رہے تو اچھا ہے۔

دل نواز: (ذرا دیر گنگنا کر، لَے سے)

صبا بلطف بگو آن غزالِ رعنارا
کہ سربکوہ و بیاباں تو دادۂ مارا

قاضی ابو محمد: سبحان اللہ۔ سبحان اللہ (جھومتے ہیں)

غرورِ حسن اجازت مگر نہ دادا ے گل
کہ پرسشے نہ کنی عندلیب شیدارا

قاضی ابو محمد: واہ، وا، سبحان اللہ۔

(دل نواز گویا بے خیالی میں ساز کو ذرا چھیڑتا ہے)

قاضی ابو محمد: نہیں، نہیں، ساز نہیں ساز نہیں۔ ورنہ لہو ولعب کا احتمال ہو جاتا ہے...... (جھوم کر)

غرورِ حسن اجازت مگر نہ دادا ے گل

(دل نواز اسی شعر کو زیادہ ترنم کے ساتھ دہراتا ہے پھر آگے گاتا ہے)

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفانِ بادہ پیمارا

ندانم از چہ سبب رنگ آشنائی نیست
سہی قدانِ سیہ چشم ماہ سیمارا

کہ خالِ مہرووفا نیست روئے زیبارا
کہ خالِ مہرو وفا نیست روئے زیبارا

صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنارا
صبابلطف بگو......

(اس غزل کے ختم ہوتے ہی حبہ خاتون ایک غزل ساز کے ساتھ گانا شروع کردیتی ہے۔ قاضی ابومحمد اچانک عورت کی آواز سن کر گھبرا جاتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ پہلے خاموش رہتے ہیں پھر خود لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ دل نواز ان کی حالت کوغور سے دیکھتا رہتا ہے اور جیسے ہی اسے خیال ہوتا ہے کہ قاضی ابومحمد اعتراض نہ کریں گے وہ نے اٹھانے لگتا ہے اور ساز کو بھی آہستہ آہستہ چھیڑنے لگتا ہے)

حبہ خاتون:

گرچشم پوشم از تو بہ دل جلوہ گرتوئی
وز دیدہ باز بازکنم در نظر توئی

گہہ در لباس ناز گہے خرقۂ نیاز
ہرلحظہ جلوہ گر بہ لباس دگر توئی

چوں زلف خویش قصہ مطول چراکنی
از عرش تابہ فرش سخن مختصر توئی

(تیسرے شعر کے بعد حبہ خاتون ذرا رک جاتی ہے۔ دل نواز نئی غزل شروع کر دیتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتا ہے کہ قریب آجائیں۔ اب قاضی صاحب کے سامنے تینوں قوال ہیں۔ اوٹ کے پیچھے سے حبہ خاتون بھی لے اٹھاتی رہتی ہے)

قوال:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

(حبہ خاتون اسی شعر کو دہراتی ہے۔ پھر دل نواز کے ساتھی)

پَرِی پیکر نگارے سرو قدے لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ من بودم

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ من بودم

بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم
نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

(حبہ خاتون اور قوال اسی طرح مصرعوں کی الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں قاضی ابو محمد پر حال کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے)

دل نواز:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو

حبہ خاتون: خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو

قوال: خدا خو دمیر مجلس بود اندر لامکاں خسرو

دل نواز: محمد شمع محفل بود شب جاے کہ من بودم

سب: محمد شمع محفل بود شب جاے کہ من بودم

(قاضی ابومحمد جھومتے ہیں۔ ہاتھ پیر پٹکتے ہیں۔ چیختے ہیں۔ بابا خلیل اللہ، قوال ،اوٹ کے پیچھے حبہ خاتون اور یوسف شاہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قاضی ابومحمد کے شاگرد اس طرح سامنے آجاتے ہیں کہ تماشائیوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ قوالی جاری رہتی ہے)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

(وہی منظر جو کہ دوسرے ایکٹ میں تھا۔ یوسف شاہ تخت پر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے صراحی اور پیالہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیر سے شراب پی رہا ہے۔ ولی عہد، محمد بٹ، علم شیر خاں ماگرے اور دوسرے درباری بیٹھے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کا رخ بادشاہ کی طرف نہیں ہے وہ گویا آپس میں باتیں کرر ہے ہیں۔ اوٹ کے پیچھے حبہ خاتون بیٹھی ہے۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ پس پردہ رہنا اس کے لیے بڑا بار ہے اور اپنی بے بسی پر بہت الجھ رہی ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو دربار میں خاموشی ہے)

محمد بٹ: ظل اللہ نے دیکھ لیا، اسلام آباد سے جو زمیندار شکایتوں کی لمبی فہرست لے کر آیا تھا وہ جھوٹا ثابت ہوا۔ اسے مقام پر لے جا کر ذرا سختی سے جانچ کی گئی تو اس نے قبول کیا کہ وہ صرف حاکم کو بدنام کرنا چاہتا تھا۔ ظل اللہ نے یہ بہت اچھا طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنے خادموں پر ذمہ داری ڈالتے ہیں اور سرکشوں کے روبرو اُن سے باز پرس نہیں کرتے۔

یوسف شاہ: (ایک گھونٹ شراب پی کر) ہاں، میں نے پہلے ہی یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا تو بہت اطمینان رہتا۔

حبہ خاتون: عالی جاہ! یہ کس زمیندار کا ذکر ہے؟

یوسف شاہ: آپ سمجھتی ہیں کہ میں ہر زمیندار کا نام یاد رکھ سکتا ہوں۔ ہوگا کوئی؟

محمد بٹ: حضور، اس کا نام علی محمد ہے۔ آپ ارشاد فرمائیں تو اس کے متعلق دفتر سے تمام کاغذات منگوا کر حاضر کروں۔

یوسف شاہ: (شراب کا ایک گھونٹ اور پی کر) نہیں جی۔ آج کے لیے بس ایک معاملہ کافی ہے...... آخر یہ سید مبارک آتا کیوں نہیں؟

محمد بٹ: ظل اللہ! میں نے تو پہلے ہی خدمتِ عالی میں عرض کیا تھا کہ اسے بلانا بے کار ہے۔ وہ ہرگز نہ آئے گا۔

حبہ خاتون: سید صاحب بہت سچے اور ہمت والے آدمی ہیں۔ وہ ضرور تشریف لائیں گے۔

ولی عہد: ملکہ جہاں، یہ عجیب بات ہے کہ حکومت کا کام کرنے والے جس شخص کو مفسدوں اور غداروں کا سرغنہ کہتے ہیں اسی کا آپ عزت سے ذکر کرتی ہیں۔ اس طرح حکومت کیسے چل سکتی ہے؟

حبہ خاتون: ہاں خواجہ، اس طرح حکومت نہیں چل سکتی۔

یوسف شاہ: پھر آپ کیا چاہتی ہیں، میں کیا کروں؟

حبہ خاتون: میں چاہتی ہوں کہ آپ خود حکومت کریں۔

یوسف شاہ: ملکہ جہاں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی حکومت کا سارا کام کرے۔ جن لوگوں کو میں نے ذمہ دار بنایا ہے ان کا بھی تو کوئی حق ہے۔

حبہ خاتون: جی نہیں عالی جاہ! حق صرف جمہور کا ہے۔

یوسف شاہ: آپ اب جمہور جمہور بہت کہا کرتی ہیں۔ کیا آپ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جمہور میں کوئی اپنا اثر پیدا کر کے مجھ سے تخت و تاج چھین لے گا۔

حبہ خاتون: جب آپ بادشاہ ہیں تو جمہور میں کسی دوسرے کا اثر کیوں ہو؟

یوسف شاہ: آپ نے ابھی سنا ہے کہ سید مبارک نے دار السلطنت میں فساد برپا کرنے کے لیے نمک حراموں کی ایک جماعت تیار کی ہے۔ اس کے بعد بھی آپ جمہور کا نام لیتی ہیں۔

(چوبدار اندر داخل ہو کر آداب بجالاتا ہے)

چوبدار: ظل اللہ! سید مبارک حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔

یوسف شاہ: اسے حاضر کرو

(سید مبارک خاموشی کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور 'السلام علیکم' کہہ کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یوسف شاہ انھیں اوپر سے نیچے تک دیکھتا ہے۔ مگر نشے کے سبب سے اس کی نظر جمتی نہیں)

یوسف شاہ: سید مبارک، ادھر سامنے آؤ۔ ہم نے سنا ہے کہ تم شہر میں فساد کرانے کے لیے ایک جماعت تیار کر رہے ہو۔

سید مبارک: عالی جاہ! آپ جانتے ہیں کہ فقیروں کا کام تالیفِ قلوب ہے۔ میں وہی کر رہا ہوں۔

یوسف شاہ: یہ تالیفِ قلوب کا بالکل نیا طریقہ ہے۔

سید مبارک: مجھ سے لوگ اپنی مصیبتیں بیان کرتے رہتے ہیں میں جس طرح سمجھ میں آتا ہے ان کو تسلی دیتا ہوں۔ اب کچھ عرصے سے لوگوں میں پریشانی بہت بڑھ گئی ہے۔ انھیں اس کا دکھ ہے کہ عالی جاہ انھیں دیدار کا کوئی موقع نہیں عنایت فرماتے۔ ان کے حال کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ جو فریاد کرنے آتا ہے اس کے ساتھ اور بھی زیادہ سختی کی جاتی ہے۔ اب وہ میرے گرد جمع ہوا کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ ان کی شکایتیں آپ تک پہنچاؤں۔

محمد بٹ: جہاں پناہ! یہ بات کس قدر غلط ہے کہ آپ رعایا کے حال سے باخبر نہیں۔ حکومت کا سارا کام دستور کے مطابق ہو رہا ہے اور کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کی جاتی۔ لیکن بعض لوگ ہیں جو اپنی بدنیتی کی وجہ سے سرکشوں کی حمایت کرتے ہیں اور فتنے کی آگ کو بھڑکاتے رہتے ہیں۔

سید مبارک: عالی جاہ! مجھے پورا یقین ہے کہ آپ رعایا کو آسانی سے مطمئن فرما سکیں گے۔ اس لیے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر عالی جاہ کو منظور ہو تو میں کل یا پرسوں لوگوں کو عیدگاہ میں جمع

کروں اور آپ ان کی تسلی فرمادیں۔

علم شیر خاں ماگرے: ظل اللہ، مجھے اس میں عذر ہے۔ مجھے شہر کا حال معلوم ہے اور اس کی بنا پر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ظل اللہ کا ایسے مجمع میں تشریف لے جانا جس میں بدمعاشوں اور غنڈوں کو مرعوب رکھنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو بہت خطرناک ہوگا۔

سید مبارک: عالی جاہ۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آپ کی رعایا آپ سے بہت محبت کرتی ہے اور آپ کو اپنے بیچ میں دیکھ کر اسے بہت تسلی ہوگی۔ آپ اپنی رعایا پر اعتبار فرمائیے۔

حبہ خاتون: عالی جاہ، میری بھی یہی درخواست ہے۔

ولی عہد: جہاں پناہ! آپ رعایا پر اعتبار ضرور فرمائیں۔ مگر اس کے ساتھ احتیاط بھی لازمی ہے۔

سید مبارک: عالی جاہ! میں اس کا ذمہ لے سکتا ہوں کہ لوگ احترام اور عاجزی کے ساتھ اپنی شکایتیں بیان کریں گے اور کسی قسم کی بے ادبی نہ ہوگی۔

محمد بٹ: ظل اللہ، جب کسی کا آپ کی رعایا پر اتنا اثر ہے کہ وہ فوج کے بغیر آپ کی سلامتی کا ذمہ لے سکے تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس نے اپنے اثر سے کام لے کر فساد کو دبایا کیوں نہیں۔

یوسف شاہ: تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔

سید مبارک: عالی جاہ! اس وقت رعایا کی دل جوئی کی ضرورت ہے۔ یہ آپ ہی فرما سکتے ہیں۔ اب میرا اثر لوگوں کو روک نہیں سکتا۔

محمد بٹ: ظل اللہ، مجھے اس پر اعتراض ہے کہ اس طرح آپ کے اور آپ کے خادموں کے طرزِ عمل کی شکایت کی جائے۔ کیا آپ اپنی رعایا کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ کیا آپ حکومت کے فرائض کو انجام نہیں دے رہے ہیں۔ یہ دل جوئی کرنے کا مطالبہ مجھے صرف ایک بہانہ معلوم ہوتا ہے۔

یوسف شاہ: (یکبارگی طیش میں آکر) دیکھو، سید مبارک، اب میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا۔ یہ فساد تمھاری وجہ سے ہو رہا ہے اور اسے دور کرنا بھی تمھارا ہی فرض ہے۔ تم اسی وقت جاؤ اور بغاوت کے جذبے کو لوگوں کے دلوں سے نکالو، ورنہ جو کچھ ہوگا اس کے تم ذمے دار ہو۔

سید مبارک: عالی جاہ! میں آپ کا حکم بجالانے کی پوری کوشش کروں گا۔ مگر میری درخواست ہے کہ آپ میرے ساتھ اپنے کسی معتبر وزیر کو بھیج دیجیے تاکہ وہ لوگوں کے جوش کا اندازہ کر لے

اور میرے طرزِ عمل کو بھی جانچ لے۔

محمد بٹ: ظلِ اللہ، اس میں بھی آپ کی حکومت کی بڑی سبکی کا اندیشہ ہے۔ لوگ کہیں گے کہ بادشاہ ہاتھ نہیں آیا تو وزیر ہی کو ذلیل کرو۔

یوسف شاہ: (مستی کے غصے میں کانپتے ہوئے) بس کرو، سید مبارک اب جاؤ اور تم سے جو کچھ کہا گیا ہے کرو۔

(سید مبارک سر جھکا کر دیوان خاص سے چلے جاتے ہیں۔ حبہ خاتون بھی اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ یوسف شاہ ایک پیالہ بھر کر پیتا ہے)

محمد بٹ: ظلِ اللہ نے اس وقت ایسی دوراندیشی سے کام لیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ سید مبارک آپ کے دبدبہ اور شان سے مرعوب نہ کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ سلطنت کا تختہ پلٹ جائے۔ اب ظلِ اللہ اجازت دیں تو خادم جا کے دیکھے کہ سید مبارک کیا کرتا ہے۔

یوسف شاہ: ہاں جاؤ۔

(یوسف شاہ اشارے سے دربار برخاست کرتا ہے۔ درباری اور مصاحب سب چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے یوسف شاہ اکیلا رہتا ہے۔ پھر ایک خواص آ کر اوٹ ہٹاتی ہے۔ اسی وقت حبہ خاتون دیہاتی عورت کے لباس میں داخل ہوتی ہے۔ یوسف شاہ اسے غور سے دیکھنے کے بعد ہی پہچان پاتا ہے)

یوسف شاہ: یہ کیسا لباس پہن کر آئی ہو؟

حبہ خاتون: یہ وہی لباس ہے جو میں محل میں آنے سے پہلے پہنا کرتی تھی...... میں اتنے برس محل میں رہ کر آپ کے دل میں رعایا کی محبت نہیں پیدا کر سکی۔ اب میں چاہتی ہوں کہ جا کر رعایا کے دل میں آپ کی محبت پیدا کروں۔

یوسف شاہ: (حیرت سے) آپ کیا چاہتی ہیں؟

حبہ خاتون: میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے ایک گمنام عورت کی طرح زندگی گزارنے کی اجازت دے دیں۔

یوسف شاہ: اور میں کیا کروں؟

حبہ خاتون: آپ کے اختیار میں پورا ملک ہے، ہزاروں آدمیوں کی عزت، جان، مال، آسودگی ہے۔ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

یوسف شاہ: (سوچ کر) یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

حبہ خاتون: میں محل سے چلی جاؤں گی تو ہر بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔

یوسف شاہ: (پھر ذرا دیر سوچ کر) یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

حبہ خاتون: آپ کے وزیر اور مصاحب آپ کو جو مشورہ دیتے ہیں وہ فوراً آپ کی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ میں آپ سے کچھ کہتی ہوں تو آپ الجھتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی یہ الجھن دور ہو جائے۔

یوسف شاہ: اور آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیں گی؟

حبہ خاتون: میں آپ کے لیے ساتھی تلاش کرنے جا رہی ہوں۔

یوسف شاہ: مجھے آپ کے علاوہ اور کوئی ساتھی نہیں چاہیے۔

حبہ خاتون: (بڑی مایوسی کے لہجے میں) میرا آپ کا ساتھ مدت ہوئی چھوٹ گیا۔

یوسف شاہ: (رفتہ رفتہ متاثر ہو کر) ملکہ جہاں، کل صبح تک تو ٹھہر جایئے۔

حبہ خاتون: کل صبح نہ آپ اس محل میں ہوں گے۔ نہ میں ہوں گی۔

یوسف شاہ: (گھبرا کر) کیوں؟

حبہ خاتون: مجھے محل میں رہنے کی اب خواہش نہیں...... (منہ پھیر کر) آپ اس محل کے لائق نہیں رہے۔

یوسف شاہ: (لجاجت سے) ملکہ جہاں! کوئی بات تو کہیے جو میری سمجھ میں آ جائے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ اب میں شراب زیادہ پینے لگا ہوں، لیکن آپ اصرار کریں تو میں اس سے بالکل توبہ کر لوں گا۔ آپ کو میرے وزیروں سے شکایت ہے تو جسے آپ حکم دیں سولی پر چڑھا دوں۔ مگر اب اپنا ارادہ بدل دیجیے۔ جا کر وہ شاہانہ لباس پہن لیجیے جو آپ ہی کو زیب دیتا ہے۔ کل جب میرے حواس ٹھیک ہو جائیں گے تو آپ مجھے سمجھایئے گا کہ کیا کروں۔

(حبہ خاتون حسرت کے ساتھ یوسف شاہ کی طرف دیکھتی رہتی ہے اور کوئی جواب نہیں دیتی)

یوسف شاہ: ملکہ جہاں، آخر میں کیا کروں۔ آپ دیوان میں بیٹھتی ہیں۔ حکومت کے معاملے سب آپ کے سامنے طے ہوتے ہیں۔ آپ کی جو بات میری سمجھ میں آجاتی ہے اس پر عمل ضرور کرتا ہوں مجھے معلوم ہوتا کہ آپ خفا ہیں......

حبہ خاتون: میں خفا نہیں ہوں۔ ایک رشتے کو جو ٹوٹ گیا ہے پھر سے جوڑنا چاہتی ہوں۔

یوسف شاہ: ملکہ جہاں، آپ نے مجھے بالکل حیران کر دیا ہے۔ اب خدا کے لیے ان باتوں کو چھوڑیے (ادھر ادھر دیکھ کر) آج تو آپ کی قہوہ بھی نہیں آئی۔ نسرین....

(نسرین داخل ہوتی ہے اور آداب بجالاتی ہے)

یوسف شاہ: جاؤ ملکہ جہاں کے لیے قہوہ لاؤ اور چوبدار سے کہو کہ وہ قوالوں کو حاضر کرے۔

نسرین: (ذرا تامل کے بعد) ظل اللہ، اس وقت کوئی چوبدار نظر نہیں آتا۔ میں ہر طرف دیکھ آئی ہوں۔

یوسف شاہ: کیوں سب کہاں غائب ہو گئے؟

نسرین: ظل اللہ، آج شام سے شہر میں بہت شور غل برپا ہے۔ دشمنوں نے یہ خبر مشہور کر دی ہے کہ محل پر حملہ ہونے والا ہے۔

یوسف شاہ: یہ کیا؟ مجھ سے تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ذرا علم شیر خاں کو تو بلاؤ۔

(نسرین چلی جاتی ہے)

یوسف شاہ: یہ سب سید مبارک کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ اسے پہلے ہی قتل کر دینا چاہیے تھا۔

حبہ خاتون: جی ہاں، سیلاب کی خبر لانے والے کا منہ بند کر دیا جاتا تو سیلاب رک جاتا۔ اب اطمینان دلانے والوں کا اطمینان رنگ لا رہا ہے۔

یوسف شاہ: اس کا کیا مطلب ہے؟

حبہ خاتون: عالی جاہ، میری بات کا کبھی کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

یوسف شاہ: (عاجزی سے) آج آپ میری بہت سخت آزمائش کر رہی ہیں۔ آخر بتائیے تو

اب کیا کروں؟

حبہ خاتون: مجھے محل سے چلے جانے کی اجازت دے دیجیے۔

یوسف شاہ: لوگ آپ کو پہچانتے ہیں۔ آپ کا محل سے نکلنا خطرناک ہے۔

حبہ خاتون: لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

(دیوان خاص کا ایک دروازہ زور سے کھلتا ہے۔ اور محمد بٹ انتہائی پریشانی اورخوف کی حالت میں داخل ہوتا ہے)

محمد بٹ: ظل اللہ، غضب ہو گیا۔ شہر میں آپ کے خادم قتل ہو رہے ہیں۔ اور ان کے گھر لوٹے جا رہے ہیں۔ فوج نے افسروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے آپ کے جو خیر خواہ بچ گئے ہیں وہ ادھر ادھر چھپے ہوئے ہیں اور شہر سے بھاگنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ اب حضور کیا حکم ہے۔

یوسف شاہ: ملکہ جہاں اب فرمایئے!

حبہ خاتون: عالی جاہ، آپ کو ابھی تھوڑی دیر ہوئی یقین دلایا گیا تھا کہ آپ کے خادم رعایا کی حالت سے باخبر رہتے ہیں۔ یہ تو انھیں سے پوچھنا چاہیے کہ انھیں منہ چھپانے اور شہر سے بھاگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

محمد بٹ: ظل اللہ، مجھے اب یقین ہے کہ سید مبارک نے آپ کی دشمنی میں غداروں کو فساد پر آمادہ کیا۔

یوسف شاہ: (گھبرا کر) مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

محمد بٹ: لیکن اب اسے غداری کی سزا دینے کے لیے موقع کا انتظار کرنا ہوگا اس وقت تو ہمیں اپنی سلامتی کی تدبیر کرنا ہے۔

یوسف شاہ: ملکہ جہاں اب بتایئے کیا کریں۔

حبہ خاتون: آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔

یوسف شاہ: کہاں چلوں آپ کے ساتھ؟

حبہ خاتون: جمہور کے دل میں۔

یوسف شاہ: اسی جمہور کے دل میں جو مجھے قتل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

محمد بٹ: جہاں پناہ! اب ایسی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نے خزانہ کھلوایا ہے۔ اس میں سے جتنا آسانی سے لے سکیں گے لیں گے۔ دریا کی طرف ایک کشتی تیار ہے اور دوسرے کنارے پر چند لوگ گھوڑے لیے کھڑے ہیں۔ اب دیر نہ کیجیے۔

یوسف شاہ: اور ملکہ جہاں، آپ کیا کریں گی۔

حبہ خاتون: میں زمیندار کی بیٹی ہوں۔ کسی کونے میں گمنامی کی چادر اوڑھ کر بیٹھ جاؤں گی۔

محمد بٹ: (یوسف شاہ کا ہاتھ پکڑ کر) چلیے بفضل اللہ، اب وقت بہت تنگ ہے۔

(محمد بٹ اور یوسف شاہ چلے جاتے ہیں اس کے بعد حبہ خاتون آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے)

(پردہ)

چوتھا ایکٹ

(اسٹیج کے پیچھے کی طرف دائیں جانب ایک نیچی خستہ حال کٹی۔ اس کے قریب چنار کا درخت جس کا صرف تنا دکھائی دیتا ہے پیچھے کی طرف زمین ذرا اونچی ہے۔حبہ خاتون بائیں طرف ایک کپڑے پر سوچ میں بیٹھی ہے۔ صبح کا وقت ہے اور وہ فجر کی نماز پڑھ چکی ہے

عطا محمد داخل ہوتا ہے اور جب تک حبہ خاتون اس کی طرف نہیں دیکھتی دست بستہ کھڑا رہتا ہے۔)

حبہ خاتون: میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ اب مجھے دنیا سے کوئی مطلب نہیں۔مگر آپ مجھے روز صبح کوئی نہ کوئی ایسی خبر سنا دیتے ہیں جس سے طبیعت پریشان ہو جاتی ہے۔

عطا محمد: ملکہ جہاں میں آپ کی ہر بات کی عزت کرتا ہوں۔ سارا کشمیر آپ کی عزت کرتا ہے، آپ کو اپنی آنکھوں کا نور سمجھتا ہے...... آپ دنیا کو بھول جانا چاہتی ہیں۔ آپ نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ کشمیر کو بھول گئی ہوں...... یہ تو آپ کے دل کا درد ہے۔

حبہ خاتون: اچھا تو بتایئے کیا ہوا ہے؟

عطا محمد: آج قاضی ابو محمد آنے والے ہیں۔

حبہ خاتون: قاضی ابو محمد؟...... کیوں؟

عطا محمد: بہت سے لوگ سوچنے لگے ہیں کہ اپنوں کا ظلم بہتر ہے یا غیروں کا انصاف۔ شاید قاضی صاحب اس بارے میں آپ کی رائے دریافت کریں گے۔

حبہ خاتون: آپ نے میری طرف سے کہہ دیا ہوتا کہ غیروں کے انصاف سے بدتر اپنوں کا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔

(خاموشی)

عطا محمد: میں نے شاہ صاحب کی خدمت میں درخواست کی ہے کہ وہ بھی تشریف لے آئیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میں آج خود ہی آنے والا تھا۔

حبہ خاتون: (اپنے آپ سے) شاہ صاحب نے ایک سال حکومت کر کے تخت و تاج چھوڑ دیا۔ ان کی فقیری کی شان بڑھ گئی۔ اب دنیا سمجھتی ہے کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ کوئی ان کے گلے میں پھر بادشاہی کا طوق پہنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ میں چند سال محل میں رہ کر ہمیشہ کے لیے گنہ گار بن گئی۔

(خاموشی)

عطا محمد: (پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے) معلوم ہوتا ہے قاضی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

حبہ خاتون: (اٹھ کر) لیجیے یہ چادر ان کے لیے بچھا دیجیے۔

(عطا محمد چادر اٹھا کر اس جگہ سے پانچ چھ فٹ ہٹ کر بچھا دیتا ہے۔ پھر اسٹیج کے پیچھے کی طرف جا کر چنار کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد قاضی ابو محمد دائیں طرف سے چند لوگوں کے ساتھ آتے ہیں۔ ایک دو لحہ حبہ خاتون کو جو سر جھکائے بیٹھی ہے، دیکھتے ہیں۔ پھر السلام علیکم کہہ کر آگے بڑھتے ہیں یہ سمجھ کر کہ چادر انھیں کے لیے بچھائی گئی ہے۔ جوتے اتار کر اس پر بیٹھ جاتے ہیں)

قاضی ابو محمد: (اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے) اب آپ لوگ تھوڑی دیر کے لیے مجھے تنہا

چھوڑ دیں۔

(ساتھی سب چلے جاتے ہیں۔خاموشی)

قاضی ابومحمد: حبہ خاتون، آپ کی ذات سے کشمیر کو فیض پہنچا ہے اس کا میں آج اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی جتنی عزت آج اور اس وقت ہے اتنی کبھی نہیں تھی۔اسی وجہ سے میں ایک معاملے میں آپ سے گفتگو کرنے آیا ہوں۔ میرے علم کے مطابق اس معاملے میں شبہے کی گنجائش نہیں۔لیکن جب سے آپ نے میری تنبیہہ کی ہے میں اپنے عمل پر ہی بھروسا نہیں کرتا۔

(حبہ خاتون خاموش سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے)

قاضی ابومحمد: آپ دور اندیش اور مردم دوست ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص حبہ کدال پر سے گزرتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ کا خاص منصب مشکلوں کو آسان کرتا رہا ہے۔جب سے آپ نے محل چھوڑا، کشمیر کو چین نصیب نہیں ہوا ہے۔سید مبارک نے ایک سال حکومت کی، پھر الوھر شاہ نے۔آپ کے گیتوں نے یوسف شاہ کے قصور معاف کرادیے اور ان کو مغل دربار سے یہاں کھینچ کر لے آئے۔انھوں نے ہمت نہ ہاری ہوتی تو شاید آپ کی شخصیت شہنشاہ اکبر کو بھی مرعوب کر کے کشمیر کی آزادی کو بچالیتی۔لیکن یوسف شاہ نے پھر شہنشاہ اکبر کے دربار میں پناہ مانگی ہے اور آپ نے اس گوشے میں دنیا سے پناہ لی ہے۔اب یعقوب شاہ کی ہدایت کرنے کے لیے کوئی نہیں اور ہر طرف ظلم وزیادتی کا بازار گرم ہے۔

(خاموشی)

قاضی ابومحمد: کل بھرے دربار میں مفتی عہد قاضی امان اللہ شہید کردیے گئے۔اور ان کی نعش کی وہ بے حرمتی کی گئی جو کسی مجرم کے لیے بھی روا نہیں رکھی جاتی۔

(حبہ خاتون چپکے سے آہ کرتی ہے اور اس طرح جھک جاتی ہے گویا اس کی کمر ٹوٹ گئی)

(خاموشی)

قاضی ابومحمد: ممکن ہے اہل سنت والجماعت کا کوئی پیرو ایسی خبر سن کر غصے میں کوئی فیصلہ کرلے جو حق کے خلاف ہو۔ میں آپ سے دریافت کرنے آیا ہوں کہ جو شخص اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہتا ہو اسے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔

حبہ خاتون: (سوچ کر) اسے ظلم کو شرمندہ کرنا چاہیے۔

قاضی ابومحمد: آپ خود فیصلہ کیجیے کہ ظلم کو شرمندہ کرنے کے مسلک پر کتنے لوگ چل سکیں گے۔

حبہ خاتون: حق پر عمل کرنے کے لیے کم سے کم کتنے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے؟

قاضی ابومحمد: آپ معرفت اور شہادت کی باتیں کر رہی ہیں۔ مجھے جمہور سے سابقہ رہتا ہے۔ وہ ایسی باتیں نہیں سمجھتے۔

حبہ خاتون: جب آپ نے معلوم کرلیا ہے کہ جمہور کی سمجھ میں کیسی باتیں آتی ہیں تو مجھ سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔

قاضی ابومحمد: حبہ خاتون، آپ جانتی ہیں کہ میں کیا کہنے آیا ہوں۔ بادشاہ کے تعصب نے ان لوگوں کے لیے جو مذہبی معاملوں میں اس سے اختلاف کرتے ہیں کشمیر میں رہنا ناممکن کردیا ہے۔ اب وہ یا تو یہ کرسکتے ہیں کہ اپنے مذہب کو بدل دیں۔ یا یہ کہ حکومت کو بدل دیں۔

حبہ خاتون: آپ نے خود ہی مجھ سے بیان فرمایا ہے کہ کشمیر کی حکومت چار مرتبہ بدل چکی ہے۔

قاضی ابومحمد: جی ہاں، اور ہر تبدیلی کے ساتھ وہ زیادہ کمزور ہوتی گئی۔ آگے یہی سلسلہ جاری رہا تو کشمیر تباہ ہو جائے گا۔

حبہ خاتون: حکومت کو مضبوط اور پائیدار ہونا چاہیے۔ میری ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے۔

قاضی ابومحمد: میری بھی یہی آرزو ہے۔ مگر اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ کشمیریوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو استقلال کے ساتھ حکومت کرسکے۔ بادشاہ متعصب ہے، امرا میں پھوٹ پڑگئی ہے۔ عوام کا جوش اعتبار کے قابل نہیں۔

حبہ خاتون: ان کے جوش میں مذہب کے ذریعہ پختگی اور استقلال پیدا کیجیے۔

قاضی ابومحمد: مذہب کے ذریعے استقلال کیسے پیدا کیا جائے۔ جب مذہب خود خطرے میں ہے۔

حبہ خاتون: مذہب تو خطرے سے اور مضبوط ہوتا ہے۔

قاضی ابو محمد: (کچھ سوچ کر) آپ مجھے بار بار چکر دے کر اسی جگہ پر لے آتی ہیں جہاں سے بحث شروع ہوئی تھی۔

حبہ خاتون: قاضی صاحب اگر آپ مجھ سے اس بارے میں مشورہ چاہتے ہیں کہ مغلوں کو کشمیر قبضہ کرنے کی دعوت دی جائے یا نہ دی جائے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری رائے اور میرا رویہ کیا رہا ہے۔ کشمیر کشمیریوں کا ہے اور رہنا چاہیے۔ ان کے اس حق کا مذہب اور سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔

قاضی ابو محمد: مجھے یہ بات اسلام کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ مذہب کے حق پر کسی اور حق کو ترجیح دی جائے۔

حبہ خاتون: میں یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اسلام کو کشمیریوں کی غلامی کا ذریعہ بنایا جائے۔

قاضی ابو محمد: سچے دین کی محبت اور اس کی خدمت کسی کو غلام نہیں بنا سکتی۔

حبہ خاتون: تو قاضی صاحب سچے دین کے علم بردار بن جایئے۔ حاکم اور حکومت کو بدلیے، کشمیر کو ظلم سے بچایئے۔ میں دل اور جان سے آپ کے ساتھ ہوں۔

قاضی ابو محمد: (کچھ سوچ کر) میں دیکھتا ہوں کہ آپ وقت کی مصلحت کو نہیں سمجھ رہی ہیں۔ اب بحث کو بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

حبہ خاتون: جی ہاں...... میری سمجھ میں صرف آزادی کی مصلحت آسکتی ہے۔ مجھ سے بحث کرنے میں کوئی فائدہ نہیں۔

قاضی ابو محمد: میں نے کبھی کوئی رائے معاملے کے ہر پہلو پر غور کیے بغیر نہیں قائم کی ہے۔ بادشاہوں کے عمل کے ساتھ ساتھ جمہور کے عمل پر بھی غور کرتا رہا ہوں آپ مجھ سے اصولی بحث کرتی ہیں، مجھے یہ نہیں بتاتی ہیں کہ کشمیر میں کس کی حکومت قائم کی جائے اور مجھے یقین ہے کہ اس وقت جمہور میں اس کی قابلیت نہیں ہے کہ اپنے حاکم منتخب کریں اور پھر اس کی فرماں برداری کریں...... اچھا اب خدا حافظ کہتا ہوں۔

(حبہ خاتون کوئی جواب نہیں دیتی۔ قاضی ابو محمد جوتا پہن کر آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں)

(خاموشی)

عطا محمد: (قریب آ کر) ملکہ جہاں مجھے معلوم ہوا ہے کہ قاضی صاحب اکبر کے دربار میں جا کر اس کی درخواست کریں گے کہ وہ کشمیر میں سنی حنفی مذہب کو بچانے کے لیے یہاں اپنی حکومت قائم کر لے۔

حبہ خاتون: ہاں، سنی حنفی مذہب کو بچانے کے بہانے سے مغلوں کی فوج آئے گی، بستیوں کو لوٹے گی۔ ہزاروں مردوں، عورتوں کی آبرو کو خاک میں ملائے گی اور آخر میں جب ہمت والے کشمیری سب مر مٹ جائیں گے تو کہا جائے گا کہ کشمیر میں مغل بادشاہ کے اقبال سے امن قائم ہو گیا۔

(خاموشی)

(حبہ خاتون اس طرح بیٹھی ہے جیسے مراقبے میں۔ ہر عمر کے لوگ، جن میں عورتیں بھی ہیں ایک ایک دو دو کر کے جمع ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا روز کا یہی دستور ہے۔ ایک نوجوان بیٹھنے سے پہلے عطا محمد کو ایک پرچہ دیتا ہے۔ عطا محمد اسے پڑھ کر حبہ خاتون کی طرف دیکھنے لگتا ہے اور پھر پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

عطا محمد: ملکہ عالم، خواجہ حبیب اللہ نوشہری نے ایک پیغام بھیجا ہے۔

حبہ خاتون: خواجہ صاحب نے؟............

عطا محمد: جی ہاں، ملکہ جہاں ایک رباعی لکھی ہے۔

حبہ خاتون: سنائیے۔

عطا محمد: فرماتے ہیں:

کار مردانہ بکن کار زناں چیزے نیست
جان خود باز کہ این جان و جہاں چیزے نیست
ذکر ماضی مکن و فکر مضارع بگذار
کہ بدست ہمہ جز نقدِ زماں چیزے نیست

حبّہ خاتون: یہ پیغام کون لایا ہے؟

نوجوان: ملکہ جہاں، آج میں فجر کے وقت خواجہ صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نماز ختم ہوتے ہی انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور فرمایا کہ یہ پرچہ ملکہ جہاں کی خدمت میں جلد سے جلد پہنچا دو۔

حبّہ خاتون: خواجہ صاحب قبلہ کی خدمت میں میرا اسلام عرض کر دیجیے گا اور فرما دیجیے گا کہ انشاءاللہ کل صبح ملاقات کی سعادت حاصل کروں گی، ان کی ہر خواہش میرے لیے حکم ہے۔

نوجوان: بہت مناسب ہے ملکہ جہاں!

حبّہ خاتون: (انتہائی مایوسی کے عالم میں) یا خدا میں کیا کروں؟ ایک طرف سے غلامی اور موت کی دھمکی دی گئی ہے۔ دوسری طرف سے زندگی اور جاں بازی کا حکم آیا ہے۔ میری ہمت کا سرمایہ ختم ہو چکا ہے اب نیا سرمایہ کہاں سے جمع کروں۔

عطا محمد: ملکہ جہاں! قاضی ابو محمد فرما گئے ہیں کہ جمہور حق کی بات نہیں سمجھتے۔ کیا یہ آپ کے دل میں ہمت پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں؟

حبّہ خاتون: (عطا محمد کی طرف اس طرح دیکھتی ہے جیسے پردہ نشین عورت کسی اجنبی کو، جو اچانک سامنے آ گیا ہو) آپ مجھ سے اس طرح کی باتیں کریں گے تو مجھے پھر پردے میں بیٹھنا پڑے گا۔

عطا محمد: ملکہ جہاں، اب آپ کے اور جمہور کے درمیان کسی قسم کا پردہ نہیں رہ سکتا۔ میں جمہور کی ترجمانی کر رہا ہوں۔

ایک نوجوان: عطا محمد بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب آپ ہمارے دلوں کی کیفیت معلوم کیجیے۔ اور ہمیں اپنے دل کی بات بتائیے۔

حبّہ خاتون: میرے دل کی کون سی بات ہے جو سب کو معلوم نہیں؟ پہلے محل کا پردہ تھا۔ اب کھلے میں رہتی ہوں۔

دوسرا نوجوان: ملکہ جہاں، ہمارا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی خواہش اور مرضی گیتوں میں بیان نہ کیجیے۔ ہمیں صاف صاف حکم دیجیے کہ ہم کیا کریں۔ ہم اپنوں سے بے زار ہوں تب بھی ہم

غیروں کی حکومت نہیں چاہتے۔ ہم آزادی اور خودداری کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں۔ آپ ہماری رہنمائی کیجیے۔

(حبہ خاتون ہاتھوں سے چہرے کو بند کر لیتی ہے اور سر ہلاتی ہے)

(خاموشی)

حبہ خاتون: میرا ساتھ دینے سے کسی کو کچھ نہ ملے گا۔

عطا محمد: تو پھر ہمیں سمجھا دیجیے کہ مغلوں کا خیر مقدم کرنے سے ہمیں کیا مل جائے گا۔

(حبہ خاتون پریشان ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنی کٹی کی طرف چلتی ہے۔ مگر قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں تو بیٹھ جاتی ہے۔ عطا محمد لوگوں کو اشارہ کرتا ہے کہ چلے جائیں اور وہ ایک ایک دو دو کر کے چلے جاتے ہیں۔ آخر میں عطا محمد بھی چلا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو اکیلا پا کر حبہ خاتون ہاتھوں سے چہرے اور بانھوں کو ملتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت کو بحال کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں جب سید مبارک آتے ہیں تو اس کی طبیعت بہت بہتر ہوتی ہے)

سید مبارک: حبہ خاتون! کیا بات ہے یہاں آج کوئی نہیں؟

حبہ خاتون: میرے پاس زندگی کا ایک پیام آیا تھا۔ میں اسے برداشت نہ کر سکی، مردہ قبر میں اکیلا ہوتا ہے۔ اس لیے میں اکیلی ہوں۔

سید مبارک: (حبہ خاتون کے قریب بیٹھ کر) خیر کبھی ایک مردے کے پاس دوسرا ملنے کو آ جائے تو اس سے بات تو کر ہی لینا چاہیے۔

حبہ خاتون: شاہ صاحب اس وقت مجھے اپنی زندگی، حسرت اور ناکامی کی مثال معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کوئی بو نہیں، کوئی رنگ نہیں۔

سید مبارک: ہاں مجھے بھی کبھی کبھی خیال آیا ہے کہ تمھاری زندگی کا رنگ زمین کا سا ہے......اس زمین کا سا جس میں زعفران کے پھول ہوتے ہیں...... جب کبھی مجھے ایسا خیال آیا ہے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ دنیا میں اس رنگ کے آدمی بھی ہوتے ہیں۔

حبہ خاتون: زمین کے زرخیز سکون کو میری بے چینی سے کیا نسبت...... میری عمر تڑپتے گزری ہے۔

سید مبارک: تمھاری عمر تڑپتے گزری ہے...... خدا کرے تم صدیوں تک اسی طرح تڑپتی رہو۔

حبہ خاتون: (رو کر) شاہ صاحب یہ کیسی دعا ہے؟

سید مبارک: یہ کشمیر کی آزادی کے لیے دعا ہے...... تم نے کشمیری زبان میں خودداری پیدا کی ہے۔ کشمیریوں کے دل کو آزادی کی ہوا دی ہے۔ خدا کرے یہ ہوا چلتی رہے...... مجھ میں بے چینی اور تڑپ نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ علم اور تصوف نے صبر کا ایسا سبق پڑھایا ہے کہ ظلم اور انصاف، غلامی اور آزادی، موت اور زندگی سب ایک ہی اصلیت کے مختلف رنگ معلوم ہوتے ہیں......

حبہ خاتون: مگر آپ کا ایک طریقہ ہے۔ اور آپ اس پر قائم رہتے ہیں...... میں تنکے کی طرح ادھر ادھر اڑتی رہتی ہوں۔ قاضی ابو محمد کو میں سمجھا سکتی تو شاید وہ اپنا ارادہ بدل دیتے۔ خواجہ حبیب اللہ کی نصیحت پر عمل کرنے کی ہمت ہوتی تو جمہور کو منظم کر کے مغلوں سے لڑنے کی تیاری کرتی......

سید مبارک: ٹھہرو، تم بہت کچھ کر سکتی ہو اور کرو گی۔ تم یعقوب شاہ کو اس سے آگاہ کرو کہ ان کے طرز عمل کا انجام کیا ہوگا۔ وہ تمھارا بہت لحاظ کرتے ہیں۔ تمھارے کہنے سے اثر لیں گے۔ جمہور کو جانبازی پر تم ہی آمادہ کر سکتی ہو...... اس کا حساب نہ لگاؤ کہ آزادی کی قیمت کیا ہے اور کشمیری اس کے لیے کیا دے سکتے ہیں...... جو بعد کو کبھی ہوگا اسے آج کی حقیقت بنادو...... میں نے سنا ہے کہ تم بڈ شاہ کے مزار کا اکثر طواف کرتی ہو؟

حبہ خاتون: جی ہاں، میں سوچتی ہوں کہ شاید اس جگہ سے جہاں کشمیر کا ایک چارہ ساز دفن ہے۔ کوئی دوسرا چارہ ساز پیدا ہوگا۔

سید مبارک: یہ سوچنے کی بات نہیں ہے۔ یقین کی ہے۔ کشمیر کا چارہ ساز پیدا ہوگا، ضرور پیدا ہوگا۔ اس لیے کہ تم اس کے لیے تڑپ رہی ہو۔ تمھاری نظر دل کی نظر ہے۔ اس نے زمانے کے پردوں کو چاک کر کے اس شخصیت کو دیکھ لیا ہے جو کشمیر کو آزاد کرے گی۔ اپنی نظر کا نور جمہور میں پھیلاؤ۔

حبہ خاتون: شاہ صاحب، آپ کیسی نظر اور کیسے دل کا ذکر کر رہے ہیں؟ میں ایک عورت ہوں، عورت کی طرح سے چاہتی ہوں۔ عورت کی طرح سوچتی ہوں۔ میری محبت اندھی اور لاچار ہے۔

سید مبارک: تم کشمیر کو عورت کی طرح چاہتی ہو۔ تمھاری محبت قدرت کی تدبیروں میں سے ایک بڑی تدبیر ہے۔ تم جس طرح سوچتی ہو اور کوئی سوچ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ تم جمہور کو اپنی اولاد سمجھتی ہو۔

حبہ خاتون: مگر شاہ صاحب یہ بھی تو دیکھیے کہ عورت کتنی بے بس ہوتی ہے۔ جب سے عالی جاہ نے کشمیر چھوڑا ہے، میرے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی ہے۔ میری عقل کام نہیں دیتی۔ بس دل دھڑکتا رہتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں بیوی ہوں یا بیوہ، زندہ یا مردہ............میرے گیت کو اب کسی ساز کا سہارا نہیں ملتا۔

سید مبارک: اب زمانے کی کیفیت کو دیکھو اور اپنی کیفیت کو بھول جاؤ۔ اپنے اور جمہور کے درمیان سے حجاب اور تکلف کے پردے اٹھا دو......اپنے گیتوں کو آزادی کا پیام سمجھو۔ آج سے نئی زندگی کی علم بردار بن جاؤ۔

(حبہ خاتون اٹھتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ کُٹی کے اندر جا کر ایک ساز نکال کر لاتی ہے۔ اسے اپنے آنچل سے جھاڑتی ہے اور پھر اس کے سُر ٹھیک کرنے لگتی ہے۔ دوسری طرف عطا محمد داخل ہوتا ہے اور ایک کنارے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ آتے ہیں اور تھوڑی دیر میں دائیں طرف کا اسٹیج بھر جاتا ہے۔ اس وقت کہ جب عقیدت مندوں کو امید ہے کہ گیت شروع ہوگا اور حبہ خاتون کے منھ سے آواز نکلنا چاہتی ہے۔ پردہ گر جاتا ہے۔)

(پردہ)

ہیروئن کی تلاش

کردار (کیرکٹر)

جیوتی پرکاش : ڈراما نویس
مسز مہرا : آرٹ اور آرٹسٹوں کی سرپرست
لالہ سروپ چند : ادب دوست بیوپاری
کیلاش ناتھ : ایک کالج کا لیکچرر
رگھورام : رئیس
شوچرن : بیروزگار ادب دوست نوجوان
کنور ستندر سنگھ :
کنورانی صاحبہ :
کیشوداس : آئی۔اے۔ایس
پورنما : اس کی بیوی
رام رتن : مالدار بیوپاری
نرملا : اس کی بیوی
کملا : نوجوان استانی، مسز مہرا کی بھانجی

پہلا سین

(مسز مہرا کا ڈرائنگ روم۔ مسز مہرا کے علاوہ لالہ سروپ چند، کیلاش ناتھ، رگھورام اور شو چرن بے تکلفی سے بیٹھے ہیں۔ کوئی فرش پر کوئی تخت پر کوئی کرسی پر۔ دوسروں سے کسی قدر الگ کملا دیوار سے پیٹھ لگائے اکڑوں بیٹھی ہے۔ چائے کے برتن ہر طرف بکھرے ہیں۔ چائے دیر ہوئی پی جا چکی ہے۔ برتن نہیں اٹھائے جا سکے، اس لیے کہ فوراً بعد ہی جیوتی پرکاش نے ڈراما سنانا شروع کر دیا۔ پردہ اٹھتا ہے تو جیوتی پرکاش ڈرامے کا آخری جملہ پڑھ رہا ہوتا ہے۔)

جیوتی پرکاش: روپ متی تنبورے کے تاروں کو چھیڑتی ہے، اور اس کے منہ سے گیت کے پہلے بول نکلنے والے ہوتے ہیں کہ پردہ گر جاتا ہے۔

(جیوتی پرکاش کاپی بند کر کے خاموش ہو جاتا ہے اور منہ پر دونوں ہاتھ پھیرتا ہے۔ چند سیکنڈ کے لیے حاضرین میں سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ کملا چپکے سے اٹھ کر باہر چلی جاتی ہے۔)

شو چرن: (سب لوگوں کی طرف دیکھ کر اور یہ سمجھ کر تعریف میں پہل کرنا کہ یہ اسی کا حصہ سمجھا جاتا

ہے۔ضرورت سے زیادہ اونچی آواز اور جوشیلے لہجے میں) واہ واہ جیوتی پرکاش صاحب واہ واہ! آپ نے تو واقعی قلم توڑ دیا ہے۔آپ کا ڈراما صرف ہندستانی ادب نہیں، بلکہ ہندستان کے ادب پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ (جھومتے ہوئے) بہت بڑا احسان! کیوں کاشی ناتھ صاحب میں بجا عرض کر رہا ہوں نا؟

جیوتی پرکاش: حضور ایسی تعریف سے تو بندے کو معاف ہی رکھیے۔

شِو چرن: میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس میں ایک حرف مبالغے کا نہیں ہے۔ آپ کو میری تعریف پر اعتراض ہو، یہ بھی میں سمجھ سکتا ہوں۔آپ کی طبیعت میں انکسار ہوتا تو آپ اتنا بڑا کارنامہ کیسے کر کے دکھاتے، کیوں مسز مہرا۔میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

(جیوتی پرکاش منہ پھیر لیتا ہے، مسز مہرا کوئی جواب نہیں دیتی ہیں۔خاموشی)

رگھورام: (انگڑائی لیتے ہوئے) کسی کے منہ پر اس کی تعریف کرنا مناسب نہیں ہوتا۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک بہت قیمتی چیز ہمارے ہاتھ لگی ہے۔ اور ہمیں چاہیے کہ اس کی پوری قدر کریں۔میرے خیال میں اس ڈرامے کو جلد سے جلد چھپوا دینا چاہیے اور اگر کسی طرح ممکن ہو تو اسے اسٹیج پر دکھانے کا انتظام کرنا چاہیے۔

شِو چرن: واللہ، رگھورام صاحب، اس وقت تو آپ نے وہ بات فرما دی ہے جو ہم سب کے دلوں میں تھی۔ ادب کا قدر دان ہو تو ایسا ہو آپ لوگ مناسب خیال فرمائیں تو میں کل ہی پبلشر سے گفتگو کروں۔اور دس پندرہ دن میں چھپی چھپائی کتاب آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کر دوں اور ڈراما دکھانے کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔میری چند ایسے لوگوں سے واقفیت ہے جو خوشی سے اس میں ایکٹ کرنے پر تیار ہوں گے۔بس آپ لوگوں کے حکم دینے کی کسر ہے۔

(ایک ایک سے نظر ملانے کی کوشش کرتا ہے۔کوئی اس کی طرف نہیں دیکھتا)

مسز مہرا: معاف کرو بھئی شِو چرن ہم کو تمھارا انتظام نہیں چاہیے، اور تم تھوڑی دیر چپ رہو تو دوسروں کو بات کہنے کا موقع ملے۔

لالہ سروپ چند: ہاں بھئی شِو چرن، ذرا دیر چپ بیٹھو۔ڈراما ہم سب کو بھی بہت پسند آیا ہے۔مگر اتنا جوش بھی اچھا نہیں ہوتا، اور یہ سب تمھارے ہی کرنے کے نہیں ہیں۔

شو چرن: آپ نے بجا فرمایا۔ میرا جوش ذرا حد سے گزر گیا۔ مگر آپ اس سے بھی انکار نہ کریں گے کہ جوش میں آنے کی وجہ بہت کافی تھی۔ میں نے اتنا عمدہ ڈراما اب تک سنا ہی نہیں ہے کیوں کیلاش ناتھ صاحب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

کیلاش ناتھ: جی ہاں! آج کل جو ڈرامے لکھے جاتے ہیں وہ فلم دیکھ کر لکھے جاتے ہیں یا Short Story ہوتی ہیں جن میں قصہ بات چیت کے ذریعے بیان ہوتا ہے۔ اور یہ بھی لازمی ہوتا ہے کہ کوئی کسی پر عاشق ضرور ہو جائے۔ جیوتی پرکاش صاحب کے ڈرامے میں ڈرامے کی اصل کیفیت پائی جاتی ہے اس میں Suspence اور Conflict ہے اور اس Conflict کو سلجھایا بھی گیا ہے۔ ڈرامے میں عاشق معشوق نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود اس میں بڑا رس ہے۔

مسز مہرا: (خوش ہو کر، جیوتی پرکاش کی طرف دیکھتے ہوئے) مجھے معلوم تھا کہ جیوتی پرکاش میں ڈراما لکھنے کی خاص صلاحیت ہے۔ جب سے انھوں نے مجھ سے کہا کہ ایسا ڈراما لکھنے کو ان کا جی چاہتا ہے اور اس ڈرامے کا قصہ مجھ کو سنایا تب سے ان کے پیچھے پڑی ہوں کہ کسی طرح سے اس کو لکھ ڈالو۔ بڑی مشکل سے راضی ہوئے۔ پھر تھوڑا تھوڑا سا لکھ کر لے آتے اور سنا کر کہتے کہ اچھا نہیں لگتا ہے۔ پھاڑ کر پھینک دوں گا۔ ایک کام ان سے ڈراما لکھوانا تھا تو دوسرا تھا جو کچھ یہ لکھتے اسے ردی کی ٹوکری سے بچانا۔ اب آپ لوگوں کے کہنے سے شاید مان جائیں کہ ڈراما واقعی بہت اچھا ہے، اور یہ اسے نہ لکھتے تو اپنے اوپر بڑا ظلم کرتے۔

جیوتی پرکاش: آپ بالکل بجا فرماتی ہیں کہ ڈراما آپ ہی کی وجہ سے لکھا گیا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس میں میرا حصہ کتنا ہے۔

شو چرن: جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔ مسز مہرا تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کی قدر دانی اور سرپرستی ادب اور ادیب میں نئی جان ڈال دیتی ہے۔ کیوں رگھو رام صاحب میں بجا عرض کر رہا ہوں نا؟

مسز مہرا: شو چرن، تم سے کہہ چکی ہوں کہ ذرا دیر چپ رہو (دوسروں سے مخاطب ہو کر) آج میں نے آپ لوگوں کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ ایک اچھا ڈراما سنواؤں اور پھر آپ سے مشورہ

کروں کہ اسے دکھانے کا کیا انتظام ہو۔ بات یہ ہے کہ ڈراما کرا دینا تو مشکل نہیں۔ لیکن اس ڈرامے کا دارومدار ہیروئن پر ہے۔ اور میری نظر میں ہیروئن کا پارٹ کرنے کے قابل کوئی ہے نہیں۔ اس کے لیے ایسی عورت چاہیے جو دنیا دیکھ چکی ہو۔ مگر اس کا سن زیادہ نہ ہو۔ جس کے دل میں درد ہو۔ مگر وہ بے فکروں کی طرح ہنس بول سکے، جس کی شکل اچھی ہو۔ آواز اچھی ہو...... یہ ساری خوبیاں ایک جگہ کہاں ملتی ہیں۔

لالہ سروپ چند: جی ہاں۔ ان تمام شرطوں کو پورا کرنا تو بہت مشکل ہے لیکن جب آپ کے اور رگھورام صاحب کے جیسے لوگ تلاش کرنے والے ہوں تو وہ ہر طرح کے آدمی کو ڈھونڈ نکالیں گے۔

رگھورام: (ہاتھ جوڑ کر) نا بابا! مجھے اس کام سے الگ رکھیے۔ ڈراما کرانے میں جو خرچ ہو اس کے لیے میرا حصہ مجھ سے لے لیجیے۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا کہ گھر گھر جا کر لوگوں کی بہو بیٹیوں کا جائزہ لوں۔

شو چرن: معاف فرمایئے گا رگھورام صاحب! آپ نے ساتھ نہ دیا تو کام کیسے بنے گا؟ آپ شہر کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ تمام معزز لوگوں سے آپ کی ملاقات ہے۔ آپ کا تو ہر جگہ ساتھ جانا ضروری ہوگا۔ ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ ہم نہ معلوم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ مسز مہرا، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

مسز مہرا: (رگھورام اور شو چرن کی باتوں کو برا مان کر) نہیں ایسا تو نہیں ہے لیکن رگھورام صاحب کو اس میں تامل ہے کہ ہیروئن تلاش کرنے میں ہمارے ساتھ شریک ہوں تو ہمیں ان پر دباؤ نہ ڈالنا چاہیے۔ یہ کچھ کم نہیں ہے کہ وہ ڈراما دکھانے میں خرچ کا ایک حصہ دینے پر تیار ہیں۔

رگھورام: معاف فرمایئے گا مسز مہرا، میں نے بات اس طرح کہہ دی کہ شاید آپ کو بری لگی۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوگوں کو غلط فہمی میں رکھوں۔ مگر کبھی کبھی بات اس طرح کہہ دیتا ہوں کہ لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ میں ان کا ساتھ دینا نہیں چاہتا...... میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ مجھے ڈرامے کا کالج کے زمانے سے بہت شوق ہے۔ ایک زمانے میں اس شوق کی وجہ سے کچھ بدنام بھی ہو گیا تھا۔ اب فضا بالکل بدل گئی ہے۔ لڑکوں لڑکیوں پر اتنی پابندیاں نہیں رہی ہیں۔ مگر دوسری طرف

فلموں نے نوجوانوں کے مذاق کو بالکل بگاڑ دیا ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کسی کو تھوڑی سی ایکٹنگ آ گئی تو کیا ہوگا۔

جیوتی پرکاش: میں ڈراما لکھ رہا تھا تو مسز مہرا سے کبھی کبھی اس بارے میں مشورہ ہوتا تھا کہ روپ متی کا پارٹ کس سے کرایا جائے۔ سوچتے سوچتے تھک جاتے تو ان کی یا میری زبان سے یہ نکل جاتا تھا کہ اور کوئی عورت نہ ملی تو بمبئی سے جان پہچان کی فلم ایکٹرس کو بلا لیں گے۔ مگر پھر ہم دونوں یہ کہہ اٹھتے تھے کہ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ فلم والوں کو اچھا ڈراما دینا اس کی مٹی پلید کرنا ہے۔ فلم ایکٹنگ ایک بیماری ہے کہ جس کو لگ جائے وہ پھر سچی ایکٹنگ کے لائق نہیں رہتا۔ دوسری طرف مجھے اس کا یقین ہے کہ جو لڑکی یا عورت روپ متی کا پارٹ کرنے پر راضی ہوجائے گی وہ اس طبیعت کی نہ ہوگی کہ فلم ایکٹنگ کو اختیار کرنا درکنار، فلم دیکھنا بھی پسند کرے۔ روپ متی کا پارٹ تو صرف بہت ہی شریف گھرانے کی بہت ہی شریف عورت کرسکتی ہے اور کسی کو یہ پارٹ دیا گیا تو روپ متی کی ہر خوبی ایک عیب بن جائے گی۔

(کملا ایک ٹرے میں، چائے دان، دودھ دان اور شکر دان لے کر آتی ہے اور ٹرے کو ایک طرف رکھ کر پھر باہر چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ دوسری ٹرے پر پیالیاں لاتی ہے۔ اور چائے بنانا شروع کر دیتی ہے۔ جس کے لیے چائے بناتی ہے، اس کی طرف اس طرح دیکھتی ہے کہ گویا یاد کر رہی ہے کہ اسے کس رنگ کی چائے، کتنا دودھ اور کتنی شکر پسند ہے۔ پھر وہ چائے کی ہر پیالی جس کے لیے بناتی ہے اسے دے آتی ہے۔ اور چائے ختم ہونے پر اس کے پاس سے جھوٹی پیالی اٹھا لاتی ہے۔ اس دوران میں گفتگو جاری رہتی ہے۔)

رگھورام: جی ہاں، آپ بجا فرماتے ہیں۔ روپ متی کی شرافت تو ایسی ہونا چاہیے کہ جو ماتھے پر چمکے اور دور سے دکھائی دے۔

شوچرن: مگر رگھورام صاحب، اسی لیے تو ہمیں انتخاب میں آپ کی مدد درکار ہے، جتنے تعلقات یہاں کے شریف خاندانوں سے آپ کے ہیں اتنے اور کسی کے نہیں ہیں۔ بہروپ

کروں کہ اسے دکھانے کا کیا انتظام ہو۔ بات یہ ہے کہ ڈراما کرا دینا تو مشکل نہیں۔ لیکن اس ڈرامے کا دارومدار ہیروئن پر ہے۔ اور میری نظر میں ہیروئن کا پارٹ کرنے کے قابل کوئی ہے نہیں۔ اس کے لیے ایسی عورت چاہیے جو دنیا دیکھ چکی ہو۔ مگر اس کا سن زیادہ نہ ہو۔ جس کے دل میں درد ہو۔ مگر وہ بے فکروں کی طرح ہنس بول سکے، جس کی شکل اچھی ہو۔ آواز اچھی ہو...... یہ ساری خوبیاں ایک جگہ کہاں ملتی ہیں۔

لالہ سروپ چند: جی ہاں۔ ان تمام شرطوں کو پورا کرنا تو بہت مشکل ہے لیکن جب آپ کے اور رگھورام صاحب کے جیسے لوگ تلاش کرنے والے ہوں تو وہ ہر طرح کے آدمی کو ڈھونڈ نکالیں گے۔

رگھورام: (ہاتھ جوڑ کر) نا بابا! مجھے اس کام سے الگ رکھیے۔ ڈراما کرانے میں جو خرچ ہو اس کے لیے میرا حصہ مجھ سے لے لیجیے۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا کہ گھر گھر جا کر لوگوں کی بہو بیٹیوں کا جائزہ لوں۔

شو چرن: معاف فرمائیے گا رگھورام صاحب! آپ نے ساتھ نہ دیا تو کام کیسے بنے گا؟ آپ شہر کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ تمام معزز لوگوں سے آپ کی ملاقات ہے۔ آپ کا تو ہر جگہ ساتھ جانا ضروری ہوگا۔ ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ ہم نہ معلوم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ مسز مہرا، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

مسز مہرا: (رگھورام اور شو چرن کی باتوں کو برا مان کر) نہیں ایسا تو نہیں ہے لیکن رگھورام صاحب کو اس میں تامل ہے کہ ہیروئن تلاش کرنے میں ہمارے ساتھ شریک ہوں تو ہمیں ان پر دباؤ نہ ڈالنا چاہیے۔ یہ کچھ کم نہیں ہے کہ وہ ڈراما دکھانے میں خرچ کا ایک حصہ دینے پر تیار ہیں۔

رگھورام: معاف فرمائیے گا مسز مہرا، میں نے بات اس طرح کہہ دی کہ شاید آپ کو بری لگی۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوگوں کو غلط فہمی میں رکھوں۔ مگر کبھی کبھی بات اس طرح کہہ دیتا ہوں کہ لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ میں ان کا ساتھ دینا نہیں چاہتا...... میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ مجھے ڈرامے کا کالج کے زمانے سے بہت شوق ہے۔ ایک زمانے میں اس شوق کی وجہ سے کچھ بدنام بھی ہو گیا تھا۔ اب فضا بالکل بدل گئی ہے۔ لڑکوں لڑکیوں پر اتنی پابندیاں نہیں رہی ہیں۔ مگر دوسری طرف

فلموں نے نوجوانوں کے مذاق کو بالکل بگاڑ دیا ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کسی کو تھوڑی سی ایکٹنگ آ گئی تو کیا ہوگا۔

جیوتی پرکاش: میں ڈراما لکھ رہا تھا تو مسز مہرا سے کبھی کبھی اس بارے میں مشورہ ہوتا تھا کہ روپ متی کا پارٹ کس سے کرایا جائے۔ سوچتے سوچتے تھک جاتے تو ان کی یا میری زبان سے یہ نکل جاتا تھا کہ اور کوئی عورت نہ ملی تو بمبئی سے جان پہچان کی فلم ایکٹرس کو بلا لیں گے۔ مگر پھر ہم دونوں یہ کہہ اٹھتے تھے کہ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ فلم والوں کو اچھا ڈراما دینا اس کی مٹی پلید کرنا ہے۔ فلم ایکٹنگ ایک بیماری ہے کہ جس کو لگ جائے وہ پھر سچی ایکٹنگ کے لائق نہیں رہتا۔ دوسری طرف مجھے اس کا یقین ہے کہ جو لڑکی یا عورت روپ متی کا پارٹ کرنے پر راضی ہو جائے گی وہ اس طبیعت کی نہ ہوگی کہ فلم ایکٹنگ کو اختیار کرنا درکنار، فلم دیکھنا بھی پسند کرے۔ روپ متی کا پارٹ تو صرف بہت ہی شریف گھرانے کی بہت ہی شریف عورت کر سکتی ہے اور کسی کو یہ پارٹ دیا گیا تو روپ متی کی ہر خوبی ایک عیب بن جائے گی۔

(کملا ایک ٹرے میں، چائے دان، دودھ دان اور شکر دان لے کر آتی ہے اور ٹرے کو ایک طرف رکھ کر پھر باہر چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ دوسری ٹرے پر پیالیاں لاتی ہے۔ اور چائے بنانا شروع کر دیتی ہے۔ جس کے لیے چائے بناتی ہے، اس کی طرف اس طرح دیکھتی ہے کہ گویا یاد کر رہی ہے کہ اسے کس رنگ کی چائے، کتنا دودھ اور کتنی شکر پسند ہے۔ پھر وہ چائے کی ہر پیالی جس کے لیے بناتی ہے اسے دے آتی ہے۔ اور چائے ختم ہونے پر اس کے پاس سے جھوٹی پیالی اٹھا لاتی ہے۔ اس دوران میں گفتگو جاری رہتی ہے۔)

رگھورام: جی ہاں، آپ بجا فرماتے ہیں۔ روپ متی کی شرافت تو ایسی ہونا چاہیے کہ جو ماتھے پر چمکے اور دور سے دکھائی دے۔

شو چرن: مگر رگھورام صاحب، اسی لیے تو ہمیں انتخاب میں آپ کی مدد درکار ہے، جتنے تعلقات یہاں کے شریف خاندانوں سے آپ کے ہیں اتنے اور کسی کے نہیں ہیں۔ ہر روپ

چندصاحب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

مسز مہرا: شو چرن، تم سے چپ کیوں نہیں بیٹھا جاتا، ہر وقت کوئی نہ کوئی بے تکی بات کہہ اٹھتے ہو......رگھورام صاحب اب سب سے پہلا کام یہ ہے کہ روپ متی کے پارٹ کے لیے کسی کو تلاش کیا جائے۔ مجھے اس پر بالکل اصرار نہیں ہے کہ آپ ہر جگہ ہمارے ساتھ چلیں۔ مگر اس کے طے کرنے میں مدد دیجیے کہ ہم جائیں کہاں کہاں۔ میں اپنے کاموں میں لگی رہتی ہوں۔ کبھی اس کا موقع نہیں ملتا کہ اسکولوں اور کالجوں میں جو ڈرامے ہوتے رہتے ہیں انھیں جا کر دیکھوں اور تو اور، ابھی دو برس ہوئے کملا نے اپنے کالج کے ایک ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔ دوسروں سے اس کی تعریف سنی۔ خود مجھے اتنی فرصت نہ تھی کہ اسے جا کر دیکھوں۔ پارٹیوں اور جلسوں اور کمیٹیوں میں بہت سی عورتوں سے ملاقات ہوتی ہے، لیکن ایسی ملاقات میں کسی کی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ان عورتوں میں سے بیشتر کو جانتے ہوں گے، بلکہ ان کے حالات سے بھی اچھی طرح واقف ہوں گے۔ ان کے علاوہ بھی آپ اور لڑکیوں کو جانتے ہوں گے جنھیں ایکٹنگ کا شوق ہے اور جو روپ متی کا پارٹ کر سکتی ہوں گی۔

رگھورام: جناب میں تو اس وقت سے جب جیوتی پرکاش صاحب ڈراما پڑھ رہے تھے سوچ رہا ہوں کہ روپ متی کا پارٹ کس کو دیا جا سکتا ہے......اچھا لایئے ذرا کاغذ پنسل تو دیجیے۔

(کملا اپنے گریبان سے قلم نکالتی ہے اور قریب کی ایک میز پر سے کاپی لا کر رگھورام کو دیتی ہے)

کملا: دیکھیے کاپی پر میرے کلاس کی بچیوں کے نام بھی لکھے ہیں، ان سے بچا کر اپنی لڑکیوں کے نام لکھیے گا۔ نہیں تو آپ اپنی ہیروئن کو تلاش کرنے کے لیے میرے کلاس میں پہنچ جائیں گے۔

رگھورام: (کسی سوچ میں) اچھا تو کیا ہوگا؟

کملا: کچھ نہیں بچیوں کو بڑا مزہ آئے گا۔

مسز مہرا: کملا، آخر یہ ہنسی مذاق کا کیا موقع ہے؟

رگھورام: اچھا تو دیکھیے (سوچ کر) ایک ہے پنڈت دیپ چند کی لڑکی۔ کیوں میاں شو چرن کیا نام

ہے اس کا؟

شو چرن: (آنکھیں مچکا کر) جی اس کا نام اوشا ہے۔ کیوں کیلاش ناتھ صاحب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

کیلاش ناتھ: جی نہیں، اس کا نام کرن ہے۔ وہ خاصی ایکٹنگ کر لیتی ہے مگر شکل اچھی نہیں ہے۔ ہوں، کچھ ایسی بری بھی نہیں ہے، مگر اس میں روپ متی کا حسن پیدا کرنے کے لیے ذرا محنت کرنا پڑے گی۔

رگھورام: اچھا دوسری ہے کیلاش۔ وہ گاتی بہت اچھا ہے......

شو چرن: جی ہاں، جی ہاں، اس کا گانا میں نے بھی سنا ہے۔ بہت سریلی آواز ہے۔ اور وہ ترقی پسند بھی ہے۔ اس ڈرامے میں پارٹ کرنے پر بڑی خوشی سے راضی ہو جائے گی۔ کیوں، سروپ چند صاحب۔ آپ بھی تو اسے جانتے ہیں نا؟

لالہ سروپ چند: جی ہاں، میں اسے جانتا ہوں، بلکہ ایک دو ڈراموں میں اسے ایکٹ کرتے بھی دیکھا ہے۔ آواز اچھی ہے۔ ترقی پسندی کی اس میں کمی نہیں۔ لیکن آپ اسے منتخب کریں تو اس کی ترکیب بھی سوچ لیجیے گا کہ گول مٹول آدمی کو سڈول کیسے بنایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی چھوٹی بہن زیادہ موزوں رہے گی۔ اس کا قد اچھا ہے۔ رنگ صاف ہے۔ شکل بھی بری نہیں۔ معلوم نہیں آپ میں سے کسی نے اس کو دیکھا ہے یا نہیں۔

رگھورام: بھئی آپ کی جو شرطیں ہیں انھیں پورا کرنا بہت مشکل ہے...... اچھا بتائیے آپ میں سے کسی نے کنورانی سندر سنگھ کو دیکھا ہے؟

مسز مہرا: جی ہاں، میں ایک دو مرتبہ ان سے پرائم منسٹر کے یہاں مل چکی ہوں...... واہ واہ رگھورام صاحب، آپ نے بھی بس خوب یاد کیا۔ ایسی خوبصورت عورت اور اتنے اچھے کپڑے پہنتی ہے کہ جو اس کی طرف ایک مرتبہ دیکھ لیتا ہے، وہ نظر کو نہیں ہٹا پاتا۔ اور طریقے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تہذیب کو عورت کے کپڑے پہنا دیے گئے ہوں...... ہاں رگھورام صاحب کنورانی کا نام اپنی فہرست میں سب سے اوپر لکھ لیجیے۔ وہ راضی ہو جائیں تو مجھے کام بن گیا۔ اور ان کا نام سیکڑوں آدمیوں کو ڈراما دیکھنے کے لیے کھینچ لائے گا۔

لالہ سروپ چند: صاحب، ان کا نام تو بے شک بہت بڑا ہے۔ ان کے حسن کی بھی میں نے بہت تعریف سنی ہے۔ مگر انھوں نے کبھی کسی ڈرامے میں ایکٹ بھی کیا ہے؟

شو چرن: (جوش کے ساتھ) انھوں نے پہلے ایکٹ نہیں کیا ہے تو کوئی حرج نہیں، ایکٹنگ کا نیا اصول یہ ہے کہ بناوٹ بالکل نہ ہو، آدمی بس جیسا ہے ویسا ہی رہے، اسی طرح بولے، اسی طرح چلے پھرے۔ ہمارے لیے شاید یہ اچھا ہی ہوگا۔ اگر کنورانی صاحبہ نے پہلے کسی ڈرامے میں حصہ نہیں لیا ہے۔ کیوں جیوتی پرکاش صاحب، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

لالہ سروپ چند: ارے میاں شو چرن، ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔ کنورانی صاحبہ بہت بڑی آدمی ہیں۔ انھیں ایکٹنگ کے نئے طریقوں کی تعلیم کون دے گا؟ تم؟

(خاموشی)

رگھورام: ہاں، ایک اور یاد آئی، کیشو داس، آئی، اے ایس کی بیوی پورنما۔ اس کی شادی ابھی ابھی ہوئی ہے۔ اتنی تو نہیں بدلی ہوگی کہ پچھلی باتیں سب بھول جائے۔ کالج میں تھی تو بڑی تیز تھی ڈبیٹس میں، ڈراموں میں خوب حصہ لیا کرتی تھی۔ کئی انعام بھی ملے۔ شکل اچھی ہے، آواز اچھی ہے، چال ڈھال اچھی۔ پرانے شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ میرے خیال میں وہ آپ کی سب شرطیں پوری کرتی ہے۔

شو چرن: تو بس کیا ہے، مسز کیشو داس سے ہی کہیے، کنورانی صاحبہ کے پاس جانے کی اب ضرورت نہیں۔ ہم آخر رئیسوں کی خوشامد کیوں کریں جب ہمارا کام اس کے بغیر چل سکتا ہے؟ کیوں، کیلاش ناتھ صاحب، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

کیلاش ناتھ: جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، مگر کنورانی صاحبہ سے ملاقات کر لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔

رگھورام: اچھا، تو یہ دو نام ہوئے۔ اب تیسرا؟

کیلاش ناتھ: تیسرا میں پیش کرتا ہوں۔ میری ایک اسٹوڈنٹ تھی نرملا۔ بڑی شرمیلی تھی۔ ہمیشہ سب سے پیچھے بیٹھتی تھی۔ اور باتیں بھی بہت کم کرتی تھی، مگر صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ بڑی مہذب، اچھی طبیعت کی لڑکی ہے۔ اس نے ایک دو ڈراموں میں ایکٹ بھی کیا

اور خاصی کامیاب رہی۔ اس میں ہمت کی کمی نہیں ہے۔ دوسری لڑکیوں سے معلوم ہوا کہ اس کی آواز بھی اچھی ہے۔ اب اس کی لکھ پتیوں کے ایک خاندان میں شادی ہوگئی ہے۔ شوہر کا نام شاید رام رتن ہے۔

لالہ سروپ چند: جی ہاں، آپ بھی کہاں بنیوں میں پہنچ گئے۔ ہم کو اور ہماری عورتوں کو ایکٹنگ و یکٹنگ سے کیا نسبت، ہم تو صرف روپیہ کمانا جانتے ہیں۔

مسز مہرا: بھئی سروپ چند صاحب اب برہمن اور بنیے کا قصہ نہ شروع کیجیے۔ ہمیں ہیروئن کی تلاش ہے۔ وہ جہاں بھی مل جائے گی غنیمت سمجھیں گے...... اچھا بھئی سنیے، اب ہمارے پاس تین نام ہو گئے ہیں۔ کنورانی ستندر سنگھ، پورنما کیشو داس اور نرملا رام رتن۔ پہلے دیکھنا ہے کہ ان میں سے کوئی ہمارے مطلب کی ہے یا نہیں۔ کوئی ٹھیک نہ نکلی تو پھر دیکھا جائے گا۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جلد شروع ہو جانا چاہیے، دیکھو کملا، ذرا کنورانی صاحبہ کو فون کرواور کہو کہ مسز مہرا آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ تم بس انھیں اطلاع کرادو۔ بات میں خود ہی کروں گی۔ بڑی مزاج کی معلوم ہوتی ہیں۔

(کملا اس دروازے سے جو پشت پر ہے چلی جاتی ہے)

شو چرن: مسز مہرا، مجھے تو آپ کی مستعدی پر تعجب ہوتا ہے۔ جو کام اٹھاتی ہیں بس ختم کر کے ہی چھوڑتی ہیں۔ کیوں رگھورام صاحب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

رگھورام: جی ہاں، مسز مہرا کی مستعدی تو مشہور ہے۔ جو کام اور کسی کے بس کا نہ ہو وہ ان سے کرا لیجیے۔

لالہ سروپ چند: جی ہاں صاحب! ہمارے تو نہ جانے کتنے کام آپ کی وجہ سے بن گئے۔

مسز مہرا: جی بس رہنے دیجیے۔ آپ ایسی ہی تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔

(کملا بہت اطمینان سے اندر آتی ہے)

کملا: کنورانی صاحبہ نے فرمایا ہے کہ آپ چاہیں تو اس وقت تشریف لے آئیں اور اگر اس وقت مناسب نہ ہو تو کل دس بجے یا سہ پہر کو پانچ بجے۔ میں نے یہ بھی بتادیا ہے کہ آپ کس غرض سے ملنا چاہتی ہیں۔

مسز مہرا: یہ سب گفتگو آپ نے فرمائی؟

کملا: جی میں انھیں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ میرے اسکول میں آچکی ہیں، اور ایک مرتبہ مجھے چائے پر بلایا تھا۔

رگھورام: لیجیے اور یہ سب آپ نے ہمیں بتایا ہی نہیں۔

کملا: اس میں بتانے کی کیا بات تھی؟

مسز مہرا: اور جب تم نے ڈرامے کا ذکر کیا تو انھوں نے کیا کہا؟

کملا: انھوں نے کہا آؤ گی تو بات کرلیں گے۔

مسز مہرا: کچھ انھیں ناگوار تو نہیں ہوا؟

کملا: اس میں ناگواری کی کیا بات تھی؟

مسز مہرا: اچھا تو بتایئے۔ اس وقت تو جانا مشکل ہے کل دس بجے چلیں۔

کملا: دس بجے تو میرا اسکول ہوگا۔

(مسز مہرا کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر پھر رک جاتی ہیں)

لالہ سروپ چند: خیر کیا ہوا دس بجے نہیں تو پانچ بجے سہ پہر کو چلیں گے۔ میرے خیال میں پانچ بجے کا وقت سب کے لیے زیادہ مناسب رہے گا۔

مسز مہرا: اچھا تو آج کا کام تو ختم ہوگیا۔ اب کل ساڑھے چار بجے آپ سب یہاں جمع ہوجائیں۔ پھر کنورانی کے یہاں ساتھ چلیں گے۔

رگھورام: دیکھیے صاحب! میں نے پہلے کہہ دیا تھا کہ میں کہیں ساتھ نہیں جاؤں گا۔ مجھے تو معاف رکھیے۔

کیلاش ناتھ: اور مجھے بھی۔ مجھے کل چھ بجے تک کالج میں کام ہے۔

شو چرن: واہ صاحب، آپ خوب نکلے جا رہے ہیں اور آپ کملا صاحبہ؟

کملا: میں سوچ رہی ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔

مسز مہرا: تمھاری یہی شان ہے۔

(سب کھڑے ہوجاتے ہیں۔ آداب عرض، نمستے کہہ کر اور ہاتھ ملا کر رخصت ہوجاتے ہیں)

(پردہ)

دوسرا سین

(کنورانی ستندر سنگھ کا ڈرائنگ روم۔ اس کا ایک دروازہ بائیں طرف ہے، یہ دکھائی نہیں دیتا، دوسرا پشت پر ہے۔ کمرہ آراستہ ہے، مگر اس سے دولت مندی کا احساس نہیں ہوتا۔ پردہ ہٹتا ہے تو کچھ دیر کمرہ خالی رہتا ہے۔ پھر بائیں طرف سے مسز مہرا، جیوتی پرکاش، شوچرن اور سروپ چند داخل ہوتے ہیں اور مناسب جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ مسز مہرا اس صوفے کے قریب جس پر غالباً کنورانی صاحبہ بیٹھنے والی ہیں، جیوتی پرکاش ان کے پاس۔ کنورانی صاحبہ داخل ہوتی ہیں تو سب کھڑے ہوجاتے ہیں اور اس طرح سلام کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کنورانی صاحبہ بہت زیادہ ادب اور لحاظ کی مستحق ہیں۔ جب تک وہ خود بیٹھ نہیں جاتیں سب کھڑے رہتے ہیں۔ کنورانی کے کپڑے نسبتاً سادے ہیں، مسز مہرا کے سادہ مگر قیمتی)

کنورانی: مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ سب تشریف لائے۔ آپ لوگوں سے ملنے کا شرف بہت کم حاصل ہوتا ہے۔

شوچرن: سبحان اللہ، اس انکسار کو دیکھیے ......

(مسز مہرا، شو چرن کو اس طرح گھورتی ہیں کہ وہ جلدی سے منہ بند کر لیتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ کسی نے اس کی آواز نیچے سے کاٹ دی ہے)

مسز مہرا: اصل میں قصور ہم لوگوں کا ہے کہ آپ کی طبیعت اور آپ کے اخلاق کو جانتے ہوئے ہم اپنے کاموں کے لیے آپ سے مدد نہیں مانگتے۔

کنورانی: (مسکرا کر) خیر میری کیا حیثیت ہے کہ آپ لوگوں کے لیے کچھ کروں...... مگر سیوا کا کوئی موقع ہو تو حاضر ہوں۔

مسز مہرا: کنورانی صاحبہ! اصل بات یہ ہے کہ ہم سب محسوس کرتے ہیں کہ ہماری زندگی بالکل خالی ہوتی جا رہی ہے۔ زندگی میں Substance پیدا ہوتا ہے Values سے اور ہمارے Values سب غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ پالیٹکس اور پبلک لائف کی جو حالت ہے وہ میں آپ کو کیا بتاؤں، آپ خود مجھ سے بہت بہتر جانتی ہیں۔ آرٹ کی صورت ریڈیو اور فلم نے ایسی بگاڑی ہے کہ اب شاید ہی کبھی درست ہو سکے۔ خاندانی لوگوں کو ہماری تعلیم نے برباد کر دیا ہے ہم چاہیں تو زمانے کی رو میں جیسے بہتے ہیں ویسے ہی بہتے رہیں۔ گرداب سے بچنے اور کسی کنارے تک پہنچنے یا کسی ٹھکانے لگنے کا خیال چھوڑ دیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے اور تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو پھر صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہم Personality کے Conception کو اپنے دماغوں میں صاف کریں اور ایسی Personalities کے نمونے تیار کریں جو ان Values کو Embody کرتے ہوں، جنھیں ہم اپنے سماج میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے اسکول اور کالج ایسے نمونے تیار نہیں کر سکتے اس لیے کہ وہ خود نمونوں کے محتاج ہوتے ہیں انھیں تو ایسی Cultural Goods، ایسی تہذیبی دولت چاہیے جسے وہ نوجوانوں کے سامنے پیش کریں۔ میری اپنی زندگی ایسے Values تلاش کرنے میں گزری ہے۔ میں نے ان کی خاطر بہت دکھ اٹھایا ہے۔ مجھ میں اتنی قابلیت ہوتی کہ Personality یا Values کے نمونے زبان یا رنگوں یا سروں کے ذریعے تیار کروں تو ضرور کرتی۔ میں تو صرف یہ کر سکتی ہوں

کہ اگر کوئی ہم خیال مل جائے جس میں یچی تہذیب کے نمونے پیش کرنے کی صلاحیت ہو تو اس کے ساتھ لگ جاؤں اور اس کی ہمت بڑھاتی رہوں۔ جیوتی پرکاش صاحب ایک نوجوان ادیب ہیں، ممکن ہے کہ آپ نے ان کا کوئی مضمون دیکھا ہو یا کتاب پڑھی ہو۔ تہذیب کے مسئلوں میں ان کا Attitude وہی ہے جو کہ میں نے ابھی آپ کے سامنے بیان کیا ہے۔ انھوں نے تین چار مہینے ہوئے مجھ سے کہا کہ ایک ڈراما لکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے پلاٹ کا خاکہ بیان کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ تہذیب کا ایک ایسا نمونہ بنانا چاہتے ہیں جس کی مثالیں آج بہت کم نظر آتی ہیں۔ اس لیے میں ان کے پیچھے پڑ گئی اور آخر کار ان سے ڈراما لکھوا ہی لیا کل ہم سب نے اس کو سنا اور بہت ہی پسند کیا۔ ڈرامے کی ہیروئن ایک عورت روپ متی ہے اور میں آپ کو کیا بتاؤں کہ اس کی Personality کتنی حسین ہے۔ ہم سب کی خواہش یہ ہے کہ ڈراما دکھانے کا جلد سے جلد انتظام کریں، اور اگر ہمیں روپ متی کا پارٹ کرنے کے لیے کوئی مل جائے تو باقی کام سب آسانی سے ہو جائے گا لیکن روپ متی کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ کل ہم سوچ رہے تھے کہ ہمارے شہر میں کون ہیں جن سے درخواست کی جا سکتی ہے کہ اس معاملے میں ہماری مدد کریں۔ اب آپ کے منہ پر آپ کی تعریف کیا کروں، لیکن سب سے پہلے آپ ہی کا خیال آیا۔

(کنورانی مسکرا کر سگریٹ جلاتی ہیں اور کچھ دیر خاموش رہتی ہیں)

کنورانی: یہاں کالجوں میں آئے دن ڈرامے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک دو میں نے بھی دیکھے ہیں۔ بعض لڑکیوں کے بارے میں مجھے خیال ہوا کہ انھیں مشق کرائی جائے تو وہ خاصی اچھی ایکٹنگ کر سکیں گی۔

شو چرن: کنورانی صاحبہ، آپ معاف فرمائیں تو ایک بات عرض کروں۔ کالج کے ڈراموں میں جو لڑکیاں حصہ لیتی ہیں ان میں سے بعض بے شک بہت ہونہار ہوتی ہیں مگر ان کی طبیعت میں وہ پختگی اور مضبوطی نہیں ہوتی جو روپ متی کا پارٹ کرنے کے لیے ضروری ہے، کیوں مسز مہرا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

(مسز مہرا، شو چرن کو گھورتی ہیں اور کوئی جواب نہیں دیتی ہیں)

کنورانی: (مسکرا کر) جی نہیں آپ بالکل غلط بات کہہ رہے ہیں۔ جب کسی عورت کی طبیعت میں پختگی اور وہ چیز جسے آپ مضبوطی کہتے ہیں آجائے تو اس کے لیے ایکٹنگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میری طبیعت اتنی پختہ ہوگئی ہے کہ معمول کے خلاف کوئی بات نہیں کرسکتی۔

(کنور ستند رسنگھ اندر آتے ہیں۔ سب اٹھ کر انھیں سلام کرتے ہیں۔ کنور صاحب سلام کا جواب دے کر کنورانی صاحبہ کے پاس ذرا پیچھے کی طرف بیٹھ جاتے ہیں)

کنورانی: لیجیے، اب کنور صاحب آگئے ان سے میرا حال پوچھ لیجیے۔

کنور ستند رسنگھ: کس کا حال جی، آپ کا (ہنس کر)، آپ رات کو سات آٹھ گھنٹے گہری نیند سو کر صبح آٹھ نو بجے اٹھتی ہیں۔ کہتی ہیں رات بھر نیند نہیں آئی سارے بدن میں درد ہے۔ پھر آپ کا نکھتے کا نکھتے اٹھتی ہیں۔ منہ ہاتھ دھوتی ہیں۔ ایک ایک بال کو سنوارتی ہیں۔ سوچتی ہیں کہ کہاں جانا ہے، کس سے ملنا ہے، کیسے کپڑے پہنے جائیں۔ سرخی پاوڈر کی کیا کیفیت رکھی جائے۔ پھر جب میں بھوک سے بے تاب ہو کر چلانے لگتا ہوں تو ناشتہ لگتا ہے اور میں آدھا ناشتا ختم کر چکتا ہوں، تو آپ کیا کہتے ہیں جی، ہاں، ہاں، خراماں خراماں تشریف لاتی ہیں۔ شکایت کرتی ہیں کہ ناشتہ ٹھنڈا ہوگیا ہے، میں نے کچھ کہا تھا، باورچی نے کچھ اور پکا کر رکھ دیا مگر جب آپ ناشتا کر چکتی ہیں تو میز پر کوئی کھانے کی چیز رہ نہیں جاتی۔ میں نے یہ کبھی دریافت کرنے کی ہمت نہیں کی کہ کنورانی صاحبہ ناشتے اور کھانے کے درمیان کیا کرتی ہیں مگر آپ مصروف بہت رہتی ہیں اور تھکن کو دور کرنے کے لیے دن کے کھانے کے بعد کم از کم دو گھنٹے ضرور سوتی ہیں۔ اس کے بعد سوال ہوتا ہے کہ شام کی پارٹی کے لیے کس رنگ کی ساڑی پہنی جائے تو رات کے کھانے کو کس رنگ کی پہنی جائے۔ اس سوال کا جواب سوچنے میں کبھی کبھی اتنی دیر لگ جاتی ہے کہ آپ شام کی پارٹی میں رات کے کھانے کے وقت پہنچتی ہیں، اگر میں حماقت میں جلدی

کرانا چاہتا ہوں تو فوراً مجھ پر الزام لگتا ہے کہ تمھیں نے دیر کرائی۔ بہر حال میں نیاز مند ہوں، اور اس کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے روٹی کپڑا مل جاتا ہے۔

(نوکر چائے اور اس کے ساتھ کھانے کا سامان لاتے ہیں اور کنورانی صاحبہ کے سامنے سجاتے ہیں)

کنورانی: لیجیے آپ نے میرا حال سن لیا۔ اب بتائیے کہ میں کس کام کی ہوں۔

کنور ستند رسنگھ: جی میں نے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ آپ کام کی نہیں ہیں۔ آپ کام بہت کرتی ہیں۔ اس معاملے میں شاید ہی کوئی آپ کا مقابلہ کر سکے۔

کنورانی: یعنی آپ سمجھتے ہیں کہ میں ڈرامے بھی کر سکتی ہوں؟

کنور ستند رسنگھ: جس ڈرامے کو دکھانا نہ ہو۔ اس میں آپ سے بہتر ایکٹنگ کوئی نہیں کر سکتا۔

(اب چائے کا سامان آراستہ ہو گیا ہے۔ کنورانی صاحبہ مہمانوں کے لیے چائے بناتی ہیں۔ اور سب چائے پینے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کھانے پینے کے متعلق رسمی باتیں ہوتی ہیں۔ کملا اندر آتی ہے۔ کنورانی اور کنور کو سلام کر کے دروازے کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔)

کنورانی: یہ لو دیر سے آئی ہو اور اب بیٹھی ہو تو کوسوں دور۔ آخر تم کہاں تھیں اب تک؟

کملا: جی آپ کی گاڑی دیر سے پہنچی۔

کنورانی: لو آتے ہی شرارت کی باتیں شروع کر دیں۔ میری گاڑی وقت سے بھیجی گئی تھی۔ اور وقت سے پہنچی ہوگی۔ دیر تم نے لگائی...... اچھا قریب تو آؤ۔ اتنی دور کیوں بیٹھی ہو؟

کملا: مجھے یہیں رہنے دیجیے۔ میرا کرتا پھٹا ہے۔

کنورانی: دیکھو کہاں پھٹا ہے۔

کملا: (سر ہلا کر) جی نہیں، ابھی تو مجھے ایک ہی جگہ پھٹا معلوم ہوتا ہے آپ دیکھ لیں گی تو اور بہت سی جگہوں پر پھٹا معلوم ہونے لگے گا۔

کنورانی: (پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے) اچھا بھائی جہاں جی چاہے بیٹھو۔ لیجیے کنور صاحب، اسے چائے دے دیجیے۔ یہ خود تو کبھی کسی چیز کے لیے ہاتھ بڑھاتی نہیں ہے۔

(کنور صاحب پیالی لے کر کملا کی طرف جاتے ہیں۔ اور اسے پیالی دے کر اسی کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔)

کنورانی: اچھا یہ تو بتاؤ کملا، تم نے ڈراما سنا ہے۔ آپ تو ہر وقت ایکٹنگ کرتی رہتی ہیں۔

(کنور صاحب بہت زور سے ہنستے ہیں اور جوش میں ہاتھ اٹھا کر کملا کی پیٹھ پر تھپکی دینا چاہتے ہیں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر رہ جاتے ہیں)

مسز مہرا: بھئی کملا یہ ٹھیک نہیں ہے، ہم کنورانی صاحبہ کے پاس ایک درخواست لے کر آئے تھے۔ تم نے ہماری بات کو مذاق بنا دیا۔

کنورانی: (مسز مہرا کو غور سے دیکھ کر) جی ہاں کملا نے مذاق تو کیا، مگر اس کے کہنے کا اصل مطلب یہ ہے کہ جو ایسا سیدھا ہو کہ زندگی میں کسی موقع پر اپنی اصلیت کو چھپا نہ سکے، اسے ایکٹنگ کا حوصلہ نہ کرنا چاہیے۔

شیو چرن: مگر کملا صاحبہ نے آپ کے بارے میں یہ رائے کیسے قائم کی؟ مجھے تو یقین ہو گیا ہے کہ آپ سے بہتر روپ متی کا پارٹ کوئی نہ کر سکے گا کیوں جیوتی پرکاش صاحب، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

(جیوتی پرکاش کوئی جواب نہیں دیتا۔ سر جھکا لیتا ہے مسز مہرا کے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر آتے ہیں۔)

مسز مہرا: کیا بتاؤں کنورانی صاحبہ میری بات تو بگڑ جاتی ہے۔ میں آپ سے درخواست کرنا چاہتی تھی کہ کسی فرصت کے وقت ہمیں اجازت دیجیے کہ آپ کو ڈراما سنائیں۔ ڈرامے کے بارے میں اپنی رائے دیجیے، اور اگر ہمارا یہ خیال کہ روپ متی کا پارٹ آپ ہی ادا کر سکتی ہیں آپ کو صحیح معلوم ہو تو پھر ہماری درخواست کو قبول فرمائیے۔ آپ نے روپ متی کا پارٹ کیا تو ڈرامے کی خوبیاں چمک اٹھیں گی، اور لوگ یہ سنیں گے کہ آپ اس میں حصہ لے رہی ہیں تو وہ ڈرامے کے اصل SUBJECT کی طرف بہت متوجہ ہو جائیں گے۔

کنورانی: مسز مہرا، کنور صاحب نے اور کملا نے مجھے مفت میں بدنام کر دیا ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ڈرامے کے بارے میں جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے اس کی وجہ سے

مجھے اس ڈرامے سے بہت دلچسپی ہوگئی ہے۔ میں نے ایکٹنگ کبھی کی نہیں ہے۔ اس لیے مناسب یہ ہوگا کہ آپ روپ متی کے پارٹ کے لیے کسی اور سے کہیں، لیکن میں ڈراما سننا ضرور چاہتی ہوں اور ڈراما دکھانے کے انتظام میں آپ کی ہر طرح سے مدد کروں گی...... کنور صاحب ذرا میری ڈائری تو لے آیئے۔

کنور: جی آپ اپنی ڈائری کل جگدیش صاحب کے یہاں بھول آئی تھیں۔

کنورانی: (زور سے) جناب وہ میری چھوٹی ڈائری تھی جو میں ہینڈ بیگ میں رکھتی ہوں۔ آپ سے میں وہ بڑی ڈائری مانگ رہی ہوں جو گھر پر رہتی ہے۔

کملا: (کنور صاحب سے) اس کو کہہ دیجیے کہ مرمت کے لیے گئی ہے۔

کنورانی: توبہ۔ تم دونوں مل جاتے ہو تو اور بھی مصیبت کر دیتے ہو۔

(کنورانی اٹھ کر اس دروازے سے جو اسٹیج کی پشت پر ہے جاتی ہیں)

مسز مہرا: کملا، آج تو بہت زوروں پر ہو۔

کنور: مسز مہرا، اسے آپ قابو میں رکھنا چاہتی ہو تو کھانے پکانے میں لگائے رکھیے۔

(کنورانی اندر آتی ہیں۔ سب کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

کنورانی: مسز مہرا، اگر آپ کو فرصت ہو تو کل گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تشریف لے آیئے۔ پہلے ڈراما سنیں گے اور اس کے بعد ساتھ کھانا کھائیں گے۔ اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ کملا اسکول میں ہوگی اور آپ کے ساتھ نہ آسکے گی۔ کنور صاحب آپ کل اس وقت کیا کر رہے ہوں گے؟

کملا: جی یہ مجھے ابھی بتا رہے تھے کہ کل جانوروں کی نمائش میں ہوں گے۔

کنور: جی ہاں، ارادہ تو یہی تھا۔ مگر آپ لوگ سب تشریف لا رہے ہوں تو میں نہیں جاؤں گا۔

کملا: اس سے آپ کو کچھ فائدہ تو ہوگا نہیں۔

کنور: کیا مطلب ہے، میں جانور ہی رہوں گا؟

کنورانی: ارے کبھی تو ہنسی مذاق ختم کرو۔ اچھا تو یہ طے ہوگیا کہ کل آپ تشریف لائیں گی۔ کنور صاحب بھی موجود ہوں گے۔ اب آیئے اور باتیں کریں۔

مسز مہرا: کنورانی صاحبہ، ہم نے آپ کا بہت وقت لیا۔ اب ہمیں اجازت دیجیے اور اگر کوئی ایسی بات کہہ دی گئی ہو جو آپ کو ناگوار ہوئی تو معاف فرمائیے گا۔

کنورانی: (بہت خلوص سے ہاتھ پکڑ کر) مسز مہرا، آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ مجھے تو بڑی خوشی ہوئی کہ آپ تشریف لائیں، اور امید ہے کہ اب آپ اکثر تشریف لایا کریں گی۔ اچھا ہوتا اگر آپ کچھ دیر اور ٹھہر سکتیں۔ ذرا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے، مگر آپ کو جانا ہے تو مجبوری ہے۔

(سب رخصت ہوتے ہیں۔ آخر میں کملا جانا چاہتی ہے)

کنورانی: ارے کملا، تم کیوں جا رہی ہو۔ میں تمھیں بعد میں گاڑی پر بھجوا دوں گی۔

کملا: جی نہیں، میری خالہ کی گاڑی آپ کی گاڑی سے زیادہ اچھی ہے۔

(کملا سلام کر کے جلدی سے چلی جاتی ہے۔ کنور اور کنورانی اکیلے رہ جاتے ہیں۔)

(پردہ)

تیسرا سین

(کیشو داس کا ڈرائنگ روم، صبح نو بجے کا وقت ہے۔ اور کیشو داس اور پورنما بیٹھے ناشتہ کر رہے ہیں)

کیشو داس: پورنما، تم نے آخر ان ہیروئن تلاش کرنے والوں کو ناشتے کے وقت کیوں بلایا؟

پورنما: اور کس وقت بلاتی؟ آپ صبح ناشتہ کر کے چلے جاتے ہیں، اور پھر کچھ ٹھیک نہیں ہوتا کہ کب واپس آئیں گے۔

کیشو داس: ان سے ملنے کے لیے میری کیا ضرورت ہے۔ میں نے تم کو اپنی رائے بتا دی، اور میری خواہش بھی تمھیں معلوم ہے۔

پورنما: جی ہاں، آپ کی رائے اور آپ کی خواہش تو مجھے معلوم ہے مگر میں اکیلی اس بات کو سمجھا نہیں سکتی۔ آپ کا موجود ہونا بھی ضروری ہے، نہیں تو میں ذمہ دار نہیں ہوں، اگر لوگ مجھ سے کوئی بات منوالیں، جو آپ کی رائے اور خواہش کے خلاف ہو۔

کیشو داس: ارے پورنما۔ تم ایک سرکاری افسر کی بیوی ہو تمھیں معلوم ہے کہ شہر میں میری کیا حیثیت ہے۔ تم کو اس طرح دب نہ جانا چاہیے۔ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ اگر تم میری رائے پر نہ چلیں تو اس کا میرے CAREER پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔

پورنما: مجھے ابھی اپنے اوپر بالکل بھروسا نہیں ہے۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ جب تک ڈرامے والے چلے نہ جائیں آپ بھی گھر پر رہیے۔

(نوکر کارڈ لے کر آتا ہے اور پورنما کو دیتا ہے)

پورنما: لیجیے وہ لوگ آ گئے، کہیے تو سب کو یہیں بلا لوں۔

کیشو داس: بلا لو۔

(پورنما نوکر کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ باہر چلا جاتا ہے۔)

پورنما: دیکھیے، آپ جایئے گا نہیں۔

(کیشو داس کوئی جواب نہیں دیتا۔ تھوڑی دیر میں مسز مہرا، جیوتی پرکاش، کیلاش ناتھ اور شوچرن اندر آتے ہیں۔ ان کے بعد کملا اس طرح اندر آتی ہے کہ گویا وہ پارٹی میں شامل نہیں۔ انھیں دیکھ کر کیشو داس اور پورنما بھی کھڑے ہو جاتے ہیں)

پورنما: (سب کو سلام کرنے کے بعد) تشریف لایئے تشریف لایئے۔ ناشتہ حاضر ہے۔

مسز مہرا: بہت بہت شکریہ۔ ہم ناشتہ کر کے آئے ہیں۔

پورنما: اچھا کم از کم ایک پیالی چائے تو پی لیجیے۔

(مسز مہرا، کیلاش ناتھ، جیوتی پرکاش اور شوچرن میز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کملا کھڑی رہ جاتی ہے۔ پورنما کو دیکھتی ہے اور دوڑ کر اس کی طرف جاتی ہے اور اس سے لپٹ جاتی ہے)

پورنما: ارے تم بھی آئی ہو۔ برسوں سے تمھاری صورت نہیں دیکھی اور آئی تھیں تو مجھے بتایا بھی نہیں۔ وہی تمھاری پرانی عادت۔ سب سے پیچھے رہتی ہو۔ دل کی بات دل میں رکھتی ہو۔ کبھی کسی کی طرف بڑھتی نہیں۔ (کملا کو اپنی کرسی کی طرف لے جاتے ہوئے) اچھا بتاؤ کیا حال ہے؟

کملا: میرا حال بہت اچھا ہے۔

پورنما: یہ تو تم ہمیشہ کہتی ہو۔ سمجھتی ہو کہ جس کو تمھارا خیال ہوگا وہ خود ہی تمھارا حال معلوم کر لے گا۔ میں مہینوں سے چاہتی تھی کہ تم سے ملنے کا کوئی موقع نکالوں، مگر میں جو کچھ کرنا چاہتی ہوں وہ

کر ہی نہیں پاتی۔ سنا تھا کہ تم کسی اسکول میں پڑھاتی ہو۔

کملا: پڑھاتی کیا ہوں، پڑھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ میں اس کام کے لیے موزوں بھی ہوں یا نہیں۔

(اس دوران میں دونوں پاس بیٹھ گئی ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ کملا اور پورنما کی پرانی ملاقات ہے۔ مسز مہرا کے چہرے سے ناگواری ظاہر ہوتی ہے۔ کیلاش ناتھ، جیوتی پرکاش اور شو چرن کے چہروں پر خوشی اور امید کی کیفیت نظر آتی ہے۔)

پورنما: اچھا بھائی اب ملاقات ہوگئی ہے، اب تو آیا کروگی۔

(کملا مسکراتی ہے اور کوئی جواب نہیں دیتی۔ نوکر پیالیاں لے کر آتا ہے اور پورنما چائے دان اٹھاتی ہے کہ پیالیوں میں چائے انڈیلے)

مسز مہرا: دیکھیے مسز کیشو داس، ہم سب ابھی چائے پی کر آئے ہیں، آپ تکلف نہ کیجیے۔

کیلاش ناتھ: مسز کیشو داس، آپ کو اپنی سہیلی تو یاد رہیں۔ مگر اپنے ایک استاد کو آپ بھول گئیں۔

پورنما: (کیلاش ناتھ کی طرف ذرا غور سے دیکھ کر اور ادب سے سلام کر کے) کیلاش ناتھ صاحب، میں بہت معافی چاہتی ہوں۔ اصل میں میں صبح سے بہت گھبرائی ہوں اور اس وقت کملا کو دیکھا......

کملا: یہ غلط بات ہے، ہیروئن کو گھبرانا نہیں چاہیے۔

پورنما: (لمبی سانس لے کر) دیکھو کملا پانچ منٹ بھی نہیں بیٹھیں یہاں اور شرارت کی باتیں شروع کر دیں۔ بھلا میں کبھی اس قابل تھی کہ ہیروئن بن سکوں۔

کیشو داس: (کھڑے ہو کر) اچھا بھئی اب ہنسی مذاق کی باتیں ختم کرو۔ معاملے کی بات کرو مجھے دفتر جانا ہے اور آپ لوگوں کو بھی اور کام ہوں گے۔

کملا: آپ اطمینان سے دفتر تشریف لے جایئے۔ ہم کو گھر سے پورنما بھی نکال سکتی ہے۔

(کیشو داس یہ جواب سن کر ذرا رک سا جاتا ہے۔ اور پھر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

کیشو داس: معاف کیجیے گا، میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ جلدی سے چلے جائیں۔ پورنما نے مجھ سے کہا تھا کہ اس بات کو طے کر کے دفتر جانا کہ میں آپ کے ڈرامے میں

حصہ لوں یا نہ لوں۔ اور مجھے اب دفتر جانا ہے اس لیے میں چاہتا تھا کہ معاملہ جلدی طے ہو جائے۔ اس کے بعد اس گھر کو آپ اپنا گھر سمجھیے۔ اور جتنی دیر جی چاہے بیٹھیے۔

کملا: جی آپ دفتر تشریف لے جائیے۔ ہم پورنما سے اپنا معاملہ طے کر لیں گے۔

(کیشو داس، پورنما کی طرف دیکھتا ہے اور پورنما آنکھ سے اشارہ کرتی ہے کہ ابھی بیٹھے رہیے، جائیے نہیں)

مسز مہرا: کیشو داس سے اپنے معاملے کے متعلق کہہ سن لیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب وہ کالج میں تھیں تو اکثر ڈراموں میں حصہ لیا کرتی تھیں اور یہ ڈراما کچھ ایسا مشکل نہیں ہے کہ وہ اس میں حصہ لیتے ہوئے گھبرائیں۔ اصل میں ہم کو ایک ایسی ہیروئن کی ضرورت ہے جس کے چہرے اور انداز سے شرافت اور تہذیب ظاہر ہوتی ہے، اور جس کی صورت شکل اور آواز بھی اچھی ہو۔ جو ان شرطوں کو پورا کر سکے اس کے لیے ہیروئن کا پارٹ کرنا کچھ بہت مشکل نہ ہوگا۔

شو چرن: کیلاش ناتھ صاحب، آپ تو مسز کیشو داس کو مختلف ڈراموں میں ایکٹ کرتے دیکھ چکے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ روپ متی کے پارٹ کے لیے بہت ہی موزوں ہوں گی، جیوتی پرکاش صاحب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

کیشو داس: جی ہاں، آپ بے شک ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ پورنما ڈراموں میں حصہ لیا کرتی تھیں اور ان کی ایکٹنگ بہت پسند کی جاتی تھی۔ مجھے اس پر بالکل کوئی اعتراض نہیں کہ کالجوں میں ڈرامے کیے جائیں اور لڑکیاں ان میں حصہ لیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہندستان میں ایکٹنگ کے فن کو ترقی دینے کی بہت ضرورت ہے۔ یہ صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اچھے تعلیم یافتہ لوگ ڈراما لکھنے اور انھیں ایکٹ کرانے میں دلچسپی لیں۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ کے سامنے اپنی کچھ مجبوریاں بیان کروں۔

کملا: اچھا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم پورنما سے آپ کے دفتر میں ایکٹنگ کرائیں گے۔

کیشو داس: جی نہیں، میں یہ نہیں سمجھتا ہوں لیکن اگر آپ مجھے اجازت دیں تو آپ کو یہ بتا دوں کہ میں سمجھتا کیا ہوں۔

کملا: یہ تو آپ دفتر میں دن بھر کرتے ہوں گے۔ یہاں پورنما کو بات کرنے کا موقع دے دیجیے، تو کیا حرج ہے۔

کیشو داس: (عاجز آ کر) اونہہ آپ سے نپٹنا بڑا مشکل ہے۔ میں دفتر جاتا ہوں۔ مگر میں یہ آپ سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ پورنما آپ کے ڈرامے میں حصہ نہیں لے سکتی۔

(کیشو داس چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

مسز مہرا: (غصہ میں) کملا مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تم اس طرح کا فساد بھی کرتی ہو۔ کنورانی صاحبہ کے یہاں تم نے ہنسی مذاق شروع کر دیا اور مجھے ٹھیک سے بات نہیں کرنے دی۔ یہاں تم نے کیشو داس صاحب کو خفا کر دیا۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تو تمھیں ہرگز ساتھ نہ لاتی۔

پورنما: مسز مہرا، آپ خفا نہ ہوں۔ اس میں کملا کا کوئی قصور نہیں ہے، آپ کا جب ٹیلیفون آیا تو میں نے صاحب سے ان کی رائے پوچھی کہ میں ڈرامے میں حصہ لوں یا نہ لوں۔ انھوں نے کہا کہ میں مجسٹریٹ ہوں اور یہ بالکل مناسب نہ ہوگا کہ تم ایک ڈرامے میں حصہ لو۔ ڈراما دیکھنے کے لیے ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ سرکاری ملازموں کو اپنی عزت کا بہت خیال رکھنا ہوتا ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو ناشتے کے وقت اسی لیے بلایا تھا کہ آپ صاحب سے ملیں اور وہ خود اپنی رائے آپ کو بتا دیں۔

شوچرن: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی مجسٹریٹ کی بیوی ایسے ڈرامے میں حصہ لے تو اس سے مجسٹریٹ کی عزت میں کیا فرق آسکتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو عورت روپ متی کا پارٹ کرلے اس کی عزت اور بڑھ جائے گی۔ کیوں، کیلاش ناتھ صاحب، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

مسز مہرا: بھائی شوچرن، تم تو کسی طرح مانتے ہی نہیں ہو۔ ہر موقع پر جو بات نہ کہنا چاہیے وہی کہہ بیٹھتے ہو۔ تم تو میرے لیے ایک عذاب ہو گئے۔ اچھا کیلاش ناتھ صاحب، اب بتلائیے کیا کریں؟ کنورانی صاحبہ اور مسز کیشو داس دونوں اس پارٹ کے لیے بہت موزوں ہیں۔ اور دونوں نے اسے کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب ہماری فہرست میں صرف رام رتن کی بیوی نرملا رہ گئی ہے۔

پورنما: (کملا کے کان میں کچھ کہنے کے بعد) مسز مہرا مجھے اور کملا کو دو منٹ کے لیے اجازت دیجیے۔
ہم ابھی آتے ہیں۔

(پورنما کملا کی بانہہ پکڑ کر اسے اٹھاتی ہے اور باہر لے جاتی ہے)

مسز مہرا: ان دو عورتوں سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا ہے کہ روپ متی کا پارٹ صرف ایسی عورت کر سکتی ہے جس کے لیے زندگی کا مطلب صرف کھانا پینا اور خوش رہنا نہ ہو۔ جیوتی پرکاش صاحب نے اپنی ہیروئن میں ایسی صفتیں رکھی ہیں، جو بے فکر عورتوں میں پیدا ہی نہیں ہو سکتیں۔

شو چرن: جی ہاں مسز مہرا، آپ بالکل بجا فرماتی ہیں۔ اب ہمیں اپنی ہیروئن ایسے طبقوں میں تلاش کرنا چاہیے، جو دولت مند نہ ہوں کیوں......

مسز مہرا: (غصہ میں) شو چرن خدا کے لیے چپ رہو۔

جیوتی پرکاش: دیکھیے میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ ایسی Personality، ایسی شخصیتوں کے خاکے بنانا جو موجود نہ ہوں، بالکل بے کار ہے، اس لیے کہ پھر ان خاکوں کو بھرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

مسز مہرا: بھئی جیوتی پرکاش صاحب میں کیا کروں، ایسے معاملوں میں آدمی جو رائے دیتا ہے وہ کچھ اپنے خیالات اور کچھ اپنے تجربے کی بنا پر دیتا ہے مجھے تو اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ روپ متی ہم میں موجود ہے۔ مگر ہم تلاش نہیں کر پاتے۔

(خاموشی)

کیلاش ناتھ: میرے خیال میں ہم کو مسز رام رتن سے مل لینا چاہیے اور پھر اس کے بعد بیٹھ کر سوچنا چاہیے کہ کیا کریں۔

مسز مہرا: ہاں، چلیے ایک کوشش اور کر لیں۔

(سب اٹھتے ہیں اور آہستہ آہستہ باہر چلے جاتے ہیں)

(پردہ)

چوتھا سین

(رام رتن کے مکان میں بیٹھنے کا کمرہ۔ کئی وضع کی بہت سی کرسیاں ہیں جن میں سے کوئی بھی آرام دہ نہیں۔ بیچ میں ایک پرانی خستہ حال گول میز ہے۔ تماشائیوں کے سامنے کی دیوار پر ایک بہت بڑی جنتری لٹکی ہے۔ جس پر ناچتی ہوئی فلم ایکٹریس کی تصویر ہے۔ اس کے نیچے ایک ذرا اونچی میز پر کسی دیوتا کی مورتی ہے۔ کرسیوں پر مسز مہرا، جیوتی پرکاش سروپ چند اور شو چرن بیٹھے ہیں۔ کملا حسب معمول سب سے الگ کرسی پر بیٹھی ہے۔ انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ سب دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔)

مسز مہرا: دیکھیں آج ہماری کملا کا کیا رنگ رہتا ہے...... معلوم نہیں کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔

سروپ چند: مسز مہرا، آپ ایسے گھروں میں کبھی آئی نہیں ہیں یہ ڈرائنگ روم تو محض ایک چھوڑا ہے جہاں لوگ بٹھا دیے جاتے ہیں۔ جب تک کہ گھر والے یہ نہ طے کر لیں کہ ان کا استقبال کون کرے اور کیسے کرے۔ لالا جی اشنان کر رہے ہوں گے۔ اشنان کر کے اطمینان سے کپڑے بدل کر اور گھر والوں سے ایک دو مذاق کی باتیں چلا چلا کر کریں گے اور تب منزلیں طے کرتے ہوئے آئیں گے۔ گھر کی عورتیں اپنے اپنے کاموں میں لگی ہوں گی

اور ایک دوسرے سے کہہ رہی ہوں گی کہ لو، نہ جانے کون سے لوگ آگئے اور کس مطلب سے آئے ہیں۔ ممکن ہے کوئی لڑکی چپکے سے آئی ہو اور جھانک کر ہمیں دیکھ گئی ہو۔ آپ یہاں اطمینان سے بیٹھیے اور باتیں کیجیے۔ جو کچھ ہونا ہے خود ہی ہو جائے گا۔

مسز مہرا: مگر ہم نے تو Appointment لیا تھا۔

سروپ چند: جی آپ لاکھ Appointment لیجیے یہاں تو جو وقت کا حساب ہے، وہی رہے گا۔ لالہ صاحب کو اور گھر کی استریوں کو جب فرصت ہوگی تو آپ سے مل لیں گی۔

مسز مہرا: واہ! یہ اچھا طریقہ ہے۔

جیوتی پرکاش: میرا تو خیال ہے کہ یہاں سے اٹھ چلیے۔ بھلا ایسے گھرانے میں روپ متی کا پارٹ کرنے والی لڑکی مل سکتی ہے؟

شوچرن: واہ جیوتی پرکاش صاحب! آپ تو ہمت ہار گئے۔ اب جو ہم آئے ہیں اور اتنی دیر تک یہاں بیٹھ چکے ہیں تو ہمیں مسز رام رتن سے ملاقات کر کے ہی جانا چاہیے، کیا معلوم وہ کیسی ہوں گی۔ کیوں مسز مہرا، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

(کوئی جواب نہیں دیتا۔ خاموشی۔ کملا چپکے سے اٹھتی ہے، کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتی ہے، کچھ دیر جنتری کے پاس کھڑی ہو کر ایکٹریس کی تصویر کو دیکھتی ہے اور پھر چپکے سے مکان کے اندر چلی جاتی ہے ذرا دیر میں 'ارے کملا' تم کہاں سے آئیں؟ اور خوشی میں ہنسنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

مسز مہرا: لو، اس نے یہاں بھی کوئی رشتہ جوڑ لیا۔

کیلاش ناتھ: جی ہاں، اصل میں کملا کالج میں پڑھتی تھی تو اپنی طبیعت اور اپنے طریقے کی وجہ سے بہت ہی ہر دلعزیز تھی۔ اس کے بعد کچھ ایسا معلوم ہوا کہ وہ اپنی تمام سہیلیوں کو بھول گئی ہے مگر اس کو سب نے یاد رکھا ہوگا۔ ہم نے شاید غلطی کی کہ شروع میں اس سے مشورہ نہ لیا۔

مسز مہرا: وہ خود بیٹھی تو تھی۔ اس نے مشورہ دیا کیوں نہیں۔

کیلاش ناتھ: ایسا کرنا تو معلوم ہوتا ہے اس کی طبیعت کے خلاف ہے۔

مسز مہرا: بڑی وہ اور بڑی اس کی طبیعت...... آخر آپ اسے روپ متی کا پارٹ کیوں نہیں پیش فرمادیتے۔

جیوتی پرکاش: (جیسے نیند سے چونک کر) کس کو؟ کملا کو؟...... ہاں یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔

(مسز مہرا کے چہرے پر غصے اور الجھن کے آثار نظر آتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ مایوسی کی کیفیت میں بدل جاتے ہیں۔ سروپ چند اسے دیکھ رہا ہے اور اس کی حالت کو تاڑ جاتا ہے)

سروپ چند: بھئی یہاں تو ہم اس غرض سے آئے تھے کہ نرملا دیوی سے ملاقات کر کے اس کا اندازہ کریں کہ وہ روپ متی کا پارٹ کرسکتی ہیں یا نہیں۔ اب کوئی بحث نہ چھیڑیے۔

(جیوتی پرکاش کھڑا ہوتا ہے اور ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کسی سوچ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ اسے مسز مہرا کی کیفیت کا کوئی احساس نہیں۔ تھوڑی دیر میں دروازے کے پاس کملا اور نرملا دکھائی دیتی ہے۔ کملا اس طرح سے اپنی کرسی کی طرف جاتی ہے کہ گویا نرملا سے دامن چھڑا کر بھاگ رہی ہے۔ نرملا ذرا دیر شرمائی ہوئی دروازے کے پاس کھڑی رہتی ہے پھر اندر آتی ہے اور مہمانوں پر نظر ڈالتی ہے)

نرملا: نمستے کرتی ہوں کیلاش ناتھ صاحب۔ آپ نے تو بہت دنوں کے بعد درشن دیے۔

کیلاش ناتھ: (سلام کا جواب دیتے ہوئے) جی ہاں کچھ ایسا ہی اتفاق ہوا۔ آئیے آپ کا پریچے کرادوں۔ نرملا دیوی، مسز مہرا، جیوتی پرکاش صاحب، سروپ چند صاحب، شوچرن صاحب۔ آئیے۔ اب ذرا بیٹھیے۔ آپ سے کچھ معاملے کی بات کرنا ہے

نرملا: میں کیا باتیں کروں، لالا جی خود آپ سے ملنا چاہتے تھے۔

کملا: اور تم ہمیں پکوڑیاں کھلا کر رخصت کردینا چاہتی ہو۔

نرملا: (گھبراہٹ کی ہنسی ہنس کر اٹھتے ہوئے) جی میں چائے کا انتظام کررہی تھی، آپ اجازت دیں تو جا کر لے آؤں۔

(نرملا چلی جاتی ہے۔ جیوتی پرکاش ٹہلتے ٹہلتے کملا کی طرف جاتا ہے اور ذرا

دور کھڑے ہوکر اسے اس طرح دیکھنے لگتا ہے جیسے فن کا جاننے والا کسی مورت یا تصویر کو۔ کملا ان کی طرف دیکھتی ہے اور کھڑے ہوکر بہت ادب سے نمستے کرتی ہے)

جیوتی پرکاش: میں دیکھ رہا تھا......

کملا: جی ہاں، میں بھی دیکھ رہی تھی......

(جیوتی پرکاش مسکرا کر ٹہلنے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی وہ سوچ رہا ہے کہ کملا روپ متی کے پارٹ میں کیسی معلوم ہوگی۔ تھوڑی دیر کے بعد رام رتن داخل ہوتا ہے۔ وہ ململ جیسے باریک کپڑے کی دھوتی باندھے ہے۔ اور اوپر صرف ایک بنیائن پہنے ہے جو صاف نہیں ہے، اس کے بدن سے چڑھتے موٹاپے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں)

رام رتن: (مہمانوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بیٹھ کر) اوہو، سروپ چند صاحب، آپ اِدھر کیسے بھول پڑے؟ کانگریس کوئی چندہ کر رہی ہے کیا؟ ہا، ہا، ہا اور کیلاش ناتھ صاحب تو ہم لوگوں کو بھول ہی گئے۔ انھیں تو بس لڑکیوں کو پڑھانے سے مطلب تھا۔ امتحان کے زمانے میں تو بس جی جب دیکھو کھڑے ہیں۔ اب ہمیں کیسے یاد کریں؟ اب تو اور لڑکیوں کو امتحان کی تیاری کرانا ہوگا۔

کیلاش ناتھ: جی میں اس دوران میں دو تین مرتبہ آیا تھا۔ نرملا دیوی سے کچھ کام تھا۔ وقت ایسا تھا کہ آپ مکان پر تشریف نہیں رکھتے تھے۔

رام رتن: اجی نرملا کو نہ پوچھیے وہ تو ہر وقت اپنے کالج اور کالج کے استادوں کو یاد کرتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی آنکھوں میں آنسو تک آجاتے ہیں۔ ہم تو صاحب اسی وجہ سے کالج کی تعلیم کے خلاف ہوگئے۔ ہم کو کوئی ایسی شکایت نہیں ہے کہ جو آپ سے بیان کردیں۔ اور کہیں کہ اسے دور کردیجیے۔ ہم تو اس تعلیم کے سرے سے خلاف ہوگئے۔

کیلاش ناتھ: مگر آپ کے گھر میں تو ماتا جی سے لے کر چھوٹی بچیوں تک سب تعلیم پاچکی ہیں یا پارہی ہیں۔ اور جس کسی نے تعلیم ختم کی ہے۔ اس نے بی۔ اے۔، ایم اے کر کے ختم کی ہے۔

رام رتن: جی ہاں، یہ تو سب ٹھیک ہے، مگر ہم صاحب اس تعلیم کے خلاف ہو گئے۔ اس سے گھر کی قدر نہیں رہتی۔

مسز مہرا: سمجھا یہ جاتا ہے کہ لڑکی پڑھ لکھ جائے گی تو اس کے دل میں اپنا گھر خوبصورت بنانے اور اس میں مہذب زندگی گزارنے کی خواہش پیدا ہو جائے گی۔ مگر آپ بالکل بجا فرماتے ہیں کہ ایسا ہوتا نہیں ہے...... آپ کی طرح اور بہت سے سمجھدار لوگوں نے اس بات کو محسوس کیا ہے۔ اور اب اس کی کوششیں کی جا رہی ہے کہ تعلیم اور گھریلو زندگی کو زیادہ قریب لایا جائے۔

رام رتن: ارے صاحب یہ تو بہت اچھا ہو جائے گا اگر آپ اس کا انتظام کر دیں کہ ماسٹر لوگ لڑکیوں کے گھروں میں جا کر پڑھا دیا کریں۔

مسز مہرا: جی نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ کالجوں میں لڑکیاں انھیں چیزوں کی قدر کرنا سیکھتی ہیں جن کی قدر کرنا گھروں میں سکھایا جاتا ہے لیکن کالج میں کتابیں اس طرح آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں کہ لڑکیوں کو دنیا نہیں دکھائی دیتی۔ اور گھروں میں دوسری باتیں۔ اصل میں بہت اچھا ہوا کہ آپ نے یہ بات چھیڑ دی۔ ہم جس ڈرامے کے بارے میں آپ سے بات چیت کرنے آئے ہیں اس کا سمبندھ اسی مسئلے سے ہے......

رام رتن: صاحب فلم تو میں دیکھتا رہتا ہوں، ان میں سے کچھ پسند بھی آتی ہیں۔ لیکن ڈراما کیوں دکھایا جاتا ہے؟ جب اس میں ناچ ہوتا ہے نہ گانا، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کالج میں تھا تو یار دوست کبھی کبھی پکڑ لے جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ ڈراما اچھا نہ ہوا تو دو چار لڑکیوں کو دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد تو میں نے کوئی ڈراما دیکھا نہیں اور نہ دیکھنے کا جی چاہتا ہے۔

کملا: نرملا کہتی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اسے ایک ڈرامے میں پارٹ کرتے دیکھا تھا۔

رام رتن: (کھسیانی ہنسی ہنس کر) ہاں سچی بات تو یہی ہے، مگر جو بات اس سے اچھی لگتی تھی وہ اب نہیں لگتی۔ دوسرے کی لڑکی کو اسٹیج پر دیکھنے اور اپنی استری کو دیکھنے اور دکھانے میں بڑا فرق ہے۔

کملا: نرملا گھر میں بہت خوش ہے۔ آپ اسے اسٹیج پر ہیروئن کا پارٹ کرتے دیکھیں گے اور گھر آ کر اس کی تعریف کریں گے تو اور خوش رہا کرے گی۔

رام رتن: جی ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر صاحب ہماری طبیعت نہیں مانتی۔

(کملا اٹھ کر دروازے کے پاس جاتی ہے اور نرملا کو پکار کر وہیں اس کا انتظار کرتی ہے)

سروپ چند: ارے لالا جی، آپ ہماری بات نہیں سمجھے۔ ہم ایک بہت اچھا سماجی اور اخلاقی ڈراما کرنا چاہتے ہیں جسے جیوتی پرکاش صاحب یہ جو یہاں بیٹھے ہیں، انھوں نے لکھا ہے۔ ہمیں ہیروئن کا پارٹ کرنے کے لیے نرملا کی ضرورت ہے۔ آپ مان جایئے۔ آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آپ بھی بہت خوش ہوں گے اور نرملا دیوی بھی۔

رام رتن: یہ تو سب ٹھیک ہے۔ مگر صاحب میری طبیعت نہیں مانتی۔

(اس دوران میں نرملا آگئی ہے۔ کملا اس کے پکھوڑے پکڑ کر دیوار سے اڑا دیتی ہے۔ اور دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی ہے۔)

کملا: اری نرملا، تو بھی بتا تو کیا چاہتی ہے۔

نرملا: میں تو جو پارٹ دیا جائے کرنے کو تیار ہوں۔ تم جانتی ہو مجھے ڈرامے کا کتنا شوق ہے۔

کملا: پھر تو لالا جی سے کہتی کیوں نہیں ہے؟

نرملا: کہو تم لوگ، میں نہیں کہتی۔

کملا: ہم تو کہہ رہے ہیں، لیکن وہ نہ راضی ہوئے تو؟

(اس کا جواب نرملا آنکھوں سے دیتی ہے جو اس کی بے بسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ کملا اسے چھوڑ کر اپنی جگہ واپس آجاتی ہے۔ نرملا گھر کے اندر چلی جاتی ہے)

مسز مہرا: لالا جی، آپ یہ بات کیسے کہتے ہیں۔ اب عورتوں کو بندر کھنے کا رواج نہیں رہا۔

رام رتن: جی ہمارے یہاں بند رکھنے کا رواج بالکل نہیں ہے۔ استریاں سب بازار جاتی ہیں، سیر تماشے میں جاتی ہیں، آزادی کے ساتھ سب سے ملتی جلتی ہیں۔

کملا: ہماری درخواست ہے کہ ڈوری کو ذرا اور ڈھیل دے دیجیے۔ جس سے نرملا ڈرامے میں حصہ لے سکے۔

(رام رتن کوئی جواب نہیں دیتا۔ صرف اس کے چہرے سے کسی قدر ناگواری

ظاہر ہوتی ہے۔ اسی دوران میں نرملا دروازے کے پاس آتی ہے اوراشارے سے کملا کو اندر بلاتی ہے۔کملا لپک کر اندر جاتی ہے اور تھوڑی دیر میں کشتیوں میں کھانے کا سامان لاکر رام رتن کے سامنے سجانا شروع کر دیتی ہیں۔ جب سامان لگ جاتا ہے رام رتن پلیٹوں میں مٹھائیاں رکھنا شروع کر دیتا ہے اور نرملا اور کملا سب کو پلیٹیں دیتی ہیں۔)

رام رتن: (سروپ چند سے) اور سنایئے لالا جی کیا خبر ہے۔

سروپ چند: ارے صاحب، خبریں بہت سی ہیں، آپ سے معاملے بھی بہت سے رہتے ہیں۔اس سے تو یہی بات ذہن پر سوار ہے کہ ڈرامے کے لیے ہیروئن تلاش کی جائے۔

کملا: لالا جی، آپ نے جو جواب دیا ہے وہ نرملا سے مشورہ کر کے دیا ہے یا اپنی طرف سے دے دیا۔

رام رتن: (ذرا تامل کے بعد) یہ تو ایسا صاف معاملہ ہے کہ اس میں مشورہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

کملا: مگر مجھے یقین ہے کہ نرملا کا بہت جی چاہتا ہوگا کہ ڈرامے میں حصہ لے، آپ نہ مانتے ہوں تو اس سے پوچھ لیجیے۔آپ کے سامنے کھڑی ہے۔

رام رتن: (دوسری طرف منہ پھیر کر) جی یہ باتیں اس طرح نہیں پوچھی جاتی ہیں۔

کملا: تو انھیں اس طرح طے بھی نہیں کر دینا چاہیے۔ یہ اصول کی باتیں ہیں، لڑکی چار پانچ برس کی ہوتی ہے تو ماں باپ چاہتے ہیں کہ ناچنا گانا سیکھے اور اس میں کامیاب ہوتی ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔لڑکی کی شادی ہوگئی تو یہ سب چیزیں بند کر دی جاتی ہیں اور ردی فلم دیکھنے کے سوا اسے اور کسی تسکین کا موقع نہیں ملتا۔ یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے۔

شو چرن: جی ہاں اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ لڑکیوں کو آرٹ کی تعلیم صرف اس لیے دی جاتی ہے کہ ان کی جلدی سے شادی ہو جائے کیوں مسز مہرا، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

کیلاش ناتھ: لالا جی، آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ شریف آدمی جس کام کو کرے وہ بھی شریف ہو جاتا ہے۔ ڈراما کرنے اور کرانے والے ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ہم کسی بھی لڑکی کو ہیروئن کا پارٹ

دے سکتے تھے۔ نرملا دیوی کو ہم اس لیے چاہتے ہیں کہ ہمیں شرافت کا نمونہ پیش کرنا ہے۔
ہمارے ڈرامے کا مقصد اصلاح کرنا ہے۔ دلچسپی کا سامان پیدا کرنا نہیں ہے۔

. رام رتن: صاحب یہ تو سب ٹھیک ہے۔ جس ڈرامے کی آپ تعریف کریں اس میں کیا برائی ہو سکتی ہے۔ مگر میں نے اپنی مرضی بھی آپ کو بتادی۔

مسز مہرا: (پانی کا گلاس جلدی سے ختم کر کے اٹھتے ہوئے) اچھا اب اجازت دیجیے۔

رام رتن: ارے صاحب، اتنی جلدی کیا ہے۔ کچھ تو اور کھا لیجیے۔

(باقی سب بھی مٹھائی جلدی جلدی ختم کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور رام رتن اور نرملا سے نمستے کہہ کر بائیں دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ کملا نرملا سے لپٹ کر رخصت ہوتی ہے اور رام رتن کی طرف دیکھے بغیر سلام کر کے دوسروں سے مل جاتی ہے)

(پردہ)

پانچواں سین

(مسز مہرا کا کمرہ، وہی جو پہلے سین میں تھا۔ کملا ایک گلدان کو میز پر رکھ رہی ہے۔ آج اس کے کپڑے ایسے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہیں ملنے جا رہی ہے یا گھر پر مہمانوں کے استقبال کے لیے تیار ہوئی ہے۔ گلدان رکھنے کے بعد وہ کمرے پر ایک آخری نظر ڈالتی ہے معلوم ہوتا ہے اب وہ اس حالت سے مطمئن ہے۔ مسز مہرا داخل ہوتی ہیں اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں)

مسز مہرا: (کملا کو اور کمرے کو غور سے دیکھتے ہوئے) آج تم نے کمرے کو خوب سجایا ہے اور خود بھی بن سنور کر آئی ہو۔

کملا: کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔

مسز مہرا: ہاں ممکن ہے میری ہی نظر غلطی کر رہی ہو...... بھئی کملا مہمانوں کے آنے سے پہلے تم سے ایک بات کر لینا چاہتی ہوں۔ میرے پاس بمبئی سے بھائی کا خط آیا ہے، وہ دو تین دن میں بیوی بچوں کے ساتھ آنے والے ہیں۔ تم کو تکلیف سے بچانے کے لیے میں نے کنورانی صاحبہ سے گفتگو کر لی ہے وہ بڑے شوق سے تم کو یہاں ہفتے دو ہفتے رکھ لیں گی۔

کملا: مجھے کنورانی صاحبہ کی سر پرستی درکار نہیں۔ میں خود سوچ رہی تھی کہ اپنے لیے کوئی انتظام کروں۔

مگر اسکول میں کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ اب ایک چھوٹا سا کمرہ مل گیا ہے۔ میں خود ہی آپ سے اجازت مانگنے والی تھی۔ آج مہمان رخصت ہو جائیں تو اپنا سامان لے کر چلی جاؤں گی۔

مسز مہرا: اتنی جلدی کرنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ مگر تمھارا جیسے جی چاہے۔ تم تو اپنی من مانی کرتی ہو۔

کملا: مجھے اپنے من کا ابھی تک پتا نہیں چلا، آپ کہتی ہیں کہ من مانی کرتی ہو۔

(کملا اپنی گھڑی دیکھتی ہے)

مسز مہرا: آج کون کون آ رہے ہیں؟

کملا: وہی سارے، آپ کے ہیروئن تلاش کرنے والے۔

مسز مہرا: مجھے اب ڈرامے سے اور ڈرامے کی ہیروئن سے کوئی دلچسپی نہیں رہی...... عجیب لوگ ہیں۔ پلاٹ میں نے بتایا۔ لکھوایا میں نے، ڈراما لکھ گیا تو اس کی نوک پلک میں نے درست کی، سارے کام میں جان میں نے ڈالی، جب ہیروئن کو چننے کا وقت آیا تو ادھر ادھر کی سوچنے لگے۔ مجھے در بدر پھرایا، ذلیل کیا...... اب تلاش کرلیں اپنی ہیروئن۔

(کملا ایک رسالے کو اٹھا کر اس کے ورق الٹنے لگتی ہے)

کملا: لوگوں کو تلاش کرنے میں کچھ مزہ آتا ہے۔

مسز مہرا: خوب اڑائیں مزے...... اور اس جیوتی پرکاش کو دیکھا۔ کیسا بدل گیا۔

کملا: جی ہاں، ان کا عجب حال ہے۔ رستہ چلتے عورتوں کو کھڑے ہو کر تکنے لگتے ہیں، ابھی کل تھوڑی دیر کے لیے رستے میں ساتھ ہوا تھا۔ چلنا دشوار ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کسی عورت کی شکل صورت، چال ڈھال پسند آ گئی تو یہ جھٹ سے جا کر اسے روپ متی کا پارٹ پیش کر دیں گے۔

مسز مہرا: اس آدمی کو میں نے سمجھو گلیوں میں پڑا پایا تھا۔ میں اس کی سرپرست بنی، اسے اچھے اچھے لوگوں سے ملایا، ہر طرح سے اس کی ہمت افزائی کی، ایک ممتاز ڈراما نویس بنا دیا...... اور اس کا بدلہ یہ مل رہا ہے...... بھئی دیکھو کملا! مجھ سے ان لوگوں کے ساتھ زیادہ دیر تک بیٹھا نہ جائے گا۔ میں مل تو لوں گی مگر تھوڑی دیر میں سر کے درد کا بہانہ کر کے چلی جاؤں گی۔

کملا: وہ لوگ خود بھی شاید زیادہ نہ بیٹھیں۔

مسز مہرا: وہ بیٹھیں یا نہ بیٹھیں۔ میں تو جلدی سے اٹھ کر جاؤں گی۔

(شو چرن اندر آتا ہے اور سلام کر کے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

کملا: آج آپ اکیلے کیسے آئے۔

شو چرن: میں اکیلا نہیں آیا ہوں، اور لوگ بھی ہیں۔ دروازے کے پاس تھے جب کوئی بحث چھڑ گئی۔ ابھی آتے ہوں گے۔

کملا: زبان سے بحث کر رہے ہیں یا پاؤں سے؟

شو چرن: جب آدمی کی توجہ بالکل کسی ایک طرف ہو جاتی ہے۔ تو اگر وہ چل رہا ہو تو خود ہی کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیوں......

مسز مہرا: ہاں ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر اس وقت چپ رہو۔ میرا ایسی باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور اب میں ہیروئن تلاش کرنے کا سلسلہ بھی بند کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے میرا جی اکتا گیا ہے۔

شو چرن: یہ کیسے ہو سکتا ہے مسز مہرا! ڈراما آپ ہی کی وجہ سے لکھا گیا، آپ ہی کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے دکھایا جا رہا ہے، ہیروئن کا انتخاب آپ ہی کے سپرد کیا گیا ہے، اب آپ الگ ہو جائیں گی تو یہ کام کیسے ہوگا؟ کیوں، کملا صاحبہ، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

کملا: مشکل یہی ہے کہ آپ جو بات کہتے ہیں وہ ٹھیک ہوتی ہے۔ افسوس ہے، یہ آپ کی سمجھ میں کبھی نہیں آتا کہ ٹھیک بات کہنا بھی نامناسب ہو سکتا ہے۔

شو چرن: تو کیا اس وقت یہ کہنا نامناسب تھا؟

(سروپ چند، کیلاش ناتھ، جیوتی پرکاش داخل ہوتے ہیں۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے کوئی مشکل درپیش ہے اور وہ کچھ بہت خوشی سے نہیں آ رہے ہیں۔ جیوتی پرکاش کی نظر فوراً کملا کی طرف جاتی ہے۔ اور وہ بیشتر اسی کو دیکھتا رہتا ہے)

مسز مہرا: آیئے آیئے، تشریف رکھیے...... کہیے آپ کی بحث کا کیا نتیجہ نکلا؟

سروپ چند: کون سی بحث کا؟

مسز مہرا: وہی جو آپ دروازے کے پاس کر رہے تھے۔

(تینوں شو چرن کی طرف دیکھتے ہیں وہ نظریں نیچی کر لیتا ہے)

سروپ چند: صاحب کیا کریں۔ ہم سے اتنی بڑی غلطی ہو گئی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا اس کی تلافی کیسے کریں۔

کیلاش ناتھ: جی ہاں ہم نے ڈراما سنا۔ ہم نے دیکھا کہ اس کا خاص کیرکٹر ایک Personality کا عکس ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ ڈراما اسی Personality کی بدولت لکھوایا گیا۔ اصل میں ہم کو اس کی فرمائش کرنا چاہیے تھا کہ یہی Personality اسٹیج پر آکر ڈرامے کی ترجمانی، اس کا Interpritation کرے اور اس طرح ایک Masterpiece ڈرامے کی تکمیل ہو جائے۔ ہمیں نہ جانے اس روز کیا ہو گیا تھا...... اب جو ہم ہیروئن تلاش کرنے کے لیے کافی آوارہ گردی کر چکے ہیں تو وہ بات سمجھ میں آئی جس کی طرف ہمارے خیال کو سب سے پہلے جانا چاہیے تھا۔ روپ متی کا پارٹ آپ ہی کر سکتی ہیں، اور ہم آپ سے درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ آپ اسے قبول فرمائیں۔

مسز مہرا: (بہت خوش ہو کر مگر خوشی کو دباتے ہوئے) مجھے ڈر تھا کہ میں نے ڈراما لکھوایا ہے تو آپ لوگ مجھ سے یہ مطالبہ کریں گے کہ روپ متی کا پارٹ ادا کروں۔ جب آپ نے سوچنا شروع کیا کہ یہ پارٹ کس کو دیا جائے تو مجھے اطمینان ہو گیا کہ چلو یہ مشکل تو دور ہو گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا کیسی جگہ ہے۔ میں روپ متی کا پارٹ کرتی تو اعتراض کرنے والے کہتے کہ میں نے ڈراما اس نیت سے لکھوایا تھا کہ ایک دل کش روپ میں اسٹیج پر آسکوں۔ اسی وجہ سے میں بہت خوشی کے ساتھ ہیروئن تلاش کرنے میں آپ کے ساتھ شریک ہوئی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اب میں دیکھتی ہوں کہ مجھ میں اعتماد نہیں رہا کہ میں روپ متی کا حق ادا کر سکوں گی...... یہ خیال دل میں بیٹھ گیا ہے کہ اس پارٹ کو کسی اور کو ہی ادا کرنا چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے سوچنے کے لیے چند دنوں کی مہلت دیں۔

کیلاش ناتھ: آپ بے شک سوچنے کے لیے جتنے دنوں کی مہلت چاہتی ہوں لیجیے۔ ہم اپنی جگہ

پر سمجھ لیں گے کہ آپ نے ہماری درخواست قبول فرمالی ہے۔

مسز مہرا: مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ دل کی بات دل میں رکھوں اور لوگوں کو اس بارے میں عقلی گدے لگانے دوں کہ میرا اصل منشا کیا ہے۔ میرے دل سے یہ خیال بالکل نکل گیا تھا کہ مجھ سے روپ متی کا پارٹ کرنے کو کہا جاسکتا ہے۔ اب آپ لوگوں نے فرمائش کی ہے تو مجھے اس خیال کو دوبارہ دل میں آباد کرنا ہوگا۔ روزمرہ کی زندگی میں روپ متی کا انداز اختیار کرنا ہوگا۔ گویا اس کی کوشش کرنا ہوگی کہ روپ متی بن جاؤں۔ اگر میں ایسا نہ کرسکی تو آپ سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ روپ متی کا پارٹ نہیں کرسکتی ہوں۔

کیلاش ناتھ: واہ صاحب، اس وقت تو آپ نے ایکٹنگ کا بنیادی اصول بڑی خوبی سے بیان کردیا ہے۔ اب تو مجھے اور بھی یقین ہو گیا ہے کہ روپ متی کا پارٹ آپ ہی کو ادا کرنا چاہیے۔

مسز مہرا: مجھے ڈر صرف اس کا ہے کہ میری اور روپ متی کی عمر میں جو فرق ہے وہ کسی نہ کسی طرح سے ظاہر ہو جائے گا۔ میری طبیعت میں اب طوفانی کیفیت بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ اور روپ متی انھیں طوفانی کیفیتوں سے لڑنے والی ایک کشتی ہے۔

شو چرن: جی ہاں اسی وجہ سے خیال ہوا تھا کہ شاید کملا صاحبہ اس پارٹ کے لیے زیادہ موزوں رہیں۔ کیوں جیوتی پرکاش صاحب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

(لالہ سروپ چند سر پر ہاتھ مارتے ہیں۔ کیلاش ناتھ شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتا ہے۔ کملا منہ کو ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے۔ مسز مہرا کو پہلے تو معلوم ہوتا ہے کسی نے سر پر لاٹھی مار دی ہے پھر رفتہ رفتہ ان پر غصہ چڑھتا ہے اور وہ کانپنے لگتی ہیں)

جیوتی پرکاش: (جھومتے ہوئے) واہ میرے شیر واہ!

مسز مہرا: شو چرن، تم نے میرے اوپر بڑا احسان کیا جو بات سب کے دل میں تھی وہ صاف صاف بیان کردی۔ نہیں تو میں نہ معلوم کب تک جھوٹ اور فریب کے اس جال میں پھنسی رہتی...... آپ لوگ بڑی خوشی سے کملا کو روپ متی بنایئے۔ مگر میں آپ لوگوں کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ کملا میرے یہاں نہیں رہے گی اور میں آپ لوگوں کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔

(مسز مہرا اٹھ کر کمرے سے باہر چلی جاتی ہیں۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔
پھر سب لوگ رفتہ رفتہ اپنی اصل حالت پر آ جاتے ہیں)

کملا: کہیے، آپ لوگوں کے لیے چائے بناؤں؟

سروپ چند: زیادہ مناسب تو یہ ہوگا کہ آپ ہمارے اوپر ایک ایک بالٹی ٹھنڈا پانی ڈال دیں۔

کیلاش ناتھ: جی نہیں، چائے بنانے کی تکلیف نہ کیجیے۔ میرے خیال میں تو اب ہم کو یہاں سے چل دینا چاہیے۔

شو چرن: کیوں کملا صاحبہ، میں تو سمجھتا تھا کہ مسز مہرا آپ کی خالہ ہیں اور آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔

کملا: جی ہاں، دونوں باتیں ٹھیک ہیں۔

شو چرن: تو پھر وہ اتنی خفا کیوں ہو گئیں؟

کملا: بڑے تعجب کی بات ہے۔ کیوں، جیوتی پرکاش صاحب میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟

جیوتی پرکاش: جی نہیں، آپ ٹھیک نہیں کہہ رہی ہیں۔ میں نے چند ملاقاتوں میں آپ دونوں کے تعلقات کا اندازہ کر لیا۔ اگلے ڈرامے کا پلاٹ بھی میری سمجھ میں آ گیا......

کملا: اب میرے اوپر رحم کیجیے۔ ایک ڈرامے کا جو نتیجہ ہوا وہ آپ نے خود ہی دیکھ لیا۔ آپ دوسرا ڈراما لکھیں گے تو ممکن ہے میں اسکول سے نکال دی جاؤں۔

جیوتی پرکاش: یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ آپ پہلے وعدہ کیجیے کہ آپ روپ متی کا پارٹ کریں گی۔

کملا: کون سی روپ متی اور کیسا پارٹ۔

جیوتی پرکاش: روپ متی آپ کا دوسرا نام ہے اور اس کا پارٹ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ جیسی ہیں ویسی ہی ایک ڈرامے کو دکھانے میں شریک ہو جائیں۔

کملا: اچھا، ڈراما نویس ایکٹنگ کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں۔

جیوتی پرکاش: آپ کو کسی تعلیم کی ضرورت نہیں۔

کیلاش ناتھ: جی ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ کو تعلیم دینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ کے لیے روپ متی کا پارٹ کرنا آپ کی طبیعت اور تربیت نے بہت آسان کر دیا ہے۔

کملا: یہ کیسی بات ہے۔ آپ مجھ سے ڈرامے میں کسی روپ متی کا پارٹ کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ جب مجھے معلوم نہیں کہ ڈراما کیا ہے اور اس میں روپ متی کا پارٹ کیا ہے۔

جیوتی پرکاش: ڈراما آپ سن چکی ہیں اور آپ جانتی ہیں کہ اس میں روپ متی کا پارٹ کیا ہے۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ سے اس بارے میں گفتگو نہیں کی ہے، وہ ٹھیک ہے۔ اب آپ اپنا سامان نکال کر لائیے ہم آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچادیں گے۔ ہم کو آپ کا پتا معلوم ہو جائے گا اور رستے میں کام کی باتیں ہو جائیں گی۔ بس چلیے اب اور بحث نہ کیجیے۔

کیلاش ناتھ: جی ہاں، میری بھی یہی رائے ہے۔

(کملا کھڑی ہو کر ذرا دیر سوچتی ہے، پھر چلی جاتی ہے اور فوراً بستر بند اور بکس لے کر آجاتی ہے)

سروپ چند: اچھا، آپ تو جانے کے لیے بالکل تیار تھیں...... مگر ہمیں بھی دیکھیے کہ کیا خوب لوگ ہیں۔ پہلے ہیروئن کو تلاش کیا اور جب وہ مل گئی تو اسے گھر سے نکلوادیا۔

(شو چرن کملا کا بکس اٹھالیتا ہے۔ کیلاش ناتھ اس کا بستر بند۔ وہ آگے آگے چلتے ہیں، سروپ چند اور جیوتی پرکاش ان کے پیچھے۔ کملا باہر جانے سے پہلے مڑ کر کمرے پر ایک محبت بھری نظر ڈالتی ہے، پھر اس طرح ہاتھ اٹھاتی ہے جیسے رخصت ہوتے وقت اٹھاتے ہیں)

(پردہ)

دوسری شام

کردار (کیرکٹر)

چودھری	:	آرٹسٹ، عمر 35 سال
شاما	:	اس کی دوسری بیوی، عمر 30 سال
بدلو	:	نوکر
مینا	:	شاما کی سہیلی، عمر 28 سال
رام کمار	:	ایک دولت مند آدمی، مصوری کا شوقین، عمر 50 سال
شکنتلا	:	چودھری کی ایک مداح، عمر 30 سال
تمھی	:	چودھری کی پہلی بیوی، عمر 25 سال
وکیل	:	تمھی کا چچا، عمر 50 سال
نظر	:	ایک نقاد، عمر 40 سال
منّے	:	شاما کا پہلا شوہر

پہلا ایکٹ

ایک کمرہ جو معلوم ہوتا ہے بنایا سجایا گیا ہے۔ پیچھے کی طرف قریب قریب اسٹیج کے بیچ میں دیوار سے لگی ہوئی ستی ہے، اس کے سامنے نیچی لمبی میز، جس پر گلدان رکھا ہے۔ ستی کے مقابلے میں دونوں کونوں پر آرام کرسیاں ہیں۔ دائیں طرف پیچھے کے کونے میں ایک میز پر گملا رکھا ہے۔ اسی کے قریب دائیں دیوار سے لگی ہوئی ایک میز ہے۔ بالکل آگے، دائیں طرف دوسری ستی ہے، اس کے سامنے گول میز، بائیں طرف، آگے ایک ایزل (Easel) رکھا ہے، اس طرح کہ جو اس پر کام کرے اس کا رخ اگلے بائیں کونے کی طرف ہوگا۔ ایزل کے قریب ایک میز ہے، جس پر رنگوں کے ٹیوب، برش وغیرہ رکھے ہیں۔ اس کے پیچھے بائیں طرف کی دیوار سے لگا ہوا کپ بورڈ ہے، جس کے اوپر ادھر اُدھر بورڈ بے ترتیب پڑے ہیں، جن پر ڈرائنگ کے کاغذ اور کینوس پن پڑے ہوئے ہیں۔ دیواروں کی تصویروں اور دوسری چیزوں سے آرائش کی گئی ہے۔

سہ پہر کا وقت ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو چودھری ایک تصویر بنانے
میں مصروف ہے۔ شاما گلدان کے پھولوں کو ٹھیک کر رہی ہے۔ اس کے بعد
وہ سامنے دائیں طرف کی میز کے میز پوش کو برابر کرتی ہے۔ اور سٹی پر اس
طرح بیٹھ جاتی ہے جیسے بہت تھک گئی ہے۔

شاما: (جماہی لیتے ہوئے) میں تھک کر چور ہو گئی ہوں اور بدلو کسی طرح سے چائے نہیں لاتا۔ بدلو!

بدلو: (چائے کا سامان ٹرے پر لاتے ہوئے) جی صاحب!...... چائے کدھر لگاؤں؟

شاما: اسی میز پر رکھ دو۔ مجھ سے اب اٹھا نہیں جاتا۔ اور ایک کرسی لگا دو

(بدلو سٹی کے سامنے گول میز پر ٹرے رکھ دیتا ہے اور دائیں طرف کی آرام کرسی اس کے
پاس بچھا دیتا ہے) آؤ چودھری اب چائے پی لو۔ (چودھری تصویر پر ایک آخری نظر ڈال
کر لمبی سانس لیتا ہے، ہاتھوں کو رگڑ کر رنگ چھڑاتا ہے اور پھر آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔
شاما اسے چائے کی پیالی دیتی ہے)

میں نے اتنی محنت سے کمرہ سجایا ہے۔ تم نے نہ کوئی مشورہ دیا نہ اب کوئی رائے دیتے ہو۔

چودھری: (کمرے کو دیکھتے ہوئے) کمرہ۔ ہوں۔

شاما: بس اتنا کیا کہ تمھاری بنائی ہوئی جو تصویر لگائی تھی اسے اتار لیا۔

چودھری: یہ کمرہ تمھارا ہے، اسے تم نے سجایا ہے۔ اسے اپنا ہی رکھو۔

شاما: تم ایسی باتیں کرتے ہو تو میرا دل دکھتا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ میں نے تمھارے لیے کیا کچھ
چھوڑا ہے اور کیسے چھوڑا ہے؟

چودھری: کیا کروں ایسا بنا ہے کہ ہر وقت میرا دل دکھتا رہتا ہے شاید اسی وجہ سے میں دوسروں کا دل
بھی دکھایا کرتا ہوں۔ لیکن اصل میں میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اس کمرے کو آباد کرنا، اسے
سجانا، یہ تمھارا خیال اور تمھاری خواہش ہے۔

شاما: تو کیا جو کچھ ہوا اس کی تمھیں خواہش نہیں تھی؟

چودھری: تھی کیوں نہیں۔ بہت تھی لیکن میں اس کمرے کو آباد کروں تو اس میں صرف دیواروں پر نہیں
بلکہ اوپر، نیچے، آگے، پیچھے ہر طرف میری تصویریں ہونی چاہئیں۔ ہر تصویر کے ساتھ ان

تمام اثرات کی علامتیں اور مثالیں ہونی چاہئیں جن کا وہ نتیجہ تھی، میری پہلی بیوی تھی، اور اس کے علاوہ وہ تمام عورتیں جن سے مجھے محبت رہ چکی ہے یا جن کی شکل صورت، ادایا انداز کا میرے اوپر اثر پڑا ہے۔ اس تمام کھڑاک کو میں یہاں بھرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے تم سے کہتا ہوں کہ اس کمرے کو اپنا بنا کر رکھو۔

شاما: اگر یہی بات ہے تو مجھے یہ منظور ہے کہ یہ کمرہ اور اس کی سجاوٹ اور اس کمرے میں ہماری زندگی، میری خواہش اور میرے خیال کے مطابق ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ اب تک تمھاری زندگی کس طرح گزری ہے، تم کتنی چیزوں سے محروم رہے۔ تم جس عورت کو اپنی پہلی بیوی کہتے ہو اس میں تمھاری شخصیت اور فن کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے کی کتنی قابلیت ہے۔ میں نہ تم سے کپڑے اور زیور کی فرمائش کروں گی، نہ آنسو پونچھواؤں گی۔ ہم دونوں اب ایک نئی زندگی شروع کر رہے ہیں۔ یہ کمرہ اور اس کی آرائش میری سہی، مگر میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ دنیا چاہے جو کچھ کہے، میں تمھارے لیے سب کچھ تج دوں گی، اب میری زندگی صرف تمھارے شوق اور تمھارے کام میں نظر آئے گی۔

چودھری: اور میرا کام خراب ہوا اور دنیا کو پسند نہ آیا تو؟

شاما: یہ ہو ہی نہیں سکتا (فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ شاما اٹھ کر جاتی ہے، اور بات کرتی ہے) ہلو، کون صاحب ہیں۔ مسز کھیم چند فرنیچر والے؟...... میں دوسو کا ایک چک تو دے چکی ہوں...... باقی؟ باقی بھی مل جائے گا...... آپ سال کا حساب بند کر رہے ہیں؟ مگر آپ سے تو یہ طے ہوا تھا کہ آپ ہر مہینے دوسو کا انسٹالمنٹ لے لیں گے...... واہ واہ، طے کیسے نہیں ہوا تھا...... آپ کے پاس کوئی تحریر نہیں ہے؟ تو آپ نے لکھوا کیوں نہیں لی؟ اور اس میں نقصان کیا ہوا۔ اب لکھ دوں گی...... جی نہیں، میں پوری رقم ابھی نہیں ادا کروں گی...... جی نہیں، نہ ایک ہفتے میں نہ پندرہ دن میں...... جی، کیا؟ آپ سامان منگوالیں گے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟...... اچھا ٹھہریئے میں کل گیارہ بجے کے قریب آؤں گی اور آپ کے منیجر صاحب سے بات کرلوں گی...... جی نہیں میں نے روپیہ لانے کو نہیں کہا ہے...... میں نے کہہ دیا نا کہ کل آؤں گی۔ (شاما فون بند کر دیتی ہے۔ چہرے

سے جھنجھلاہٹ اور خوف ظاہر ہوتا ہے۔ آ کرسٹی پر بیٹھ جاتی ہے) عجیب لوگ ہیں، پہلے میٹھی میٹھی باتیں کیں، جو سامان مانگا، دے دیا، اب اپنے وعدے بھول گئے، بدتمیزی سے تقاضا کرتے ہیں۔

چودھری: میں تم سے پہلے کہہ رہا تھا یہ سب سامان خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟

شاما: ہاں، میں تمھاری پہلی بیوی تھی کی طرح گوارا کرتی کہ اپنے لیے زیور اور کپڑے بناؤں اور تمھارے کمرے میں بیٹھنے کی جگہ نہ ہو۔ ہر کونے میں مکڑی کا جالا لگا ہو، اور تمھاری تصویریں دیکھنے کے لیے کوئی آئے تو سارے وقت کھڑا رہے۔ میں تو تمھارے آرام کی خاطر اپنا زیور تک بیچ ڈالوں گی۔

چودھری: چاہے اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہو؟

شاما: فائدہ کیسے نہ ہوگا؟ تم اپنے کام کی طرف زیادہ توجہ کرسکو گے۔ زیادہ لوگوں کو تصویریں دیکھنے کے لیے بلا سکو گے۔ تمھاری تصویریں بکیں گی، اس سے تمھارا حوصلہ بڑھے گا۔

چودھری: میری یہ بات اب تک تمھاری سمجھ میں نہیں آئی ہے کہ میں دکھانے کے لیے اور بیچنے کے لیے تصویریں نہیں بناتا ہوں۔

شاما: یہی بات تو سمجھ میں آگئی ہے۔ اسی وجہ سے میں محسوس کرتی ہوں کہ تم کو میری ضرورت ہے۔ تمھاری تصویریں دکھانا، لوگوں کو تمھارا آرٹ سمجھانا، ان کے تاثرات تم تک پہنچانا، اب یہ میرا کام ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح میں تمھارے فن کو، تمھاری کیفیتوں کو سمجھوں گی اور کوئی نہ سمجھ سکے گا، اس لیے کہ اب ہم ایک دل، ایک جان ہوگئے ہیں۔ (فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ شاما جا کر فون اٹھاتی ہے) ہلو، کون صاحب ہیں؟...... اوہو، نظر صاحب، نمستے، آداب...... آپ کی دعا ہے...... جی ہاں، بس آج ہی کمرہ ٹھیک کیا ہے...... ضرور تشریف لائیے، جی چاہے تو کچھ اور لوگوں کو بھی لیتے آیئے۔ اب تو بیٹھنے کے لیے جگہ ہوگئی ہے...... کون صاحب، رام کمار صاحب...... مل اُونر (Mill Owner) ہیں۔ ابھی یورپ سے واپس آئے ہیں...... آپ کہتے ہیں کہ آرٹ کو سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا...... کسی وقت بھی آسکتے ہیں؟...... جی ہاں، میں تو گھر ہی پر رہوں گی...... اور آپ کل

تشریف لائیں گے...... بہت اچھا، آداب۔(شاما فون بند کر کے خوش خوش اپنی جگہ
پر واپس جاتی ہے)۔لو، مبارک ہو، ایک مل اُونر تمھارا کام دیکھنے آرہے ہیں!

چودھری: اچھا، تو میں جا کر سیر کر آؤں۔ تصویریں دکھانا تو تمھارا کام ہو گیا ہے۔

شاما: نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔تم کو یہیں رہنا اور رام کمار صاحب کو تصویریں دکھانا ہوگا۔
(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)۔لو، شاید وہ پہنچ ہی گئے۔
(شاما ساری برابر کرتی ہوئی دروازے کی طرف جاتی ہے۔اسی وقت مینا اندر آتی ہے،
دونوں گلے ملتی ہیں۔)
ارے مینا، تم ہو۔ بھئی خوب آئیں۔ آؤ بیٹھو، چائے پیو۔ بدلو! ذرا ایک پیالی اور تازی
چائے لے آؤ۔

(مینا کو دیکھ کر چودھری کھڑا ہو جاتا ہے۔ مینا اسے سلام کرتی ہے۔ چودھری
سلام کا جواب دے کر ایزل کی طرف چلا جاتا ہے اور برش ہاتھ میں لے کر
تصویر کو دیکھنے لگتا ہے۔ مینا اس کی جگہ آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

مینا: (کمرے کو دیکھتے ہوئے) شاما بہن آپ کے کمرے کو جتنی دفعہ دیکھتی ہوں زیادہ پسند آتا
ہے......اچھا، یہ بتایئے،اس پر سب ملا کر خرچ کتنا ہوا؟

شاما: آٹھ سو روپے۔

مینا: (منہ بنا کر) لیجیے، میں سوچ رہی تھی کہ اپنے کمرے کو بھی اسی طرح سجاؤں گی، مگر، مگر آٹھ
سو روپے کہاں سے لاؤں۔ سوچتی تھی کہ انسٹالمنٹ پر سامان لے لوں گی، مگر آپ کے
بھائی کہتے ہیں کہ ایسا ہرگز مت کرنا۔ فرنیچر والے پہلے تو راضی ہو جاتے ہیں، پھر کھوج
کرنے لگتے ہیں، گھر کے حالات کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے
کو خبریں پہنچاتے رہتے ہیں۔ آپ کے بھائی کہہ رہے تھے کہ ان کے کسی دوست کی
بیوی نے اسی طرح سامان لیا تھا۔ ایک دن میاں بیوی میں معمولی سی لڑائی ہوئی،
دوسرے دن فرنیچر والے کا فون آیا کہ پورے دام ادا کر دو نہیں تو سامان واپس منگا لیا
جائے گا۔

شاما: اچھا، یہ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں؟

مینا: جی ہاں، بہن، مگر آپ کو کیا فکر ہے۔ آپ کے یہاں تو اپنا فرنیچر کا بڑا کاروبار ہے.....اچھا بتایئے بہن، آپ کل سیٹھ صاحب کی پارٹی میں نہیں آئیں۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ انھوں نے آپ کو بلایا ہے۔

شاما: ہاں انھوں نے بلایا تو تھا، مگر میں جا نہیں سکی۔

مینا: بہن مہینے میں دو چار پارٹیوں میں ضرور چلی جایا کیجیے۔ ان میں جی تو بہت گھبراتا ہے۔ لیکن جائے بغیر کام بھی نہیں چلتا۔ میں تو خود بھی نہیں جانا چاہتی، مگر آپ کے بھائی کہتے ہیں کہ جاؤ گی نہیں تو لوگ سمجھیں گے کہ انتقال کر گئی ہو یا مجھے چھوڑ کر بھاگ گئی ہو۔

(بدلو چائے دان اور پیالی لے کر اندر آتا ہے اور اسے میز پر رکھ دیتا ہے۔ شاما چائے دان کا ڈھکنا اٹھا کر چائے کو چلاتی ہے۔ پھر مینا کی پیالی میں چائے اُنڈیلتی ہے، اور اس میں دودھ اور شکر ڈالتی ہے)

شاما: دیکھ لو، دودھ اور شکر ٹھیک ہے یا نہیں۔

مینا: شکریہ بہن، آپ تو جانتی ہیں کہ مجھے کیسی چائے پسند ہے......(چودھری کی طرف دیکھ کر) معلوم نہیں اس وقت چودھری بھائی کیا بنا رہے ہیں۔ ان کے اوپر تو جگہ بدلنے کا بہت اچھا اثر ہوا ہوگا۔

شاما: ابھی تو وہی تصویر چل رہی ہے جو وہاں بنا رہے تھے۔ جگہ بدلنے سے فائدہ تو ہونا چاہیے۔

مینا: ہاں، شاما بہن اور ذمہ داریاں تو سب آپ نے اپنے اوپر لے لی ہیں۔ اب یہ اپنے کام میں لگے رہیں گے۔ ان کو دنیا سے بھی کوئی مطلب نہیں۔

شاما: ان کو مطلب نہیں ہے، مجھے تو ہے۔ بتاؤ دنیا کیا کہہ رہی ہے۔

مینا: ارے، بہن، اس دنیا میں کسی کو کسی سے کیا غرض؟ میں تو ہر جگہ ان کی مصوری کی تعریف کرتی ہوں، اور کہتی ہوں کہ کسی مصور کو آپ کی جیسی بیوی مل جائے تو اسے بڑا خوش قسمت سمجھنا چاہیے۔

شاما: اور لوگ کیا کہتے ہیں؟

مینا: لوگ کیا کہتے، کسی کی کوئی رائے تھوڑی ہی ہوتی ہے۔ پارٹیوں میں ملتے ہیں، ہنسی مذاق ہوتا ہے، خبریں سنی اور سنائی جاتی ہیں۔ کوئی آرٹ کرٹک (Art Critic) بن کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتا ہے، کوئی سماج کے لیے من مانے قاعدے بنانے لگتا ہے۔ ایک کوئی نئے مجسٹریٹ آئے ہیں، کہتے ہیں کہ میرا بس چلا تو نہ سِوِل میرج ہونے دوں گا نہ کسی عورت کو دوسری شادی کرنے دوں گا۔ پوچھیے وہ کون ہوتے ہیں کہ ہم سے ایسے حق چھین لیں، جو دستور نے ہر مرد عورت کو دیے ہیں۔ مگر اس سے پرانے خیال کے لوگوں کو بڑا سہارا مل گیا ہے۔ سب ان کے پاس شکایتیں لے کر پہنچتے ہیں اور وہ اپنی بات رکھنے کے لیے کہتے رہتے ہیں کہ دیکھیے میں کچھ کروں گا، ضرور کروں گا۔ کچھ فسادیوں نے تحمی کو بھی ان کے پاس پہنچادیا، ان کو تو رونے دھونے کی بہت مشق ہے، معلوم نہیں کیا کہہ آئیں، کیا وعدے لے آئیں۔ میں کہتی ہوں کہ وہ زمانہ گیا جب مجسٹریٹ سماج پر حکومت کرتے تھے۔ اب بھلا وہ کیا کر سکتا ہے۔ مگر دل دُھک دُھک ہوتا رہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تحمی ان سے مل کر آئیں تو بہت مطمئن تھیں، کہہ رہی تھیں کہ میرے چودھری کو کوئی عورت مجھ سے چھین نہیں سکتی ہے، چاہے آرٹ کی جتنی بھی بڑی قدر دان ہو۔ میں تو اپنے چودھری کو واپس لے کر رہوں گی۔ لیکن ایسی باتوں سے ہو کیا سکتا ہے، جو کچھ ہوا اس میں چودھری بھائی کی مرضی بھی تو شامل تھی۔ اب یہ سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے رو رو کر چودھری بھائی کے ناک میں دم کر دیا تھا۔ وہ بھلا اب تحمی کے ساتھ رہنا کیسے گوارا کر سکیں گے۔

شاما: تو اب تحمی کے یہ تیور ہیں۔

مینا: جی ہاں، اور سب اس بل پر کہ ان کے باپ کا فرنیچر کا بڑا کاروبار ہے، چچا وکیل ہیں، خاندان با اثر ہے اور انھیں ایک ہمدرد مجسٹریٹ مل گیا ہے۔ مگر آپ نے تو آرٹ اور تہذیب کی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ آپ پر ان لوگوں کی چالوں کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اور پھر آپ کو چودھری بھائی کی کامیابی سے جو خوشی نصیب ہوگی اس سے بڑھ کر کون سی نعمت ہو سکتی ہے۔

شاما: ہاں بینا، سچ کہتی ہو۔ میرا حوصلہ یہ ہے کہ میں مر جاؤں، صرف میری محبت اور میرا آدرش چودھری کے کام میں نظر آئے۔

بینا: جی ہاں بہن، اور کبھی نہ کبھی لوگ آپ کی محبت اور ایثار کو تسلیم کریں گے اور اس کی قدر کریں گے۔ مجھے بھی ادھر ادھر کی باتیں سننے اور دہرانے کا شوق نہیں ہے، میرے لیے بھی جو کچھ ہیں آپ کے بھائی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میری کامیابی اسی میں ہے کہ وہ خوش رہیں۔ اسی وجہ سے ہر وقت چوکنا رہتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ مردوں کو لاکھ خوش رکھیے۔ ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ معلوم نہیں کون کس وقت انھیں بھا جائے، وہ پچھلی باتیں بھول جائیں اور کسی اور کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے کے خیال میں پڑ جائیں۔ (دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ بینا کھڑی ہو جاتی ہے) لیجیے بہن، آپ سے کوئی ملنے آ گیا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ دیر ہو گئی ہے۔ آپ کے پاس جب آتی ہوں اور آپ کی مزے دار چائے پیتی ہوں تو زبان روکے نہیں رکتی اور وقت کا خیال نہیں رہتا۔

(دروازے کے پاس اس کی رام کمار سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ رام کمار ایک طرف کو کھڑا ہو جاتا ہے۔ بینا اس طرح باہر جاتی ہے کہ گویا چھپ کر نکل رہی ہے۔

رام کمار قریب پچاس برس کی عمر کا آدمی ہے۔ بہت اچھا سلا ہوا سوٹ پہنے ہے۔ چہرے سے خودداری اور سنجیدگی ظاہر ہوتی ہے، انداز میں متانت اور اطمینان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت واقف کار ہے۔ اسے دھوکا دینا اور باتوں میں بہلا لینا بہت مشکل ہے۔ اندر آ کر وہ کمرے پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ شاما کی موجودگی سے کوئی اثر نہیں لیتا، معلوم ہوتا ہے کہ اسے وہ فرنیچر کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔ پھر چودھری کو دیکھتا ہے۔ مسکراتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور اس سے ہاتھ ملاتا ہے۔)

رام کمار: چودھری صاحب، میرا نام رام کمار ہے۔ آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ اس طرح بے اطلاع کیے پہنچ گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ آپ سے فون پر وقت مقرر کر لوں، مگر معلوم

ہوا کہ آپ کا نمبر نیا ہے اور ابھی ڈائرکٹری میں درج نہیں کیا گیا ہے۔ نظر صاحب سے
پوچھنا بھول گیا تھا اور آج وہ کہیں ملے نہیں۔ مگر انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ خود آپ کو
اطلاع کر دیں گے۔ مجھے کل باہر جانا ہے، ورنہ اور انتظار کر لیتا۔

شاما: (آگے بڑھ کر) جی ہاں، انھوں نے مجھے خبر کر دی تھی، ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ آیئے
تشریف رکھیے۔ چائے بھی حاضر ہے۔

(رام کمار اس تصویر کو غور سے دیکھتا ہے جو چودھری بنا رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے
اس نے سنا ہی نہیں کہ شاما نے کیا کہا ہے۔ شاما کو یہ برا لگتا ہے۔ پھر بھی ایک
پیالی چائے بناتی ہے۔)

رام کمار: (چودھری سے) نظر صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے۔ آپ کے رنگوں میں بڑی کشش ہے،
Composition میں بڑی گہرائی ہے...... مگر آپ برا نہ مانیں تو ایک سوال پوچھوں۔
یہ تصویر جو آپ بنا رہے ہیں اس کا اٹھان بہت اچھا تھا، مگر بعد میں معلوم ہوتا ہے آپ
نے اپنی رائے بدل دی یا آپ کی کیفیت بدل گئی۔ آخری برش کچھ بہکے بہکے معلوم ہوتے
ہیں۔ کیا میرا خیال صحیح ہے؟

(اس دوران شاما رام کمار کو چائے کی پیالی دیتی ہے۔ وہ پیالی لے لیتا ہے،
مگر نہ شکریہ ادا کرتا ہے نہ شاما کی طرف دیکھتا ہے۔ شاما جل کر اپنی جگہ
پر واپس چلی جاتی ہے اور رام کمار کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے)

چودھری: (ہنس کر، خوشی کے ساتھ) آپ کی نظر کی داد دیتا ہوں۔ آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ اس
تصویر میں جو کچھ میں بیان کرنا چاہتا تھا وہ بات اب بے موقع معلوم ہوتی ہے۔ طبیعت پر
جو اثر تھا وہ غائب ہو گیا ہے۔ دو دن سے کوشش کر رہا ہوں، کام آگے بڑھتا ہی نہیں، اب
سوچ رہا ہوں کہ اسے یہیں چھوڑ دوں...... آپ کو فرصت ہو تو اور کام دکھاؤں۔

رام کمار: جی ہاں، ضرور دکھایئے۔ میں تو اسی لیے حاضر ہوا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ مجھ میں مصوری کی
کچھ سمجھ آجائے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو کچھ ایسی تصویریں بھی دکھا دیجیے جو آپ مکمل
نہ کر سکے ہوں یا جنھیں آپ نے رجکٹ (Reject) کر دیا ہو۔ اور اس کی وجہ بھی بیان

(رام کمار چودھری کی طرف دیکھتا ہے کہ گویا تعارف کرانا اسی کا فرض تھا،
اوراب اسے کچھ کہنا چاہیے۔ چودھری کھسیانا ہوکر اپنی تصویریں سمیٹنے لگتا ہے۔)

چودھری: معاف کرو شاما، مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تعارف کرانا ہے۔ میں اس فکر میں تھا کہ ایک مالدار آدمی کا، جو ممکن ہے بدمذاق ہو، مقابلہ کیسے کروں، اور اپنی تصویروں کو اس سے کیسے چھپاؤں۔ رام کمار صاحب کی پہلی ہی بات نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ پھر سمجھو دو ہم مذاق مل گئے، اور دونوں کو دنیا کی خبر نہیں رہی۔

شکنتلا: اچھا اب میں آپ کا تعارف کرادوں۔ یہ رام کمار صاحب ہیں، یہ چودھری صاحب کی بیوی شاما۔

رام کمار: آداب عرض کرتا ہوں۔ امید ہے آپ میری بدتمیزی کو معاف فرمائیں گی۔ آپ نے تو مجھے چائے کی پیالی بھی عنایت فرمائی تھی۔ تب تو مجھے آداب کا خیال آنا چاہیے تھا۔

شکنتلا: خیر، اب اتنا بہت سا الزام اپنے اوپر نہ لے لیجیے۔ یہ کہہ دیجیے کہ آپ پیرس سے آرہے ہیں، اور وہاں اب نیا فیشن یہ ہے کہ عورتوں کی طرف دیکھتے نہیں ہیں۔

رام کمار: (ہنس کر) جی ہاں، کچھ قصور اس میں پیرس کا بھی ہے۔ میں وہاں ایک دو آرٹسٹوں سے ملنے گیا۔ ہر جگہ آرٹسٹ کے آتیلیے (Ateller) میں ایک عورت تھی جس کا مجھ سے تعارف نہیں کرایا گیا۔

(شاما کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا ہے۔ وہ منہ پھیر لیتی ہے شکنتلا آرام کرسی کو پیچھے کی طرف گھسیٹ کر اور اس کا رخ ٹھیک کر کے اس پر بیٹھ جاتی ہے۔)

شکنتلا: اچھا، رام کمار صاحب بتایئے آپ نے چودھری صاحب کا کام کچھ دیکھا؟

رام کمار: ابھی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ چودھری صاحب کا کام دیکھا ہے، مگر جو دو ایک تصویریں دیکھی ہیں وہ بہت پسند آئیں۔

شکنتلا: معلوم نہیں نظر صاحب نے آپ سے کل ذکر کیا تھا یا نہیں، مگر بعض لوگوں کی رائے ہے کہ چودھری صاحب کی تصویروں کی نمائش بمبئی اور دہلی میں کرائی جائے۔

رام کمار: جی ہاں، ضرور کرائیے، آپ جانتی ہیں کہ میں تو کاروباری آدمی ہوں، اپنے دھندوں میں لگا رہتا ہوں۔ دوڑ دھوپ کے کام نہ کر سکوں گا، وقت بھی زیادہ نہ دے سکوں گا۔ مگر مدد کا اور کوئی طریقہ ہو تو حاضر ہوں۔

شکنتلا: ہم کو تو بس آپ کی سرپرستی چاہیے، اور سب کام ہم کرلیں گے۔

رام کمار: (جیب سے کارڈ نکال کر شکنتلا کو دیتا ہے) یہ لیجیے میرا کارڈ۔ اس پر کئی پتے لکھے ہیں۔ آپ جلد جواب چاہتی ہوں تو جو خط آپ لکھیں اس کی ایک نقل ہر پتہ پر بھیج دیجیے گا۔

شکنتلا: بہت بہت شکریہ۔ اچھا اب آپ تصویریں دیکھیے، میں شاما بہن سے باتیں کروں گی۔

رام کمار: (گھڑی دیکھ کر) میں نے اس کام کے لیے ایک گھنٹہ رکھا تھا۔ مگر آپ نے نمائش کی تجویز پیش کی ہے تو سوچتا ہوں کہ یہ وقت نمائش دیکھنے میں صرف کروں اور اس وقت آپ سے اجازت لوں۔ (کھڑے ہو کر)۔ چودھری صاحب، اب اجازت دیجیے۔ مجھے اتنا وقت تو نہیں ملے گا کہ آکر تصویروں کے انتخاب میں رائے دوں، لیکن اس کا ضرور خیال رکھیے گا کہ تصویروں کی ترتیب اسٹائل کے مطابق ہو۔ اور میری خاطر پنسل اور چاک میں آپ نے جو کام کیا ہے اسے بھی ضرور رکھیے گا۔

(سب کو سلام کرتا ہے۔ شاما سلام کا جواب نہیں دیتی۔ رام کمار جاتا ہے اور اس کے ساتھ چودھری اسے مکان کے دروازے تک پہنچانے جاتا ہے)

شکنتلا: آؤ شاما۔ اس کامیابی کی خوشی میں چائے پئیں اور مشورہ کریں کہ رام کمار صاحب سے کس طرح مدد لی جائے۔

شاما: چائے ضرور پیو۔ مگر میں نہ رام کمار صاحب کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ نہ ان سے کسی طرح کی مدد لینا۔ یہ سب تم کرنا۔ بدلو!

شکنتلا: کیوں؟ اس لیے کہ وہ تمھیں آرٹسٹ کا موڈل سمجھے؟

(بدلو آتا ہے، اور اس کے پیچھے چودھری۔ بدلو ٹرے اٹھالیتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے)۔

شکنتلا: چودھری بھائی، آپ بڑے ہی بے تکے آدمی ہیں۔ اتنا بھی خیال نہیں رہتا کہ گھر میں جو اجنبی

کر دیجیے۔ (چودھری کپ بورڈ کھولتا ہے اور اس میں سے تصویریں چن چن کر نکالتا ہے۔) آپ اوئل (Oil) ہی میں کام کرتے ہیں یا پنسل، چاک اور واٹر کلر میں بھی مشق کرتے ہیں؟

چودھری: واٹر کلر تو میں نے قریب قریب چھوڑ دیا ہے۔ اس میں وہ شدت، وہ Intensity پیدا نہیں ہوتی جو میں چاہتا ہوں۔ پنسل اور چاک کا ایک اور البم آپ کو دکھاؤں گا، مگر اصل بات یہ ہے کہ جب اوئل کلرز کی رچ نس (Richness) کی عادت ہو جائے تو اور کوئی میڈیم (Medium) جی پر نہیں پڑتا۔

رام کمار: یہ آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ مگر پنسل ڈرائنگ کی سادگی اور صفائی، اس کی Directness اوئل کلرز میں نہیں آتی۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ بیشتر کام اوئلز (Oils) میں کریں تب بھی پنسل اور چاک میں مشق جاری رکھیں۔ وہ آپ کے لیے ایک طرح کی ڈسپلن بھی ہو جائے گی۔ (چودھری نے دس بارہ تصویریں منتخب کر لی ہیں اور دو البم بھی نکال لیے ہیں۔ وہ ایزل پر سے نامکمل تصویر ہٹا کر ایک بنی ہوئی تصویر لگا دیتا ہے۔ رام کمار پیچھے ہٹ کر سٹی کے کونے پر بیٹھ جاتا ہے اور تصویر کو غور سے دیکھتا ہے) خوب، رنگ بھی خوب جاگتے ہوئے ہیں اور کومپوزیشن (Composition) بھی بہت لطیف ہے مگر اس کا اسٹائل مجھے ٹرینزیشنل (Transitional) سا معلوم ہوتا۔ آپ ایک طرز کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف جا رہے ہیں۔ اب ذرا اس کے سال دو سال بعد کی کوئی تصویر دکھایئے گا۔ (چودھری تصویروں میں سے ایک چھانٹ کر ایزل پر رکھتا ہے)۔ دیکھیے میں ٹھیک کہہ رہا تھا نا؟ آپ امپریشنزم (impressionism) کو چھوڑ کر ایک خاص وضع کی ریلزم (Realism) کی طرف آ گئے ہیں۔ (جیب سے سگریٹ کیس نکالتا ہے اور چودھری کو پیش کرتا ہے۔ پھر لائٹر سے دونوں کے سگریٹ جلاتا ہے) اچھا، یہ تو بتایئے، ہمارے یہاں کا امپریشنسٹک (Impressionistic) آرٹ خالی یورپی مصوری کی نقل ہے یا اس میں کچھ جان بھی ہے۔

چودھری: (ایزل پر ایک تصویر رکھتے ہوئے) میرے خیال میں دونوں باتیں ہیں۔ ہر آرٹسٹ ایک دور سے گزرتا ہے جب اسے موجود اور معلوم شکلوں کی پابندی ناگوار ہوتی ہے۔ یورپ میں امپریشنزم (Impressionism) کا دور ریلزم (Realism) کے بعد آیا، ہم ممکن ہے امپریشنزم (Impressionism) سے گزر کر اپنی خاص ریلزم کی طرف جائیں یا کوئی اور طرز اختیار کریں۔ میں دوسروں کے بارے میں کیا کہوں جب خود اپنے بارے میں یقین نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میری طبیعت مجھے کدھر لے جائے گی۔ مگر میں کسی 'ازم' کی، کسی نام اور کسی فلسفے کی پابندی نہیں چاہتا۔

رام کمار: بالکل ٹھیک ہے۔ اور میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آپ میں آزاد رہنے کی صلاحیت ہے۔ میں ابھی پیرس میں تھا اور وہاں موزوں آرٹ کی چند اکزی بشن (Exhibition) دیکھنے گیا۔ مجھے وہاں کوئی ایسی تصویر نظر آتی جیسی کہ آپ نے دکھائی ہے تو میرا جانا وصول ہو جاتا۔

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے اور تھوڑی دیر بعد شکنتلا داخل ہوتی ہے۔ وہ چودھری سے ہاتھ ملاتی ہے اور پھر رام کمار کی طرف بڑھتی ہے۔)

شکنتلا: نمستے، رام کمار صاحب۔ آپ تو بھول گئے ہوں گے، نظر صاحب نے کل پارٹی میں مجھے آپ سے ملایا تھا۔ میرا نام شکنتلا کھنہ ہے۔ نظر صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ ضرورت ہو تو میں آپ کے ساتھ چودھری صاحب کے یہاں آجاؤں، اچھا ہوا اس طرح سے ملاقات ہوگئی۔

رام کمار: جی ہاں، بے شک، نظر صاحب نے آپ سے میرا تعارف کرایا تھا۔ میں بہت معافی چاہتا ہوں، مجھے خود آپ کی خدمت میں آداب عرض کرنا چاہیے تھا۔ مگر چودھری صاحب کی تصویریں دیکھ کر میں ایک اور دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ کچھ ہوش نہیں رہا۔

شکنتلا: خیر وہ کوئی بات نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس طرح بیچ میں کود پڑی اور آپ کی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ (شاما کی طرف دیکھ کر اور اس کے پاس جاتے ہوئے)۔ ارے شاما کیا تم کو سزا دی گئی ہے جو اس طرح الگ کونے میں بیٹھی ہو؟

شاما: سزا اور کیسی سزا۔ مجھے کوئی اس قابل نہیں سمجھتا کہ میری طرف دیکھے یا مجھ سے بات کرے۔

(رام کمار چودھری کی طرف دیکھتا ہے کہ گویا تعارف کرانا اسی کا فرض تھا، اوراب اسے کچھ کہنا چاہیے۔ چودھری کھسیانا ہو کر اپنی تصویریں سمیٹنے لگتا ہے۔)

چودھری: معاف کرو شاما، مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تعارف کرانا ہے۔ میں اس فکر میں تھا کہ ایک مالدار آدمی کا، جو ممکن ہے بدمذاق ہو، مقابلہ کیسے کروں، اور اپنی تصویروں کو اس سے کیسے چھپاؤں۔ رام کمار صاحب کی پہلی ہی بات نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ پھر سمجھو دو ہم مذاق مل گئے، اور دونوں کو دنیا کی خبر نہیں رہی۔

شکنتلا: اچھا اب میں آپ کا تعارف کرادوں۔ یہ رام کمار صاحب ہیں، یہ چودھری صاحب کی بیوی شاما۔

رام کمار: آداب عرض کرتا ہوں۔ امید ہے آپ میری بدتمیزی کو معاف فرمائیں گی۔ آپ نے تو مجھے چائے کی پیالی بھی عنایت فرمائی تھی۔ تب تو مجھے آداب کا خیال آنا چاہیے تھا۔

شکنتلا: خیر، اب اتنا بہت سا الزام اپنے اوپر نہ لیجیے۔ یہ کہہ دیجیے کہ آپ پیرس سے آرہے ہیں، اور وہاں اب نیا فیشن یہ ہے کہ عورتوں کی طرف دیکھتے نہیں ہیں۔

رام کمار: (ہنس کر) جی ہاں، کچھ قصور اس میں پیرس کا بھی ہے۔ میں وہاں ایک دو آرٹسٹوں سے ملنے گیا۔ ہر جگہ آرٹسٹ کے آتیلے (Ateller) میں ایک عورت تھی جس کا مجھ سے تعارف نہیں کرایا گیا۔

(شاما کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا ہے۔ وہ منہ پھیر لیتی ہے شکنتلا آرام کرسی کو پیچھے کی طرف گھسیٹ کر اور اس کا رخ ٹھیک کر کے اس پر بیٹھ جاتی ہے۔)

شکنتلا: اچھا، رام کمار صاحب بتایئے آپ نے چودھری صاحب کا کام کچھ دیکھا؟

رام کمار: ابھی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ چودھری صاحب کا کام دیکھا ہے، مگر جو دو ایک تصویریں دیکھی ہیں وہ بہت پسند آئیں۔

شکنتلا: معلوم نہیں نظر صاحب نے آپ سے کل ذکر کیا تھا یا نہیں، مگر بعض لوگوں کی رائے ہے کہ چودھری صاحب کی تصویروں کی نمائش بمبئی اور دہلی میں کرائی جائے۔

رام کمار: جی ہاں، ضرور کرائیے، آپ جانتی ہیں کہ میں تو کاروباری آدمی ہوں، اپنے دھندوں میں لگا رہتا ہوں۔ دوڑ دھوپ کے کام نہ کرسکوں گا، وقت بھی زیادہ نہ دے سکوں گا۔ مگر مدد کا اور کوئی طریقہ ہو تو حاضر ہوں۔

شکنتلا: ہم کو تو بس آپ کی سرپرستی چاہیے، اور سب کام ہم کرلیں گے۔

رام کمار: (جیب سے کارڈ نکال کر شکنتلا کو دیتا ہے) یہ لیجیے میرا کارڈ۔ اس پر کئی پتے لکھے ہیں۔ آپ جلد جواب چاہتی ہوں تو جو خط آپ لکھیں اس کی ایک نقل ہر پتہ پر بھیج دیجیے گا۔

شکنتلا: بہت بہت شکریہ۔ اچھا اب آپ تصویریں دیکھیے، میں شاما بہن سے باتیں کروں گی۔

رام کمار: (گھڑی دیکھ کر) میں نے اس کام کے لیے ایک گھنٹہ رکھا تھا۔ مگر آپ نے نمائش کی تجویز پیش کی ہے تو سوچتا ہوں کہ یہ وقت نمائش دیکھنے میں صرف کروں اور اس وقت آپ سے اجازت لوں۔ (کھڑے ہوکر)۔ چودھری صاحب، اب اجازت دیجیے۔ مجھے اتنا وقت تو نہیں ملے گا کہ آکر تصویروں کے انتخاب میں رائے دوں، لیکن اس کا ضرور خیال رکھیے گا کہ تصویروں کی ترتیب اسٹائل کے مطابق ہو۔ اور میری خاطر پنسل اور چاک میں آپ نے جو کام کیا ہے اسے بھی ضرور رکھیے گا۔

(سب کو سلام کرتا ہے۔ شاما سلام کا جواب نہیں دیتی۔ رام کمار جاتا ہے اور اس کے ساتھ چودھری اسے مکان کے دروازے تک پہنچانے جاتا ہے)

شکنتلا: آؤ شاما۔ اس کامیابی کی خوشی میں چائے پییں اور مشورہ کریں کہ رام کمار صاحب سے کس طرح مدد لی جائے۔

شاما: چائے ضرور پیو۔ مگر میں نہ رام کمار صاحب کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ نہ ان سے کسی طرح کی مدد لینا۔ یہ سب تم کرنا۔ بدلو!

شکنتلا: کیوں؟ اس لیے کہ وہ تمھیں آرٹسٹ کا موڈل سمجھے؟

(بدلو آتا ہے، اور اس کے پیچھے چودھری۔ بدلو ٹرے اٹھالیتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے)۔

شکنتلا: چودھری بھائی، آپ بڑے ہی بے تکے آدمی ہیں۔ اتنا بھی خیال نہیں رہتا کہ گھر میں جو اجنبی

آ ئے اس کا بیوی سے تعارف کرادیں۔

چودھری: بھئی کیا کروں۔بس چوک ہو ہی گئی۔

شکنتلا: چوک ووک نہیں ہوئی۔اصل بات یہ ہے کہ آپ کے دل میں عورتوں کی قدر رہی نہیں۔آپ نے سارا کیا کرایا کام بگاڑ دیا۔نظر صاحب نے اور میں نے ایک مال دار آدمی کو گھیرا تھا کہ اس سے آپ کے کام کی نمائش میں مدد لیں،اور آپ نے لے کر سب گوڑ دیا۔اب شاما کہتی ہیں کہ وہ رام کمار صاحب کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔بتایئے اب نمائش کیسے ہوگی؟

چودھری: (جیسے خیال کہیں اور ہے) میں کیا بتاؤں؟ نمائش نہیں ہوسکتی ہے تو نہیں ہوگی۔

شاما: نہیں،نمائش کیوں نہ ہوگی،تم لوگ اس کا انتظام کر لینا۔میں ویسے بھی ان کاموں کے لیے موزوں نہیں ہوں۔

شکنتلا: جی ہاں۔ہم سب کام آپ کی خوشی کے لیے کریں اور آپ ان میں شریک نہ ہوں۔ ہمیں ایسی نمائش سے کیا حاصل ہوگا،جس سے آپ کو دلچسپی نہ ہو؟

(شاما کوئی جواب نہیں دیتی،منہ پھیر لیتی ہے)

چودھری: مجھے جو کچھ چاہیے تھا وہ مل گیا۔اب نمائش ہو یا نہ ہو،مجھے پروا نہیں۔

شاما: تم کو پروا کس چیز کی ہے۔

چودھری: (شاما کی طرف غور سے دیکھ کر) اچھا،میرا امتحان شروع ہوگیا۔

شکنتلا: اچھا بھائی،معلوم ہوگیا کہ تم دونوں کو ایک دوسرے سے اتنی محبت ہے کہ بات بات پر بگڑ جاتے ہو۔اب غصہ تھوک دو اور کام کی باتیں کرو۔

(چودھری اپنی تصویروں کو رکھنے اٹھانے لگتا ہے۔شاما کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے،پھر رونے لگتی ہے۔شکنتلا آ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیتی ہے اور اس کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

ارے شاما تم کو کیا ہوگیا ہے۔ایک آرٹسٹ کے کیریر (Career) کی ذمہ داری لے چکی ہو اور اتنی سی بات پر رونے لگیں!

(شکنتلا رومال نکال کر شاما کے آنسو پونچھتی ہے۔ شاما منہ پھیرتی ہے۔
اور اس طرح سر اٹھاتی ہے کہ گویا اس نے اپنی طبیعت کو قابو میں کرلیا ہے۔
بدلوٹرے پر چائے کا سامان اندر لاتا ہے اور میز پر رکھ کر چلا جاتا ہے)

شاما: معاف کرنا، شکنتلا، اصل میں تھک بہت گئی ہوں۔

شکنتلا: ہاں یہی بات ہوگی۔ تم تو بہت مضبوط طبیعت کی آدمی ہو۔ اچھا، اب ایک پیالی گرم چائے پی لو اور جا کر آرام کرلو۔ (شکنتلا تین پیالی چائے بناتی ہے) چودھری بھائی، آیئے چائے پی لیجیے۔ شاید آپ کی خطا معاف کردی جائے۔ کھڑے کھڑے نہ پینا چاہتے ہوں تو کرسی اٹھا کر لے آیئے۔ ہم لوگوں سے ذرا دور ہی بیٹھیں تو اچھا ہے۔

(چودھری دوسری آرام کرسی اٹھا کر لے آتا ہے۔ شکنتلا اسے چائے دیتی ہے۔ وہ ایک دو گھونٹ چائے پی چکتا ہے تو شکنتلا اپنے بیگ سے سگریٹ کیس نکالتی ہے، چودھری کو سگریٹ پیش کرتی ہے، اور خود بھی ایک نکال لیتی ہے۔ اس کے بعد لائٹر سے دونوں سگریٹ جلاتی ہے۔ خاموشی)

شاما: (جلدی جلدی چائے پی کر) اچھا، اب میں تھوڑی دیر کے لیے جاتی ہوں۔ تم دونوں نمائش کے بارے میں مشورہ کرلو۔ پھر مجھے بتا دینا کہ کیا طے ہوا ہے۔

(شاما اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ خاموشی)

چودھری: لو تمھارا ابھی امتحان شروع ہوگیا ہے۔

شکنتلا: (تھوڑی دیر تک چودھری کو غور سے دیکھنے کے بعد) آپ ایسی باتیں کب سے سمجھنے لگے؟

چودھری: میں بدھو کبھی نہیں تھا۔

شکنتلا: آپ اس سے بھی بدتر ہیں، آرٹسٹ ہیں...... مجھے پہلے خیال تھا کہ آپ کو سچوایشنز (Situations) دیکھنے میں مزہ آتا ہے، اب معلوم ہوا کہ آپ کو انھیں پیدا کرنے کا شوق بھی ہے۔ اب دنیا میں عورتوں کے لیے کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔ (چودھری زور سے ہنستا ہے) اچھا، اب آیئے نمائش کے بارے میں طے کرلیں۔

چودھری: اس سے شاما دھوکا نہیں کھائیں گی۔

شکنتلا: (اپنا بیگ اٹھا کر) اچھا، تو پھر میں جاتی ہوں۔ شاما سے میری طرف سے معذرت کر دیجیے گا۔

چودھری: نہیں، بیٹھو۔ نمائش کے بارے میں ہم طے یہ کرتے ہیں کہ تم نظر صاحب کو لے کر تین چار ہال دیکھو گی جہاں نمائش کی جا سکتی ہے، یہ معلوم کرو گی کہ وہ کب خالی ہوں گے، ان کا کرایہ کیا ہوگا اور تصویریں لگانے کے لیے وہ کتنا وقت اور سامان دے سکیں گے۔ اس کے بعد تم رام کمار صاحب کو خط لکھو گی، ان سے درخواست کرو گی کہ نمائش کا افتتاح کریں، اور ایک چائے کی پارٹی میں جو افتتاح کے بعد دی جائے گی شریک ہوں۔ ان سے یہ بھی دریافت کرو گی کہ وہ اس موقع پر کن مہمانوں کو بلانا چاہیں گے۔ ان کا جواب آنے پر باقی باتیں طے ہوں گی...... اچھا اب جو خبریں لائی ہو وہ سناؤ۔

شکنتلا: میں کوئی خبریں نہیں لائی ہوں۔

چودھری: ہوں، اور تمھارا موٹر بھی بغیر پیٹرول کے اتنی دور آ گیا۔

شکنتلا: بھئی آپ، آخر عورتوں کو کیا سمجھتے ہیں؟

چودھری: میں جس دن عورت کی فطرت کو سمجھ گیا اس دن خدائی کا دعویٰ کر دوں گا۔

شکنتلا: (سوچ کر) ہاں آپ عورت کی فطرت کو سمجھتے ہوتے تو نجمی کے رونے دھونے سے اتنا اثر نہ لیتے۔

چودھری: (لمبی سانس لے کر) معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ عورت کے آنسوؤں سے کبھی اور کہیں پناہ نہیں ملتی۔

شکنتلا: آپ تھوڑے دنوں کے لیے یورپ چلے جائیں۔ سنا ہے وہاں عورتیں روتی نہیں ہیں۔

چودھری: تو مردوں کے منہ نوچتی ہوں گی۔

شکنتلا: توبہ!...... خیر، چھوڑیے ان باتوں کو۔ میں نے سنا ہے کہ نجمی یہاں آنے والی ہیں۔

چودھری: کیا مجھے زبردستی اٹھا لے جائیں گی؟

شکنتلا: وہ زبردستی کر سکتی تو یہ صورت کیوں پیدا ہوتی۔ آئے گی تو اپنی عادت کے مطابق روئے دھوئے گی۔

چودھری: معلوم ہو کہ کب آئے گی تو تم بھی چلی آنا۔

شکنتلا: مجھے یہ کیسے معلوم ہو سکے گا کہ کب آ رہی ہے...... اب آپ کی شادی کو سال بھر کے قریب ہو گیا ہے۔ وہ اپنا غم آنسوؤں میں بہا چکی تھی، مگر اب کچھ لوگوں نے اسے بھڑکانا شروع کر دیا ہے۔ ایک مجسٹریٹ آ گئے ہیں جو آپ اور شاما جیسے لوگوں کو ستانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، مینا نے شاید یہ خبر اُدھر پہنچائی ہے کہ شاما کا جادو اب ٹوٹ گیا ہے، آپ کی اور ان کی لڑائیاں شروع ہو گئی ہیں۔

چودھری: (شکنتلا کی طرف دیر تک دیکھ کر) یہ سب کچھ جو ہوا ہے اس کی ذمہ دار تم ہو۔

شکنتلا: اس لیے کہ میں دور رہنا چاہتی ہوں۔

چودھری: ہاں، اپنے آپ کو قریب بتا کر دور رہنا...... دور ہو کر اس طرح متوجہ ہونا کہ معلوم ہو دوست نے دوست کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا ہے...... (چودھری کسی سوچ میں کھڑا ہو جاتا ہے اور ٹہلنے لگتا ہے۔ اس میز کے پاس جا کر جس پر برش اور رنگ رکھے ہوئے ہیں ان چیزوں کو غور سے دیکھتا ہے، پھر دونوں ہاتھوں میں جتنا سامان آ سکتا ہے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیتا ہے) یہ سب فضول ہے...... دھوکا ہے!

شکنتلا: (طنز کے ساتھ) اچھا!

(برش اور رنگوں کے ٹیوبوں کے گرنے کی آواز سن کر شاما آتی ہے اور اندر دروازے کے پاس چپکے سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اسے دیکھ لیتی ہے۔ چودھری کی پیٹھ دروازے کی طرف ہے، وہ اسے نہیں دیکھتا)

چودھری: شکل، رنگ، اوپری باتیں، اس کے سوا مصوری میں ہے کیا!

شکنتلا: آؤ شاما، مصوری کی جان خطرے میں ہے، اسے بچاؤ۔

شاما: (آگے آتے ہوئے) میں کسی کو کیا بچاؤں گی۔ میں خود خطرے میں ہوں۔

(سٹی کے پاس اس آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہے جس کا رخ تماشائیوں کی طرف ہے)

چودھری: (اپنے خیال میں) انسان کی شخصیت مصوری کے قابو میں نہیں آتی، اور وہی اصل چیز ہے۔

اس میں صرف احساسات بیان ہو سکتے ہیں، تعلقات بیان نہیں ہو سکتے۔ یہ انسان کو اکیلا کر دیتی ہے...... انسان، جسے ویسے بھی کوئی نہیں ملتا جس کا ہاتھ وہ پکڑ سکے۔

(چودھری اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا بیچ اسٹیج پر کھڑا ہو جاتا ہے)

شکنتلا: اچھا، بس اب چھوڑیے۔

شاما: کیوں، انھیں پوری بات کیوں نہیں کہنے دیتی ہو؟ مجھ سے کون سی بات چھپی ہے جسے وہ بیان کر دیں گے؟

(دروازے کا پردہ آہستہ سے ہٹتا ہے اور ننھی اندر آ کر دیوار سے لگ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ شکنتلا کے سوا اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بے بس ہو کر سٹی کے کونے پر بیٹھ جاتی ہے اور اپنا منہ ہاتھوں سے بند کر لیتی ہے۔ یکبارگی اس کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ چودھری اور شاما دونوں مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر منہ پھیر لیتے ہیں۔ چودھری اب بھی اپنے خیال میں ڈوبا ہے۔ شاما کے چہرے سے غصہ ظاہر ہوتا ہے۔ شکنتلا چپکے سے اٹھ کر ننھی کے پاس جاتی ہے۔ سٹی پر ننھی کے دائیں طرف بیٹھ جاتی ہے اور اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیتی ہے۔ وہ چپکے چپکے اس سے کچھ کہتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسے سمجھا رہی ہے)

شاما: کمینی، بے شرم!

(شاما چاہتی ہے کہ ننھی کی طرف نہ دیکھے، مگر رہا نہیں جاتا، بار بار کنکھیوں سے دیکھتی رہتی ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ چودھری پر جو کیفیت طاری تھی وہ گزر جاتی ہے۔ وہ پریشانی میں ٹہلنے لگتا ہے اور بار بار ننھی اور شکنتلا کی طرف دیکھتا ہے۔ شاید بغیر ارادے کے ٹہلتا ٹہلتا ننھی اور شکنتلا کی طرف دیکھتا ہے۔ شاید بغیر ارادے کے ٹہلتا ٹہلتا ننھی اور شکنتلا کے قریب پہنچ جاتا ہے اور بے بسی کے عالم میں انھیں دیکھتا رہتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ننھی اسے

پاس کھڑا پاکر اپنے آپ کو شکنتلا سے چھڑا لیتی ہے اور لپک کر اس کے قدموں پر گر پڑتی ہے۔ چودھری پیچھے کھسک جاتا ہے اور ننھی زمین پر پڑی رہتی ہے۔ شکنتلا لمبی سانس لے کر اٹھتی ہے اور ننھی کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھاتی ہے)

شکنتلا: اٹھو، ننھی۔ یہ کون سا طریقہ ہے۔

(ننھی کھڑی ہو کر شکنتلا سے لپٹ جاتی ہے۔ شکنتلا اسے آہستہ آہستہ ٹی کی طرف لے جاتی ہے۔ دونوں جس طرح پہلے بیٹھی تھیں ویسے ہی بیٹھ جاتی ہیں۔ چودھری انھیں غور سے دیکھتا ہے، پھر چپکے سے کپ بورڈ کھولتا ہے، اس میں سے ایک کینوس نکال کر بورڈ پر لگاتا ہے، وہیں پر جو سامان پڑا ہے اس میں سے کچھ پنسلیں اٹھاتا ہے اور شکنتلا اور ننھی کا اسکیچ بنانا شروع کر دیتا ہے۔ شاما کا غصہ رفتہ رفتہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب اسے اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہتا۔ وہ جیسے چوٹ کھا کر اٹھتی ہے اور شکنتلا اور ننھی کی طرف بڑھتی ہے۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے وہ کھڑی نہ رہ سکے گی۔ میز کے پاس پہنچ کر وہ رک جاتی ہے۔ اس کی سانس اس قدر تیز آ رہی ہے کہ منہ سے بات نہیں نکلتی۔ چودھری اسے دیکھ کر اپنے ایزل کا رخ ذرا سا بدل لیتا ہے۔ ظاہر ہے اس لیے کہ شاما کو بھی گروپ میں شامل کر لے اور بہت تیزی کے ساتھ اسکیچ کرنے لگتا ہے)

شاما: کمبخت، یہاں بھی رونے کے لیے پہنچ گئی۔ اپنی زندگی برباد کر چکی ہے، اب میری بھی کرنا چاہتی ہے۔ دور ہو یہاں سے!

شکنتلا: شاما، تم جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں ننھی کو لے کر چلی جاؤں گی۔

شاما: ہاں، تم تو سب کچھ کر سکتی ہو۔ تم بڑے آدمیوں سے میرا تعارف کرا سکتی ہو، تم نمائش کا انتظام کر سکتی ہو، تم آرٹ اور فلسفے پر بحث کر سکتی ہو، تم کھسیانی روتی عورتوں کو دلاسا دے سکتی ہو، سب کچھ جو میں نہیں کر سکتی تم کر سکتی ہو۔ مگر میں تم دونوں کو بتائے دیتی ہوں۔ چودھری کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا!

(شاما یہ کہہ کر لمبے لمبے قدم رکھتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے چودھری اس کی طرف کسی قدر مایوسی کے انداز میں دیکھتا ہے، جب وہ چلی جاتی ہے تو اپنی تصویر پر نظر ڈالتا ہے)

چودھری: (سر ہلا کر) ذرا دیر اور کھڑی رہتی تو میرا اسکیچ مکمل ہو جاتا! خیر۔

(اس بات کا نتھی پر عجیب اثر ہوتا ہے۔ وہ ٹھٹھا مار کر ہنستی ہے اور ہنستی رہتی ہے۔ شکنتلا موقع سے فائدہ اٹھا کر کھڑی ہو جاتی ہے، نتھی کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھاتی ہے اور باہر لے جاتی ہے۔ نتھی کے ہنسنے کی آواز آتی رہتی ہے۔ چودھری حیرت سے دروازے کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

(وہی کمرہ جو پہلے ایکٹ میں تھا۔ فرنیچر سب اسی ترتیب سے رکھا ہے۔ صرف گلدان میں پھول نہیں ہیں۔ سامنے ایک لمبی بالٹی، جس کی نگر پر ایک نچوڑا ہوا جھاڑن رکھا ہے۔ اسی کے پاس جھاڑو ہے۔

شاما ایک جھاڑن سے کپ بورڈ ایزل، آرام کرسیوں وغیرہ کو جلدی جلدی رگڑ کر صاف کرتی ہے۔ اس کے سر میں رومال بندھا ہوا ہے۔ چہرے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے سر میں درد ہوگا۔ صفائی کرتے کرتے وہ بار بار ٹھہر جاتی ہے اور سر دباتی ہے۔ صفائی کرنے کے بعد بالٹی، جھاڑو اور جھاڑن جا کر رکھ آتی ہے، پھر آ کر کمرے میں کھڑی ہو جاتی ہے اور اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ پھر اپنے کپڑوں کو دیکھتی ہے، ساری کو، جو موٹے کپڑے کی اور بدرنگ ہے، ذرا ٹھیک کرتی ہے، پھر آگے کی ٹی سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں، چہرہ سے تکلیف ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اس تکلیف کے آثار میں کچھ غصہ اور ضد بھی شامل ہے۔

دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ شاما کانکھ کر اٹھتی ہے اور دروازہ کھولنے کے لیے
جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد شکنتلا اور اس کے پیچھے شاما اندر آتی ہے)

شاما: تم بیٹھو، شکنتلا، میں ذرا چائے کے برتن لگا دوں۔

شکنتلا: کیوں؟ بدلو کیا ہوا؟

شاما: بدلو کو میں نے الگ کر دیا ہے۔

شکنتلا: پھر گھر کا کام سب کون کرتا ہے؟

شاما: کون کرے؟ میں خود کرتی ہوں۔

شکنتلا: (شاما کو غور سے دیکھ کر) اچھا اسی وجہ سے اب کپڑے بدلنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔

شاما: (روہانسی ہو کر) اب میرا کام یہی ہوگا اور لباس یہی ہوگا۔

(شکنتلا کوئی جواب نہیں دیتی، آہستہ آہستہ آگے کی طرف آتی ہے بیگ
سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ جلاتی ہے اور کچھ دیر سوچ میں کھڑی
رہتی ہے)

شکنتلا: (اپنا بیگ میز پر رکھ کر) اچھا چلو، برتن لگانے میں تمھاری مدد کر دوں۔

شاما: نہیں۔ کچھ ایسا بڑا کام نہیں ہے۔

(دونوں باہر جاتی ہیں، اور تھوڑی دیر میں شکنتلا ٹرے پر چھ سات پیالیاں،
اور شاما دوسری ٹرے پر پلیٹیں اور کچھ بازار سے خریدا ہوا کھانے کا سامان
لے کر آتی ہے۔ سامان دائیں طرف کی میز پر سجا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد
دونوں بیچ اسٹیج پر آجاتی ہیں)

شکنتلا: (کسی قدر سخت لہجے میں) اچھا، شاما، اب تم جا کر کپڑے بدل لو۔

شاما: میرے پاس اب یہی کپڑے ہیں۔

شکنتلا: یہ کس کس کو سمجھاؤ گی؟

شاما: مجھے دوسروں سے کوئی مطلب نہیں۔ اپنے دل کی بات کرتی ہوں۔

شکنتلا: ضرور کرو۔ مگر یہ کیوں بھول جاؤ کہ دل اور دماغ دوسروں کے بھی ہے؟ (شاما کوئی جواب نہیں

دیتی) تمھیں اس کا خیال نہیں ہے کہ تمھیں اس حالت میں دیکھ کر لوگ سمجھیں گے کہ اپنے آپ کو تماشا بنا رہی ہو۔

شاما: دل کی بات کرنے سے آدمی تماشا بن جاتا ہو تو میں کیا کروں؟

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے شکنتلا تھوڑی دیر تک شاما کو غور سے دیکھنے کے بعد آہستہ آہستہ دروازہ کھولنے کے لیے باہر جاتی ہے۔ شاما خاموش کھڑی رہتی ہے، معلوم ہوتا ہے اس میں کوئی حس باقی نہیں۔ مینا اور اس کے پیچھے شکنتلا اندر آتی ہے۔ مینا، شاما کی حالت دیکھ کر پہلے ٹھٹھک کر کھڑی ہو جاتی ہے، پھر دوڑ کر اس کے پاس جاتی ہے)

مینا: ارے شاما بہن، کیا ہوا؟ آپ اس طرح کیوں کھڑی ہیں، اور ان کپڑوں میں؟

شاما: اپنی اصل حقیقت ظاہر کر رہی ہوں۔

مینا: (روہانسی ہو کر شاما سے لپٹ جاتی ہے) نہیں شاما بہن، ایسا نہیں ہو سکتا۔ چلیے آپ کپڑے بدلیے۔ میں آپ کی مدد کر دوں گی۔

شکنتلا: اور دیکھو، گلدان بھی خالی ہے۔ مینا تم شاما کے کپڑے بدلواؤ۔ میں جا کر کہیں سے پھول لے آؤں گی۔

مینا: چلیے، شاما بہن کپڑے بدلیے نہیں تو میں روتے روتے آپ کے ناک میں دم کر دوں گی۔

(مینا، شاما کو گھسیٹ کر باہر لے جاتی ہے۔ شکنتلا گلدان کو ایک نظر دیکھ کر باہر چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ غالباً مینا نے دروازہ کھول دیا ہوگا۔ نظر، اور اس کے پیچھے چودھری داخل ہوتا ہے)

نظر: (پکار کر) شاما بہن، آئیے سنیے ہم کیا کر کے آئے ہیں! اور انعام میں چائے پلانے کا انتظام کیجیے۔

(نظر آگے آ کر سٹی پر بیٹھ جاتا ہے۔ چودھری ایک آرام کرسی گھسیٹ کر لے آتا ہے۔ مینا دروازے سے جھانک کر دیکھتی ہے)

مینا: اوہو، نظر صاحب، آداب! (دونوں کی شکلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا کام کر کے آئے

ہیں۔) اچھا، اب ذراستا لیجیے۔ شاما بہن ابھی آتی ہیں۔ چائے بھی آتی ہے۔
چودھری بھائی، آپ کو سلام کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مگر بتاؤں گی نہیں کہ کیوں؟
(چودھری اس کی طرف دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کہتا۔ مینا غائب ہو جاتی ہے)

نظر: چودھری صاحب، معلوم نہیں آپ پلین بنا کر کام کرنے کے قائل ہیں یا نہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ بمبئی ہال کا ایک نقشہ بنا لینا چاہیے۔ اور تصویریں چن کر طے کر لینا چاہیے کہ کون سی کہاں لگے گی۔ ورنہ ہال کو سجانے میں بہت دیر لگ جائے گی۔

چودھری: (کچھ اور سوچتے ہوئے) جی ہاں، مگر مجھ سے پلین نہ بنایا جائے گا۔ میری قسمت میں سوچ سمجھ کر کام کرنا لکھا ہی نہیں ہے۔

(دروازے کی گھنٹی پھر بجتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مینا گھبرائی ہوئی جلدی جلدی اندر آتی ہے)

مینا: (پریشانی کے لہجے میں، مگر اپنی پریشانی اور موقع سے کچھ مزہ لیتے ہوئے) ارے چودھری بھائی، غضب ہو گیا، وکیل صاحب آئے ہیں۔ دروازے کی گھنٹی بجی تو میں دوڑی ہوئی گئی، مگر سوچ رہی تھی کہ اب کون ہوگا۔ میں نے دروازہ کھولے بغیر چپکے سے پوچھا کہ کون صاحب ہیں۔ تو انھوں نے اپنا نام بتایا، اور اسی طرح کھنکھارے جیسے اپنی الٹی سیدھی قانون کی باتیں کرتے ہوئے کنکھارتے ہیں۔ اب بتائیے کیا کروں؟

نظر: کرنا کیا ہے۔ انھیں بلا لیجیے۔ چائے تو بن ہی رہی ہے۔

مینا: جی ہاں، چودھری بھائی، میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ آپ ملنے سے انکار کردیں گے تو وہ اور ضد یا جائیں گے۔

چودھری: میں ملنے سے کیوں انکار کروں گا۔ شوق سے تشریف لائیں۔

مینا: (کچھ اور مزہ لیتے ہوئے) اچھا، تو میں ان کو اندر بلاتی ہوں۔ اور شاما بہن سے کیا کہوں؟

چودھری: شاما ان سے مل چکی ہیں۔ اب کیوں چھپیں گی۔ ویسے جو ان کا جی چاہے۔

(مینا چلی جاتی ہے۔ چودھری اٹھ کر ایزل کی طرف جاتا ہے، اس پر جو تصویر رکھی ہیں انھیں اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہے۔ وکیل، ننھی کا چچا، اندر آتا ہے،

اور کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہے)

چودھری: (وکیل کی طرف دیکھے بغیر) آیئے، چچا، تشریف رکھیے...... نظر صاحب کو تو آپ جانتے ہوں گے۔

وکیل: ہاں، نام تو سنا ہے۔

نظر: (کھڑے ہو کر سلام کرتے ہوئے) میں بھی جناب کا اکثر ذکر سن چکا ہوں۔ آیئے، تشریف لایئے۔

(وکیل، نظر کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ چودھری اپنی تصویریں چھانٹنے میں لگا رہتا ہے)

نظر: آپ کو سن کر خوشی ہوگی کہ چودھری صاحب کی تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے۔ ہم ابھی وہ ہال دیکھ کر آ رہے ہیں جس میں نمائش ہوگی۔

وکیل: جی، مجھے یہ سن کر بالکل خوشی نہیں ہوگی کہ چودھری صاحب کی تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے۔ مجھے اس سے بھی کوئی خوشی نہیں ہوتی کہ وہ تصویریں بناتے ہیں۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ دوسروں کی زندگی بگاڑتے ہیں۔

(چودھری یہ سن کر زور سے ہنستا ہے)

چودھری: واہ چچا، کیا جواب دیا ہے۔ نظر صاحب، اب آپ چپ ہو جایئے۔

وکیل: نظر صاحب چپ رہ سکتے ہیں، مگر تم کو جواب دینا ہوگا۔

چودھری: (اب بھی اپنی تصویروں میں مصروف) کاہے کا جواب چچا؟

وکیل: یہ بھی مجھ سے پوچھتے ہو؟

چودھری: کیسے نہ پوچھوں۔ جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو آپ نے میرے اسکیچ دیکھے اور پسند کیے، پھر میری درخواست پر آپ نے آرٹ اسکول میں میرا داخلہ کرایا۔ جب میں وہاں سے نکلا تو آپ چاہتے تھے کہیں نوکری کرلوں، میں نے کہا کہ مجھے فاقے کرنا زیادہ پسند ہوگا۔ آپ خفا ہوئے اور خفا ہوتے رہے۔ مگر پھر اپنی بھتیجی ننھی سے میری شادی کرا دی۔ میں جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ اب میں جواب کس بات کا دوں؟

وکیل: ایک جواب تم کو اس کا دینا ہے کہ تم نے احسان فراموشی کی......

چودھری: میں آپ کا کوئی احسان نہیں بھولا ہوں۔ مجھے آپ کی ایک ایک عنایت یاد ہے۔

وکیل: دوسرا جواب تم کو دینا ہے عہد شکنی کا، بے وفائی کا، ایک بے قصور لڑکی کی زندگی برباد کرنے کا۔

چودھری: ایسے الزام تو اس وجہ سے لگائے جاتے ہیں کہ ان کا جواب نہ دیا جا سکے۔ میں ان کا جواب نہیں دے سکتا۔

وکیل: لیکن اگر میں ثابت کر دوں کہ الزام صحیح ہیں اور تم مان لو کہ تم نے قصور کیا ہے تو پھر تم کو اس کی تلافی کرنا چاہیے

(شاما اور اس کے پیچھے مینا داخل ہوتی ہیں۔ شاما کے کپڑے تو اب ٹھیک ہیں مگر غصہ کچھ زیادہ ہے)

شاما: کاہے کی تلافی کرنا۔

وکیل: انھوں نے مجھے اور نتھی کو جو دھوکا دیا ہے اور دکھ پہنچایا ہے، اس کی۔

چودھری: چچا یہ کیا؟ آپ وکیل ہوتے ہوئے عورتوں سے بحث کرتے ہیں، اور پھر بحث میں قانون اور اخلاق کو ملا رہے ہیں۔ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے، شاما پر نہیں ہے۔

وکیل: میں تم ہی سے تو بات کر رہا تھا۔

چودھری: اچھا آپ مجھ سے بات کر رہے تھے۔ تو قانون کی بات یہ ہے کہ میرا دماغ خراب ہے۔ میں اپنے فعل کا ذمہ دار نہیں۔ میں یہ کسی عدالت میں بیسیوں مثالیں اور شہادتیں دے کر ثابت کر سکتا ہوں۔ اخلاق کی بات یہ ہے کہ میں ہمیشہ سے منچلا ہوں، کبھی قابل اعتبار نہیں تھا، برابر جھوٹ بولتا رہا ہوں، دھوکے دیتا رہا ہوں۔ اس کی بھی جتنی شہادتیں کہیے پیش کر دوں۔

شاما: یہ سب تم میرے سامنے کہہ رہے ہو؟

چودھری: اچھا! میں تو تمھیں اپنے تمام جرموں کو ثابت کرنے کے لیے گواہی میں پیش کرنے والا تھا۔

نظر: جی ہاں، وکیل صاحب۔ چودھری صاحب نے الفاظ ذرا سخت استعمال کیے ہیں، لیکن جو باتیں انھوں نے اپنے بارے میں کہی ہیں وہ سب ٹھیک ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیں ان سے بڑی

محبت ہے، ان کی بدولت انسانی طبیعت کا روز کوئی نیا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے، کبھی ان کا اپنا، کبھی دوسروں کا۔

شاما: نظر صاحب، آپ کب سے اس طرح کی باتیں کرنے لگے۔

وکیل: یہ باتیں صرف مجھے الو بنانے کے لیے کی جا رہی ہیں۔

شاما: جی نہیں، آپ کا معاملہ پرانا ہے اور طے بھی ہو گیا۔ یہ دونوں میرا منہ چڑھا رہے ہیں۔

چودھری: (ہنس کر) چچا، بڑے مزے کی بات، ہو اگر آپ دونوں میری مخالفت میں ایسا کریں۔

شاما: میں نے تم سے زیادہ سنگ دل اور بے حیا آدمی نہیں دیکھا ہے!

چودھری: ورنہ اسی سے شادی کر لیتیں۔

(شاما طیش میں آکر کمرے سے باہر جانا چاہتی ہے۔ مگر دروازے کے پاس کچھ سوچ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ شاما زور سے روتی ہے۔ پھر یکبارگی چپ ہو جاتی ہے۔

چودھری اب تک اپنی تصویروں کو ترتیب دے رہا تھا۔ اب وہ نظر اور وکیل کی طرف آہستہ آہستہ آتا ہے۔ دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ مینا دروازہ کھولنے جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں شکنتلا گلدستے لیے اندر آتی ہے اور وکیل کو دیکھ کر سلام کرتی ہے۔ مینا اس کے پیچھے اندر آتی ہے۔)

نظر: آیئے شکنتلا بہن، بڑا اچھا ہوا آپ آ گئیں۔

شکنتلا: آخر آج ہو کیا گیا ہے سب کو؟ (گلدان میں پھول سجاتے ہوئے) وکیل صاحب، آپ تو لوگوں کو بہت سمجھاتے رہتے ہیں، آپ ہی کچھ کیجیے۔

چودھری: چچا جب سمجھاتے سمجھاتے تھک جاتے ہیں تو قانون کی بات کرنے لگتے ہیں۔

شکنتلا: ارے نہیں، وکیل صاحب یہاں قانون کی کون سی بات کرنے آئیں گے؟

وکیل: ہاں، میں آیا تو اس غرض سے تھا کہ چودھری سے کہوں کہ ننھی کو اس کا حق دیں۔

شکنتلا: چھوڑیئے بھی ایسی باتیں، آیئے چائے پیجیے۔ میں ننھی کو سمجھا دوں گی۔ ایک دفعہ بات ہو چکی ہے، اور میں نے اسے قریب قریب راضی کر لیا ہے۔

(شکنتلا چائے کی میز کے پاس جاتی ہے، چائے دانوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھتی ہے کہ چائے کافی گرم ہے یا نہیں، پھر دونوں چائے دان اٹھاتی ہے اور دروازے کی طرف جاتی ہے)

وکیل: کس بات پر راضی کر لیا؟

شکنتلا: اس پر کہ خوش رہے۔ (دروازے کے باہر چلی جاتی ہے)

شاما: وکیل صاحب، آپ چاہے اپنی بحث سے چودھری کو قائل کر دیں، مگر ان طرفداروں کو نہ کر سکیں گے۔

وکیل: بھئی چودھری، میں اس خیال سے آیا تھا کہ تم سے الگ دو چار منٹ بات کر لوں اور اگر ہو سکے تو ایک بگڑی زندگی کو بنا دوں، مگر یہاں تو ٹھیک سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا ہے۔

شاما: اور ایک کی جگہ کئی بگڑی زندگیاں نظر آ رہی ہیں۔

وکیل: اچھا مجھے اب اجازت دو۔

نظر: نہیں وکیل صاحب، اس طرح سے نہ جائیے۔ چائے پی لیجیے۔ اور تھوڑی دیر کے لیے کسی اور سبجیکٹ پر بات کر لیں تو اچھا ہے۔ آپ کو چودھری صاحب کے کیریر (Career) سے دلچسپی رہی ہے۔ ہم ان کے کلام کی نمائش کرا رہے ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ مشورہ دیجیے۔

چودھری: جی ہاں چچا، مجھے صحیح مشورہ دینے سے آپ کا بھی فائدہ ہو سکتا ہے۔

(شکنتلا دونوں چائے دان لے کر اندر آتی ہے، اور انھیں میز پر رکھ دیتی ہے)

شکنتلا: آؤ شاما، چائے بناؤ۔ میں تمھارے گھر کا کام کب تک کروں۔ مینا، تم بھی بے کار بیٹھی ہو۔

مینا: آیئے شاما بہن، سب کو چائے پلائیں۔

(شاما چائے بناتی ہے اور شکنتلا اور مینا سب کو چائے کی پیالیاں اور پلیٹیں اور کھانے کی چیزیں دیتی ہیں)

وکیل: (چائے پیتے ہوئے) اچھا بھئی چودھری، بتاؤ پھر تم سے کب باتیں ہو سکتی ہیں۔ تم میرے

دفتر میں آ جاؤ گے۔

شاما: آپ کی باتیں جب بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں، میرا موجود رہنا ضروری ہے۔

وکیل: مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ میں ایک پبلک میٹنگ میں بھی کہہ سکتا ہوں۔

مینا: ارے وکیل صاحب، جیسے وہ نئے خبطی مجسٹریٹ کرتے ہیں؟

چودھری: تو پھر اچھا ہے، ایک پبلک میٹنگ ہی کر لیجیے...... آپ سمجھتے ہوں کہ کورم پورا ہے تو اسی وقت میٹنگ ہو سکتی ہے۔

شکنتلا: مگر چودھری بھائی، یاد رکھیے کہ آپ کو رام کمار صاحب سے ملنا ہے۔

شاما: انھیں رام کمار صاحب سے جو یہاں تشریف لائے تھے؟ جنھوں نے میرے گھر میں مجھے ذلیل کیا تھا؟ (چودھری سے) تم ان کے پاس جاؤ گے تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی اور تمھارے سامنے ان کے جوتی پھینک کر ماروں گی۔

چودھری: ان سے ملنے کی مجھے کوئی تمنا نہیں ہے۔ مگر انھوں نے اپنی غلطی کی معافی مانگ لی تھی۔

شاما: اس دفعہ میں غلطی کروں گی اور معافی مانگ لوں گی۔

نظر: شاما بہن ایسی باتیں نہ کیجیے۔ آدمی سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ رام کمار صاحب، اب جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ اسی کی تلافی ہے۔

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ مینا دوڑ کر دروازہ کھولنے جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں رام کمار داخل ہوتا ہے، اس کے پیچھے منّے، پھر مینا۔ رام کمار کو دیکھ کر مرد سب کھڑے ہو جاتے ہیں، اور سلام کرتے ہیں، عورتوں کی نظر منّے پر جم جاتی ہے، شاما کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا ہے، شکنتلا پریشان ہو جاتی ہے، مینا کو ڈر بھی لگ رہا ہے اور مزہ بھی آ رہا ہے)

رام کمار: معاف کیجیے گا چودھری صاحب، میں نے آپ سے اپنے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اتفاق سے منے سے ملاقات ہوگئی۔ ان کو بھی شاید مصوری سے دلچسپی ہے۔ بہر حال، انھوں نے کہا کہ وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتے، اس لیے میں نے سوچا کہ ان کو

لے کر آپ کے یہاں آجاؤں۔ بڑا اچھا ہوا کہ یہاں نظر صاحب اور شکنتلا بہن بھی موجود ہیں۔ (وکیل کی طرف غور سے دیکھ کر) آپ سے بھی شاید نیاز حاصل ہو چکا ہے۔

وکیل: جی ہاں، ایک مقدمے کے سلسلے میں آپ سے ملا تھا۔

رام کمار: اچھا، اب تشریف رکھیے، میری وجہ سے آپ کھڑے کیوں ہو گئے؟

(رام کمار اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کہاں بیٹھے۔ وکیل اسے اپنی کرسی پیش کرتا ہے۔ شاما میز کی طرف منہ کر لیتی ہے، کچھ دیر کھڑی رہتی ہے پھر زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔ شکنتلا منے کی طرف بڑھتی ہے، جو اس وقت کچھ شرمایا ہوا ایزل کے پاس کھڑا ہے)

وکیل: (چودھری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) اچھا بھئی اب میں جاتا ہوں۔ پھر کبھی ملوں گا۔ (سب کو جلدی جلدی سلام کر کے چلا جاتا ہے)

شکنتلا: (منے سے) منے بھائی، آپ کیسے ٹپک پڑے۔ ہم نے تو سنا تھا آپ انگلستان میں ہیں اور اب وہیں رہیں گے۔

مُنّے: ابھی ایک ہفتہ ہوا آیا ہوں۔ پرسوں اتفاق سے مینا سے ملاقات ہوئی۔ میں نے سنا کہ ننھی یہاں آئی تھیں تو سوچا کہ میرے چلے جانے میں بھی خاص حرج نہ ہوگا۔

رام کمار: اچھا چودھری صاحب، بتائیے آپ کی نمائش کے لیے کیا ہو رہا ہے۔

چودھری: میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ نمائش ہونے والی ہے۔ نظر صاحب آپ کو بہتر بتا سکیں گے کہ اس کے لیے اب تک انتظام کیا ہوا ہے۔

شکنتلا: مُنّے بھائی، آپ ادھر کرسی پر بیٹھیے۔ میں آپ کو اور رام کمار صاحب کو چائے بنا دوں۔ مینا، آؤ تم مُنّے بھائی کے پاس بیٹھو۔

(مینا مُنّے کے پاس جا کر بیٹھ جاتی ہے اور اس سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسے سمجھا رہی ہے کہ اسے اس وقت یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ شکنتلا پیالیوں میں چائے بنا کر پہلے رام کمار اور پھر مُنّے کو دیتی ہے۔ اسی

دوران رام کمار اور نظر کی گفتگو ہوتی ہے)

نظر: صاحب اب تک ہوا یہ ہے کہ ہال تین دن کے لیے لے لیا گیا ہے، تاریخیں بہت ٹھیک ہیں، یعنی 20،21،22 دسمبر۔ کرائے میں کمی نہیں کی گئی ہے، مگر کچھ اور رعائتیں کردی جائیں گی۔ ہال بک کرنے کے لیے ایڈوانس دے دیا گیا ہے۔ شکنتلا بہن مہمانوں کی فہرست بنا رہی ہیں۔ اب ایک طرف آپ سے درخواست کرنا ہے کہ 20ر دسمبر کو تشریف لائیں اور نمائش کا افتتاح کردیں، اور دوسری طرف چودھری صاحب سے کہنا ہے کہ تصویروں کا انتخاب کردیں۔ اس انتخاب میں آپ بھی مدد کریں تو بڑی عنایت ہوگی۔

رام کمار: (جیب سے ڈائری نکالتے ہوئے) انتخاب میں میں کیا مدد کروں گا۔ وہ تو چودھری صاحب کو بالکل اپنی رائے کے مطابق کرنا چاہیے۔ افتتاح بھی آپ کسی دوسرے سے کرائیں تو اچھا ہے۔ مگر 20ر دسمبر کو میں یہیں ہوں گا، اور جلسے میں ضرور آؤں گا۔ کیا وقت رکھا ہے آپ نے افتتاح کے لیے؟

نظر: ساڑھے پانچ بجے سہ پہر کو۔

رام کمار: (ڈائری میں لکھتے ہوئے) بہت مناسب ہے۔ ہال کا کرایہ کتنا ہوگا؟

نظر: تین سو روپے۔

رام کمار: مناسب ہے۔ منّے، بھئی کیا ارادہ ہے۔ یہاں اور ٹھہروگے یا چائے پی کر میرے ساتھ چلوگے۔

منّے: جی، میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔

نظر: آپ نیوایشیا (New Asia) کے دفتر کے قریب سے گزرنے والے ہوں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلا چلوں۔

رام کمار: ضرور تشریف لے چلیے۔ (چائے ختم کرکے کھڑا ہوجاتا ہے) اچھا، چودھری صاحب، اب اجازت دیجیے۔ (ادھر اُدھر دیکھ کر) شکنتلا بہن آپ کے پاس تو اپنی گاڑی ہے۔

شکنتلا: جی ہاں، آپ میری فکر نہ کیجیے۔

(رام کمار، نظر اور منّے چلے جاتے ہیں۔ خاموشی۔ شکنتلا آگے کی طرف آکر شی

پر بیٹھ جاتی ہے اور ہینڈ بیگ سے سگریٹ نکال کر چودھری کو پیش کرتی ہے، اور خود بھی لے لیتی ہے۔ مینا، شاما کے پاس جاتی ہے، اسے چپکے چپکے سمجھاتی ہے اور پھر آرام کرسی اٹھا کر چودھری اور شکنتلا کی طرف لاتی ہے۔ شاما تھوڑی دیر تک ان دونوں کو دیکھتی ہے، شکنتلا اسے مخاطب کرنا چاہتی ہے، مگر اس کے تیور دیکھ کر رہ جاتی ہے)

شاما: اب میری قسمت میں تو صرف شرمندگی اور تنہائی رہ گئی ہے۔

مینا: (آرام کرسی کو سامنے کی طرف گھسیٹ کے لاتے ہوئے) شاما بہن، چھوڑیے ایسی باتوں کو۔ اب تو سب چلے گئے۔ آیئے، بیٹھیے اس کرسی پر۔

(مینا شاما کو کھینچ کر کرسی پر بٹھاتی ہے۔ شاما ہاتھوں پر سر رکھ لیتی ہے۔ مینا کرسی کے ہتھے پر بیٹھ جاتی ہے۔ خاموشی)

مینا: توبہ! اس وقت تو کوئی کچھ بولتا ہی نہیں!

چودھری: (سگریٹ بجھا کر اٹھتے ہوئے) میں کیا کہوں؟

(چودھری جا کر پھر تصویریں چھانٹنے لگتا ہے۔ شکنتلا سٹی پر آدھی لیٹ جاتی ہے)

شاما: (چلا کر) بھئی کسی طرح سے بند کر دو یہ تصویریں چھانٹنا!

مینا: شاما بہن، خفا نہ ہویئے، آیئے.....

شاما: (جھنجھلا کر) مینا، جب تمھاری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی ہے تو چپ کیوں نہیں رہتی ہو؟ دیکھتی نہیں ہو کہ میرا تمھارا یہاں رہنا بار ہے؟

شکنتلا: (اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے) کس کے اوپر بار ہے؟

(شاما منہ پھیر لیتی ہے۔ کوئی جواب نہیں دیتی)

مینا: (شاما کے پاس جا کر، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) بس شاما بہن، رہنے دیجیے ایسی باتیں۔ یہاں کون کسی پر بار ہو سکتا ہے؟ میں آپ کی محبت میں دوڑ دوڑ کر آتی ہوں۔ شکنتلا بہن کو ہر وقت آپ دونوں کا خیال رہتا ہے۔ آپ کی خوشی میں ہماری خوشی ہے،

آپ کو رنج ہوتا ہے تو ہم بھی غمگین ہو جاتے ہیں۔اور چودھری بھائی پر خفا ہونا تو بالکل ہی
بے کار ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ انھیں اپنی تصویروں کے سوا کسی چیز سے مطلب ہی
نہیں۔

شاما: بس رہنے دو باتیں بنانا۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ چودھری کی بے بسی کا خیال نہ ہوتا تو اب تک
زہر کھا کر مر گئی ہوتی۔

چودھری: کس کی بے بسی؟ مجھے تو یاد ہے تم نے تھوڑی دیر ہوئی کہا تھا کہ تم نے مجھ سے زیادہ سنگ دل
اور بے حیا آدمی نہیں دیکھا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھ میں اتنی سب صفتیں ایک ساتھ
موجود ہیں۔

شاما: تم میں کتنی صفتیں ہیں یہ میں جانتی ہوں۔

چودھری: پھر تم نے اس بات کو ناحق مجھ سے چھپا کر رکھا۔ مجھے بتا دیتیں تو شاید اب تک میں اپنی کچھ
اصلاح کر لیتا۔

مینا: بھئی یہ کیا ہو گیا ہے آج آپ دونوں کو؟

چودھری: (مسکراتے ہوئے بے پروائی سے) کچھ نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم وحشت کے اس دور سے
گزر گئے ہیں۔ جب گھر بار عورت کا ہوا کرتا تھا اور وہ مرد کو محبت کی مشق کرنے کے لیے
پالتی تھی۔ لیکن اصل میں ہم اسی حالت میں ہیں۔ مرد ابھی تک عورت کی ملکیت ہے،
اگر وہ آزاد ہونا چاہے تو عورت فوراً زہر کھانے پر تیار ہو جاتی ہے۔

شاما: کون، کس کی ملکیت؟ صبح سے شام تک آپ کی خاطر دوڑتی پھرتی ہوں، جھاڑو دیتی ہوں،
کھانا پکاتی ہوں، سب کے سامنے ذلت اٹھاتی ہوں......

چودھری: ......اور میں ایسا بے حیا اور سنگ دل ہوں کہ اس کے باوجود آزاد ہونا چاہتا ہوں۔

شکنتلا: چلو مینا اب چلیں۔ آج ان دونوں پر بھوت سوار ہو گیا ہے۔

مینا: نہیں شکنتلا بہن، ان دونوں کو اکیلا نہ چھوڑیے۔ معلوم نہیں کیا کر ڈالیں گے۔

چودھری: میری طرف سے تم بے فکر رہو۔ مجھے تصویروں میں فریم لگانے ہیں اور اس میں رات کے
بارہ بج جائیں گے۔

شاما: اور میرا کام بس یہ رہ گیا ہے کہ ان کو کام کرتے دیکھتی رہوں۔

چودھری: اچھا اب میرے کام پر بھی رشک کرنے لگی ہو۔

شاما: (طنز کے ساتھ) میں آپ کے کام پر رشک کروں تو آپ کا کیا بگڑ جائے گا۔ اب تو اس کے بہت سے قدر کرنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ اب وہ زمانہ گزر گیا جب آپ کہتے تھے کہ جو تصویر بناتے ہیں میرے لیے بناتے ہیں۔ اب تو شکنتلا نے آپ کے کام کی نمائش کا انتظام کیا ہے، آپ مشہور ہو جائیں گے، آپ کے گرد دھن برسے گا۔ آپ بڑے بڑے آدمیوں سے مصوری پر گفتگو کریں گے، آپ کی تصویر اخباروں میں چھپے گی۔ اب آپ کو نہ میری ضرورت ہے، نہ میرے رشک کی پروا۔

چودھری: میں نے جو کچھ کیا ہے اپنی خاطر کیا ہے۔ مجھے کبھی کسی کی تعریف کی پروا تھی نہ رشک کی۔ اگر کسی نے کچھ اور سمجھا ہے تو اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ میں اس کا ذمہ دار نہیں۔

شاما: جی میں نے کبھی دھوکا نہیں کھایا، مجھے آپ کی حقیقت معلوم تھی۔

چودھری: (غصہ دباتے ہوئے) اچھا، تو پھر میں آزاد ہو گیا۔ شکنتلا، تمھاری گاڑی تو یہاں موجود ہے نا؟

شکنتلا: میری گاڑی سے آپ کو کیا مطلب؟

چودھری: تمھاری گاڑی سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ میں صرف تھوڑی سی تصویریں نظر صاحب کے دفتر پہنچا دوں گا۔

شکنتلا: میں آپ کی تصویریں اپنی گاڑی پر نہیں پہنچاؤں گی۔

چودھری: کیوں؟

شکنتلا: میرا جی۔

چودھری: اچھا، تو میں انھیں اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جاؤں گا۔

شاما: آپ اپنی پیٹھ پر اپنا بکس بستر لاد کر لے جائیے۔ تصویریں میں نہیں لے جانے دوں گی۔

چودھری: کیوں؟

شاما: یہ تصویریں میری ہیں، یہ میرے خون سے بنائی گئی ہیں۔

چودھری: میری تصویریں تمھارے خون سے بنائی گئی ہیں!

شاما: جی ہاں۔ آپ نے پچھلے دو سال میں جو کچھ کیا ہے میری بدولت کیا ہے۔
چودھری: پھر یہ کیوں نہیں کہتی ہو کہ میں پیدا صرف اس لیے کیا گیا تھا کہ تم میری سر پرستی کر سکو۔
شاما: یہ سب میں نہیں جانتی، مگر اپنا حق نہیں چھوڑنا چاہتی ہوں۔
چودھری: تمھارا حق؟ یہ ہے تمھارا حق!

(چودھری اس تصویر کو جو ایزل پر لگی ہے پھاڑ کر اس کی طرف پھینک دیتا ہے، ایزل کو لات مار کر گرا دیتا ہے، پھر اور تصویروں کی طرف بڑھتا ہے۔ مینا چیخ مار کر لپکتی ہے اور تصویروں پر بیٹھ جاتی ہے)

مینا: ارے چودھری بھائی، کیا آپ دیوانے ہو گئے ہیں؟ شکنتلا بہن پکڑیے ان کو!
چودھری: میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ میں دیوانہ تھا، اب کچھ سمجھ آ گئی ہے..... مجھے معلوم ہوتا کہ تھوڑے سے آرام کے بدلے اپنے پاؤں میں زنجیریں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال رہا ہوں تو کبھی اس گھر میں آ کر رہنا قبول نہ کرتا۔
شاما: (ہسٹیریا کی ہنسی ہنستے ہوئے) ہاہاہا، ہاہاہا، انھوں نے اس گھر میں رہنا قبول کیا تھا! دیکھو تو شان۔ ارے میں تیرے اوپر ترس نہ کھاتی تو تیری مصوری دھری رہ جاتی۔ میں نے تیری خاطر اپنی زندگی برباد کی، میں نے تجھے مصور بنایا، نہیں تو تجھے تصویر بنانے کو رنگ بھی نہ ملتے!
چودھری: (شاما کے پاس جا کر) ٹھیک ہے، میرے پاس تصویر بنانے کے لیے رنگ نہیں تھے، بیٹھ کر کام کرنے کو جگہ نہیں تھی۔ یہ سب تمھارے پیسے سے بنی ہیں۔ تم رکھو ان تصویروں کو، اپنے خون کو، اپنے مال و اسباب کو۔ میں اس سے دس گنی تصویریں بنالوں گا، اور آزاد ہو کر بناؤں گا!

(اس دوران ننھی چپکے سے دروازے کے اندر آ جاتی ہے چودھری غصے میں دروازے کی طرف بڑھتا ہے تو وہ ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں پر گر پڑتی ہے۔ چودھری اسے دیکھ کر حیران کھڑا رہ جاتا ہے، پھر لڑکھڑاتا ہوا واپس آتا ہے۔)

(پردہ)

آزمائش

1857 کے واقعات کے متعلق ایک ڈراما

کردار (اشخاص)

مرزا مغل	:	شہزادہ
رام سہائے مل	:	دہلی کا ممتاز سیٹھ
منشی جوالا سنگھ	:	مرزا مغل کا پرائیویٹ سکریٹری
راجا نہار سنگھ	:	بلبھ گڑھ کا راجا
رجب علی	:	کوتوال
محمد یوسف	:	جوہری
مصاحب (دو)	:	
پنکھا جھلنے والے	:	ایک عورت دو مرد
مُغنّی :		ایک گانے والی
سازندے (تین)	:	سارنگیا، طبلچی، ستاریا
حکیم احسن اللہ خاں	:	بہادر شاہ ظفر کا معتبر مصاحب
سدھاری سنگھ	:	فوج کا افسر

ہرکارہ :

سپاہی (چھ) : سدھاری سنگھ کے ساتھی

سلمٰی : حکیم احسن اللہ کی نواسی، محمد یوسف کی منگیتر

ملازمہ (دو) : احسن اللہ کے گھر میں کام کرنے والی

لٹیرے (پانچ) :

جنرل بخت خاں :

کرنل گوری شنکر :

منشی (چار) :

واقعہ نویس (دو) :

ایک مولوی : عمر تیس سال

جہادی مرد اور عورتیں (آٹھ دس)

رانی کشن کنور :

برقعہ پوش سپاہی :

کہار :

ایک نوجوان : کسی عربی مدرسے کا طالب علم

بچھڑا پلٹن :

سپاہی (تین) : بخت خاں کے ساتھی

بھاگوتی : رام سہائے کی بیوی

ملازمہ :

ملازم :

سپاہی (چار) : بخت خاں کے بھیجے ہوئے

پہلا ایکٹ

(مرزا مغل کا دیوان خانہ۔ ناچ رنگ کی محفل کا انتظام ہوا ہے۔ مرزا مغل مسند پر بیٹھا ہے۔ رام سہائے مَل، منشی جوالا سنگھ، راجا نہار سنگھ، رجب علی کوتوال کچھ پاس بیٹھے ہیں، محمد یوسف اور مصاحب ذرا دور۔ ایک عورت مرزا مغل کے پیچھے کھڑی پنکھا جھل رہی ہے، کچھ ملازم مہمانوں کے پنکھا جھل رہے ہیں، کچھ ایک طرف دست بستہ کھڑے ہیں۔ ایک طرف مُنّی سازندوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ اس کا چہرہ بہت اداس ہے۔)

مرزا مغل: بھئی آج سب کو کیا ہو گیا ہے۔ آج نہیں چہکتے!...... بی مُنّی، آج ہماری ایک خاص فرمائش ہے۔

منی: (زبردستی مسکرا کر) حضور، سر آنکھوں پر۔

مرزا مغل: (نہار سنگھ کی طرف اشارہ کر کے) ہم بہت دنوں سے راجا صاحب کے پیچھے پڑے ہیں کہ دیہات کی پارسائی میں ذرا سی شہر کی رنگینی ملا لیا کرو، مگر وہ دو ہاتھ سے سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔

منی: حضور کی ذرا سی خواہش بڑے بڑے انقلاب کر سکتی ہے۔

(نہار سنگھ اس جملے سے ذرا پریشان ہو جاتا ہے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے)

مرزا مغل: ہاں، آج بڑی مشکل سے راضی ہوئے، یا رانی صاحبہ کو راضی کیا۔ خیر، کہنا یہ تھا کہ ذرا ان کی طرف توجہ رکھنا۔ جو نکتے ہم نہ سمجھا سکتے وہ تمھارے التفات سے ان کی سمجھ میں آ جائیں گے۔ معلوم نہیں انتظار میں ان پر کیا گزر رہی ہے۔

منی: حضور، انتظار میں بھی کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ منیر شکوہ آبادی کی ایک بہت ہی لطیف غزل آج ہی یاد کی ہے۔ حکم ہو تو سناؤں۔

(سازندے اپنے سازوں کے سُر ملانے لگتے ہیں)

مرزا مغل: ہاں ہاں بھئی ضرور۔ بس اس کا خیال رکھنا کہ بلبھ گڑھ اردوئے معلّٰی کی قلمرو میں نہیں ہے۔

راجا نہار سنگھ: حضور والا، بلبھ گڑھ اردوئے معلّٰی کی قلمرو میں ہو یا نہ ہو، لال قلعہ وہاں سے نظر آتا ہے، اور شائستگی کی ہوائیں دِلّی سے چلتی ہیں تو بلبھ گڑھ سے ضرور گزرتی ہیں۔

منیؔ: بجا فرمایا راجا صاحب نے۔ آدمی کی تربیت کے بہت سے ذریعے ہیں......اب اجازت ہو تو غزل عرض کر دوں۔

کیا جانیئے کیا لطف ہے چلمن کے اُدھر آج — جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج
کیا جانیئے کیا لطف ہے چلمن کے اُدھر آج — جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج
محفل میں ہے ہر سمت حسینوں کا گزر آج — اے بے خبری تو ہی بتا ہم ہیں کدھر آج
محفل میں ہے ہر سمت حسینوں کا گزر آج — اے بے خبری تو ہی بتا ہم ہیں کدھر آج

(حکیم احسن اللہ خاں داخل ہوتا ہے اور منی کو اشارے سے چپ کر دیتا ہے۔ سب حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔)

مرزا مغل: خیر تو ہے احسن اللہ۔ ہم تو تمھارا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے، تم نے آ کر عیش کا دروازہ بند کر دیا۔

حکیم احسن اللہ: حضور، اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہوں، مگر زمانے کی گردش نے گستاخی عام کردی ہے۔ اب نہ آداب کے لیے گنجائش ہے، نہ آداب کا خیال کرنے کے لیے۔

مرزا مغل: کیوں، کیا ہوا؟

حکیم احسن اللہ: جب سوچتا ہوں کہ شہنشاہانِ مغلیہ کی شان کیا تھی، دبدبہ کیا تھا، اور اب حالت کیا ہے تو جذبۂ وفاداری کہتا ہے کہ فدایانِ سلطنت کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اگر زندہ ہوں تو اس وجہ سے کہ خدمت کا حق ادا کرنا ہے۔

مرزا مغل: ہاں ہاں احسن اللہ، یہ تو ٹھیک ہے۔ وعظ ونصیحت کی ابتداتم اسی طرح کیا کرتے ہو، مگر بات تو بتاؤ۔

حکیم احسن اللہ: کیا بتاؤں۔ زبان میں طاقت نہیں کہ بیان کرسکے۔ فرنگیوں کی گستاخیاں کیا کم تھیں۔ آج اپنے ملک والوں کی بے باکی دیکھ لی...... میرٹھ کی فوج نے غدر کردیا ہے۔ وہاں مار دھاڑ کرکے باغی آج یہاں پہنچے۔ حضور اقدس سے مطالبہ کررہے تھے کہ ان کے بادشاہ بن جائیں۔

مرزا مغل: اور حضور نے کیا فرمایا؟

(احسن اللہ غصے میں بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی جواب نہیں دیتا۔ خاموشی)

راجا نہار سنگھ: کیا وہاں سرکار پر جان نثار کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا؟

حکیم احسن اللہ: جی نہیں۔ نافرمانوں سے گفتگو کرنے اور ان کی گالیاں سننے کے لیے بندہ طلب کیا گیا۔ بندے نے کیپٹن ڈگلس کو بلوایا۔ مسٹر فریزر کو خبر کرائی۔ ان کے بنائے وہاں کچھ نہ بنی۔ قلعے کے باہر ان پر جو کچھ گزری وہ آپ کل سن لیجیے گا۔ اور پھر طے کرلیجیے گا کہ سرکار اپنی اس عمر میں باغیوں کے سردار بن سکتے ہیں یا نہیں اور برطانوی فوج سے لڑنے اور ایک بڑے شہر کو کھلانے پلانے کا اہتمام کرسکتے ہیں یا نہیں۔ مجھے تو صرف سرکار سے محبت اور عقیدت ہے۔ میں طبیب ہوں، سرکار کا نمک خوار ہوں اور بس۔

(دیوان خانے کے قریب شور برپا ہوتا ہے: ''ٹھہرو'' ''ٹھہرو'' کہاں جارہے ہو''، ''چپ رہو، نہیں تو ایک باڑھ میں سب کو ختم کردیں گے''۔

تھوڑی دیر میں سدھاری سنگھ دس پندرہ مسلح سپاہیوں کے ساتھ داخل ہوتا ہے اور مرزا مغل کے سامنے کھڑا ہوکر فوجی سلام کرتا ہے۔ سپاہی بھی قطاریں بنا کر کھڑے ہوتے ہیں اور ہتھیار پیش کرتے ہیں)

مرزا مغل: ہیں بھئی، یہ کیا؟

سدھاری سنگھ: (پھر سلام کرکے) حضور، ہم آپ کے جاں نثار فوجی ہیں۔ حکم لینے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔

حکیم احسن اللہ: حضور، یہ انھیں نافرمانوں کے بھائی بند ہیں جو آج قلعے کے نیچے سرکار کا درشن کرنے اور سیاست کے اعلیٰ مسائل پر گفتگو کرنے آئے تھے۔ ان کی اصلیت دیکھنا چاہتے ہوں تو ان کی مرضی کے خلاف کچھ فرما دیجیے۔

سدھاری سنگھ: حضور، اس میں شک نہیں کہ ہم نے نافرمانی کی ہے، اپنے دھرم کو اپنی نوکری پر ترجیح دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری طرح لاکھوں آدمی انگریزوں کی حکومت سے بیزار ہیں اور وہ لڑائی میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ لیکن ملک میں ہم کو کوئی جانتا نہیں۔ آپ کا خاندان اس دیس کی آبرو ہے، آپ کے حکم پر ہم اور ہمارے ساتھ ہزاروں آدمی جان دینے کو تیار ہو جائیں گے ہم آپ کی رہبری چاہتے ہیں۔

حکیم احسن اللہ: اور آپ کو رہبری کرنے میں تامل ہوگا تو ہم آپ کو گولی مار دیں گے اور کسی دوسرے کو اپنا سردار بنا لیں گے۔

(ایک سپاہی احسن اللہ کو مارنے کے لیے بندوق اٹھاتا ہے، مگر سدھاری سنگھ اسے منع کر دیتا ہے)

مرزا مغل: (گفتگو کے انداز سے پریشان ہوکر) ہیں ہیں بھئی، یہ کیا کر رہے ہو۔

سدھاری سنگھ: حضور، ہم فوجی آدمی ہیں۔ ہم یا تو حکم مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اچھائی اور برائی کی ذمہ داری حکم دینے والے پر ہے، یا ہم حکم ماننے سے انکار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ

بندوق کے سامنے سینہ کھول کر کھڑے ہو گئے ہیں، اور جان دینے کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ ہم نے اپنے افسروں کا حکم ماننے سے انکار کیا ہے اس لیے کہ دھرم ایمان کا نقصان جان کے نقصان سے زیادہ بڑا ہوتا ہے۔

حکیم احسن اللہ: اور اب آپ سمجھتے ہیں کہ جتنے زیادہ لوگ آپ کے ساتھ شریک ہو جائیں اتنی ہی زیادہ آپ کی جان محفوظ ہو جائے گی۔

سدھاری سنگھ: ہم جان کی کتنی قدر کرتے ہیں یہ آپ دیکھ لیجیے گا۔ لیکن ہمارے ساتھ دوسروں کا بھی فرض ہے کہ وہ دھرم ایمان اور ملک کے لیے جان دینے پر تیار رہیں۔ آپ ہمارے ساتھ شریک ہو کر ہمارے اوپر کوئی احسان نہیں کریں گے، اپنا فرض ادا کریں گے۔

حکیم احسن اللہ: (طنز کے ساتھ منہ پھیر کر) بے شک۔

مرزا مغل: کہو، جوالا سنگھ، تمھاری کیا رائے ہے؟

جوالا سنگھ: سرکار میرا کام تو روپے کا حساب رکھنا ہے۔ جتنا روپیہ دیجیے، اتنا خرچ کیجیے، حساب مجھ سے لے لیجیے۔ دھرم ایمان یا جان کی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنا مجھے نہیں آتا۔

راجا نہار سنگھ: حضور، جو بات لالاؤں سے پوچھنے کی ہو وہ ان سے پوچھیے، جس سوال کا جواب جاٹ اور راجپوت دے سکتا ہے وہ اس سے کیجیے۔

منّی: سرکار، روپیہ پیسہ کسی کے پاس ہوتا ہے، کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ جان سب کے ہوتی ہے۔ جان کا سودا کیا جا رہا ہو تو سبھی سے سوال کرنا چاہیے۔

جوالا سنگھ: واہ بی منّی، بہت اچھے موقعے سے بولیں۔ تمھاری جان کا سودا ہو تو دونوں فریق سبھی کچھ دینے پر تیار ہو جائیں گے۔

محمد یوسف: منشی صاحب دھوکے سے بہت بڑی بات کہہ گئے۔

حکیم احسن اللہ: منشی صاحب، آپ بھی کس وقت کس سے الجھ گئے۔ آپ سے سوال اس لیے کیا گیا ہے کہ آپ معاملے کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالیں۔ جنگ کرنے کا شوق ہر نوجوان کو اور ہر فسادی کو ہوتا ہے، آپ بتایے کہ اس میں بادشاہوں اور شہزادوں کو شریک ہونا چاہیے یا نہیں۔ اور شریک ہوں تو بتایے خرچ کہاں سے آئے گا۔

منی: (زیور اتار کر سدھاری سنگھ کی طرف پھینکتے ہوئے) جرنیل صاحب، آپ سے جو روپے پیسے کی بات کرے اس کے منہ پر یہ پھینک کر ماریے۔

حکیم احسن اللہ: منی بیگم، جلدی کیوں کر رہی ہو۔ تمھارا زیور یہ لوگ خود ہی اتار لیں گے۔ اس کے علاوہ جو کچھ لوٹ لے جائیں گے اس کا ذکر ہی نہیں۔

سدھاری سنگھ: (حکیم احسن اللہ کو مخاطب کر کے) مجھے معلوم نہیں کہ آپ کون ہیں اور ایسی باتیں کس نیت سے کر رہے ہیں، مگر میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب ایسی باتیں کرنے کا وقت نہیں رہا ہے (ایک سپاہی کی طرف دیکھتا ہے۔ سپاہی ایک پوٹلی سی نکالتا ہے جس پر خون کے دھبے ہیں اور اسے سدھاری سنگھ کو دیتا ہے۔ سدھاری سنگھ اسے مرزا مغل اور حکیم احسن اللہ کے سامنے پھینک دیتا ہے) یہ ایک ہاتھ ہے جو حکومت کا قلم چلاتا تھا، کبھی اپنی مصلحت سے ہمیں تھپکیاں دیتا تھا، کبھی طمانچے مارتا تھا ہم نے اسے کاٹ دیا ہے، اور یہ کٹا رہے گا جب تک کہ ہمارے سر بدن سے جدا نہ کر دیے جائیں۔ لیکن ہماری ناکامی اور موت آپ کی بھی ناکامی اور موت ہوگی۔ یہ ہاتھ زندہ ہو گیا تو آپ کے خلاف بھی شہادت دے گا۔

(مرزا مغل چیخ مارتا ہے، احسن اللہ ہاتھوں سے چہرا چھپا لیتا ہے، رام سہائے مل اور جوالا پرشاد اس طرح کھڑے ہوتے ہیں کہ گویا بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ منی کا چہرا جوش سے دمک اٹھتا ہے۔ ایسے ہی آثار محمد یوسف اور راجا نہار سنگھ کی صورتوں پر نظر آتے ہیں۔ اسی دوران میں ایک ہرکارہ آتا ہے اور آداب بجالاتا ہے)

ہرکارہ: حضور، سرکار عالم نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔

مرزا مغل: (جلدی سے کھڑے ہو کر) اچھا، اچھا ابھی آتا ہوں۔ تم جا کر سرکار کی خدمت میں عرض کر دو۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

(محل کے اندر چلا جاتا ہے۔ ہرکارہ آداب بجالاتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اس

کے تھوڑی دیر بعد احسن اللہ، جوالا سنگھ اور رام سہائے مل جانے لگتے ہیں۔
سدھاری سنگھ کے اشارے پر دو سپاہی رام سہائے مل کا راستہ روک لیتے
ہیں۔احسن اللہ اور جوالا سنگھ چلے جاتے ہیں)

سدھاری سنگھ: (جیب سے ایک کاغذ نکال کر اور اسے دیکھ کر) آپ سیٹھ رام سہائے مل ہیں نا؟

رام سہائے مل: جی ہاں۔

سدھاری سنگھ: آپ کی عنایت ہوگی اگر آپ ذرا ٹھہر جائیں۔ہمیں آپ سے کام ہے۔

راجا نہار سنگھ: جی ہاں سیٹھ صاحب، آؤ اب ذرا بیٹھ ہی جاؤ۔تمھارا مال اور ہماری جان داؤ پر لگ
گئی ہے۔

منّی: (سدھاری سنگھ سے) جرنیل صاحب، اب کب تک قواعد کرتے رہیے گا۔آیئے آدمیوں کی
طرح بیٹھ کر بات کیجیے۔راجا صاحب، اب مسند پر بیٹھنا آپ کا حق ہے (شرارت کے
انداز سے) چاہے اس پر اُکڑوں ہی بیٹھیے۔
(سب ہنس پڑتے ہیں، جس سے بے تکلفی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے)

سدھاری سنگھ: (سلام کرتے ہوئے) راجا صاحب، خادم کو سدھاری سنگھ کہتے ہیں۔فوج میں دفعہ
دار تھا، بغاوت کے بعد ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔آپ مشورے کے بعد جو عہدہ دیں
اور جو خدمت سپرد کریں مجھے منظور ہے۔

راجا نہار سنگھ: آپ کو منّی بیگم نے جرنیل کا لقب دیا ہے، وہی مناسب ہے۔یہ رجب علی صاحب،
دہلی کے کوتوال ہیں۔

منّی: جن سے زیادہ خاموش اور پرکار کوئی حسین نہ ملے گا۔

راجا نہار سنگھ: اور یہ قلعہ کے جوہری محمد یوسف ہیں۔

محمد یوسف: چپاتیاں تقسیم ہوئیں تو ہم سب نے کھائیں اور کھلائیں۔منّی بیگم نے ضد کر کے اپنا حصہ
الگ منگوایا اور کھایا۔ہمیں ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے، ہم نے تو ان
لوگوں پر اعتبار کیا جو انھیں تقسیم کر رہے تھے۔یہاں چپاتیاں مولانا احمد اللہ صاحب کی

طرف سے تقسیم ہوئی تھیں۔

سدھاری سنگھ: (پھر سلام کر کے) میں یہاں اس خاص غرض سے حاضر ہوا تھا کہ شہزادہ مرزا مغل کا منشا معلوم کروں اور ہو سکے تو انھیں اس پر آمادہ کرلوں کہ اس معاملے کو جو سپاہیوں کی بغاوت سے شروع ہوا ہے آزادی کی جنگ بنالیں اور ہمارے سر پرست اور سردار بن جائیں۔ بادشاہ سلامت کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوئے تھے وہ ٹھیک سے بات نہ کر سکے اور انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی ناکام ہی رہا۔ اب معاملہ بہت مشکل ہو گیا ہے۔ شہر کے انگریز افسران سب مارے جا چکے ہیں، اب ہم سپاہیوں کو قابو میں رکھ سکیں تو بڑی بات ہوگی۔ شہر کے غنڈوں اور لٹیروں پر ہمارا بس نہیں چل سکتا۔ یہ شہر والوں کو ستائیں گے، لوٹیں گے، اور ان کی تمام زیادتیوں کا ذمہ دار ہم کو سمجھا جائے گا۔ آپ ہمارا ساتھ نہ دینا چاہتے ہوں تب بھی شہر والوں کو بچانے میں ہماری مدد کیجیے۔

راجا نہار سنگھ: اچھا ہوا آپ نے حالت صاف صاف بیان کر دی۔ فرمایے کوتوال صاحب، اب کیا کیا جا سکتا ہے؟

رجب علی: میں چپاتی کھا چکا ہوں، اپنی مرضی سے کھا چکا ہوں، مگر میرا خیال تھا کہ جب لوگوں کو اس طرح آزادی کے لیے لڑنے پر آمادہ کیا جا رہا ہے تو لڑائی بھی قاعدے سے ہوگی۔ اب تو لڑائی کی جگہ ہنگامہ ہو گیا ہے۔

سدھاری سنگھ: آپ بجا فرماتے ہیں۔ اس میں قصور ہم فوجیوں کا ہے۔

رجب علی: میرا مقصد الزام لگانا نہیں تھا۔ مگر مجھے جو اختیار ہے وہ بادشاہ سلامت کا دیا ہوا ہے، میرے ماتحت جو لوگ ہیں وہ سرکار کے ملازم ہیں۔ میں اپنی مرضی سے کام نہیں کرتا، مجھے حکم ملنا چاہیے۔ ورنہ میرا حکم نہ مانا جائے گا۔

محمد یوسف: مجھے معلوم ہے کہ سرکار کی عمر اور طبیعت ایسی نہیں ہے کہ وہ خود فیصلہ کر سکیں اور جلد کر سکیں۔ انھیں تو آمادہ کرنا ہوگا۔

رجب علی: میں ملازم ہوں، مشیر نہیں ہوں۔ بادشاہ سلامت کو مشورہ وہی لوگ دے سکتے ہیں

جنھیں اس کا حق ہے اور جن سے وہ مشورہ لیا کرتے ہیں۔

محمد یوسف: اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو کچھ ہوگا حکیم احسن اللہ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔

رجب علی: ہاں، بات تو یہی ہے۔

سدھاری سنگھ: جی نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ ہم نے اس کا انتظام کرلیا ہے کہ بادشاہ سلامت راضی نہ ہوں تب بھی ان کو ہمارا ساتھ دینا پڑے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ بوڑھے ہیں، کم زور ہیں، پنشن پر گزر کرتے ہیں، مگر ہماری ضرورت ان کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔

رجب علی: آپ ایسا کرلیں تو پھر میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔

محمد یوسف: میں یہ کہنے کے لیے صرف موقع کا انتظار کررہا تھا کہ میں دل وجان سے آپ کے ساتھ ہوں۔ کسی زمانے میں قلعہ کی بچھڑا پلٹن میں تھا، اس کے بعد فوجی قواعد کی مشق نہیں کی، مگر ہتھیار مل جائیں تو لڑسکتا ہوں۔

منّی: اور مجھے بات کرنے کا موقع کب ملے گا؟

سدھاری سنگھ: (حیرت سے) فرمایئے۔

منّی: میں بہت دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ ناچنے گانے کے پیشے سے توبہ کرلوں۔ آج آپ سب کے سامنے توبہ کرتی ہوں۔

سدھاری سنگھ: یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ مگر آپ ہمارے لیے کیا کریں گی؟

منّی: آج جو زیور پہنے تھی وہ آپ کی نذر کرچکی ہوں۔ میرے ساتھ کسی کو کردیجیے تو گھر پر جو کچھ ہے وہ بھی دے دوں۔

سدھاری سنگھ: جی نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔

منّی: (خفا ہوکر) بہت اچھا، نہیں ہوسکتا (اٹھ کر چلی جاتی ہے)

سدھاری سنگھ: (ایک سپاہی کو اشارہ کرکے) دیکھو، اس کے ساتھ جاؤ۔ اگر یہ صحیح سلامت گھر نہ پہنچی تو تمھارے گولی ماردوں گا۔ (سپاہی سلام کرکے چلا جاتا ہے)

محمد یوسف: جرنیل صاحب، اگر آپ اس عورت کی داستان سنیں تو ہندستان کا نقشہ آپ کی نظروں میں پھر جائے گا۔ اس وقت یہ خفا ہوکر چلی گئی ہے، مگر ایک نہ ایک دن آپ اسے میدان

میں ضرور دیکھیں گے۔

سدھاری سنگھ: یوسف صاحب، اگر ہم پہلے ہی دن سے عورتوں کے زیور اپنے خرچ کے لیے وصول کرنے لگیں اور عورتوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنے لگیں تو ہم دشمن کا کس منہ سے مقابلہ کریں گے۔

راجا نہار سنگھ: بہر حال، منی بیگم نے سیٹھ صاحب کے لیے اچھی مثال قائم کی ہے۔

سدھاری سنگھ: جی ہاں، ہم معاملے کی بات تو اب تک کر ہی نہیں سکے۔

رام سہائے مل: (ہاتھ جوڑ کر) ہمارا کام میل جول اور امن وشانتی کے لیے دعائیں مانگنا ہے۔ ہم لڑائی میں کیسے شریک ہو سکتے ہیں!

راجا نہار سنگھ: سیٹھ صاحب، صاف بات کرو، ورنہ نہ ہمارا کام بنے گا نہ تمھارا۔

رام سہائے مل: جو حکم ہو، راجا صاحب۔

راجا نہار سنگھ: حکم کی بات نہیں ہے، مل کر کام کرنا ہے۔ میں بلبھ گڑھ سے دہلی تک کا راستہ کھلا رکھنے کی ذمے داری لیتا ہوں۔ تم جو مال آئے اس کے دام ادا کرنے کی ذمے داری لو۔

رام سہائے مل: سارے شہر کو ایک آدمی کیسے کھلا سکتا ہے۔ میں رسد کی ذمے داری لے بھی لوں تو کون مانے گا کہ میں اسے پورا کر سکتا ہوں؟

راجا نہار سنگھ: تم اکیلے نہیں کر سکتے ہو۔ مگر دلی کے سیٹھ سب مل جائیں تو کر سکتے ہیں۔ آخر دلی میں جو مال آتا رہتا ہے وہ آپ ہی لوگوں کے ذریعے سے آتا ہے۔

رام سہائے مل: جی سرکار۔ مگر ہم ایک ہاتھ سے لیتے ہیں، دوسرے ہاتھ سے دیتے ہیں۔ اگر لینے والا ہاتھ کٹ جائے تو دینے والا کام نہیں کر سکتا۔

سدھاری سنگھ: مگر ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک ہاتھ کو بچانے کے لیے دوسرا قربان کیا جائے۔

رام سہائے مل: جی ہاں، ہو تو سب کچھ سکتا ہے۔

محمد یوسف: سیٹھ صاحب، آپ برا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں۔ اس وقت ہم جانتے ہیں کہ سپاہیوں نے بغاوت کی ہے اور شہر کے اندر آ گئے ہیں۔ اب ہم یا تو ان کو اپنا دشمن سمجھ سکتے ہیں، یا ان سے سودا کر سکتے ہیں، یا ان کی بغاوت کو قومی جنگ بنا سکتے ہیں۔ میرے

خیال میں آپ جیسے لوگوں کے لیے سب سے کم خطرہ آخری صورت میں ہے۔

رام سہائے مل: جی ہاں۔

(ہرکارہ داخل ہوتا ہے، اور ادھر ادھر دیکھتا ہے)

راجا نہار سنگھ: کیوں، کیا خبر لائے ہو۔

ہرکارہ: حضور، سرکار عالم نے حضور والا کو طلب کیا ہے۔

راجا نہار سنگھ: وہ تو یہاں سے روانہ ہو گئے ہیں۔ کیا ابھی تک پہنچے نہیں۔

ہرکارہ: حضور، شہر میں بڑا ہنگامہ ہے۔ مار پیٹ ہو رہی ہے، مکان لٹ رہے ہیں، لوگ بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ میں یہاں جان پر کھیل کے آیا ہوں۔ ممکن ہے میں ایک رستے سے آیا ہوں اور حضور والا دوسرے سے قلعہ میں پہنچ گئے ہوں۔ ممکن ہے ابھی محل سرا میں ہوں۔

محمد یوسف: قلعہ سے آ رہے ہو نا؟ کچھ معلوم ہے سرکار عالم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔

ہرکارہ: میاں، سرکار عالم نے ملک کا بادشاہ بننا منظور کر لیا ہے۔ کمپنی بہادر کے خلاف اعلان جنگ سا ہو گیا ہے۔

سدھاری سنگھ: بہادر شاہ، بادشاہ ہندوستان، زندہ باد۔

سب: زندہ باد۔

راجا نہار سنگھ: لیجیے، اب سب معاملے طے ہو گئے۔ کوتوال صاحب، اب آپ شہر کی ذمے داری لیجیے۔ سیٹھ صاحب، آپ کی تھیلیاں بھی اب کھل جانی چاہئیں۔

(مرزا مغل محل سے دیوان خانے میں آتا ہے۔ اس کے پیچھے چند ملازم ہیں)

مرزا مغل: ہیں بھئی، یہ آپ نے نعرہ کیسا لگایا تھا؟

(سدھاری سنگھ، اور اس کے اشارے پر سپاہی، ہتھیار پیش کرتے ہیں)

راجا نہار سنگھ: حضور، آپ کے تابعدار آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، سرکار عالم نے ہندوستان کا بادشاہ بننا منظور کر لیا ہے۔

مرزا مغل: (حاکمانہ انداز سے) آپ لوگوں کا بہت شکریہ۔ ہیں، ایں، ایں، تو اب حکومت کا سارا اختیار سرکار عالم کو مل گیا؟

راجا نہار سنگھ: سرکار!

مرزا مغل: ہیں۔ ایں۔ اچھا، سدھاری سنگھ، ہم تم کو جرنیل بناتے ہیں۔ کل سرکار عالم سے باقاعدہ فرمان جاری کرا دیں گے۔ اب تم اپنے سپاہیوں کو لے کر جاؤ...... ہیں، (ملازم سے) وہ منی کہاں بھاگ گئی؟ بلاؤ اس کو، فوراً بلاؤ......اور منشی جوالا سنگھ کو بھی بلاؤ۔ اب ان کو نئے کھاتے کھولنے ہوں گے۔ کہتے تھے ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے۔ بے وقوف!

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

(حکیم احسن اللہ کا زنان خانہ۔ قریب دو تین بجے صبح کا وقت ہے۔ کوئی چیز صاف نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ پیچھے کی طرف دیوار ہے، اور دائیں طرف دالان کے در ہیں۔ اسٹیج کے بیچ میں ایک پلنگ بچھا ہوا ہے۔ اس پر سلمیٰ لیٹی سو رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد محمد یوسف دیوار پھاند کر اندر آتا ہے اور پلنگ کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ سلمیٰ کو اس کے آنے کی خبر نہیں ہوتی۔)

محمد یوسف: سلمیٰ!

(سلمیٰ چونک پڑتی ہے۔ مرد کو سامنے کھڑا دیکھ کر جلدی سے تکیہ کے نیچے سے خنجر نکالتی ہے اور اسے تان کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے۔)

سلمیٰ: تم کون ہو؟

محمد یوسف: میں ہوں محمد یوسف۔

سلمیٰ: کون محمد یوسف؟

(ایک بارگی رشتے کا خیال آتا ہے۔ وہ لپک کر سرہانے سے دوپٹہ اٹھاتی ہے، اپنا سر ڈھکتی ہےاور منہ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہے۔)

سلمٰی: مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اس طریقے سے بھی اور ایسے وقت پر ملاقات کرنے آسکتے ہیں۔

محمد یوسف: اگر آپ کو میری شرافت پر اعتبار ہے تو سمجھیے کہ ایسی ہی کوئی بات ہوگئی جو اس وقت اس طریقے سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ (سلمٰی کوئی جواب نہیں دیتی، سر جھکائے کھڑی رہتی ہے) شہر میں جو ہنگامہ ہو رہا ہے اس کا شور آپ کے کانوں تک پہنچ گیا ہوگا۔ میں اس کا مطلب سمجھانے آیا ہوں۔

سلمٰی: جی، فرمایئے۔

محمد یوسف: آپ کو معلوم ہے کہ سارے ملک پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ سلطنت مغلیہ گھٹتے گھٹتے بے نشان ہوگئی ہے، شاہان مغلیہ کے وارث بہادر شاہ کو کمپنی پنشن دیتی ہے۔

سلمٰی: دیتی ہوگی۔ مغلیہ سلطنت کو قائم رکھنے کا ٹھیکہ کس نے لیا تھا۔ میں اس کا حال رات کے تیسرے پہر کو اٹھ کر کیوں سنوں؟

محمد یوسف: سلطنت کو زوال ہوا اس لیے کہ حکومت کرنے والے ناقص اور ناکارہ تھے۔ ہم سلطنتوں کے ٹھیکے دار نہیں ہیں، لیکن ہم دیکھیں کہ مغلیہ سلطنت کے زوال نے ہم کو بے عزت اور بے آبرو کر دیا ہے......

سلمٰی: آدمی کی عزت آبرو اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

محمد یوسف: مگر اس آبرو کے دشمن ہوں اور طاقتور ہوں تو وہ خاک میں مل سکتی ہے۔ میں مغلیہ سلطنت کا فاتحہ پڑھنے نہیں آیا ہوں۔ آپ کی اور اپنی عزت آبرو کا حوالہ دے کر کچھ کہنے آیا ہوں۔

سلمٰی: فرمایئے۔

محمد یوسف: ہمارے عالم کہتے ہیں کہ کمپنی کی حکومت ہمیں عیسائی بنانے کی کوشش کر رہی ہے، اور اگر وہ قائم رہی تو ہمارے دین ایمان کی خیر نہیں۔ ہمارے نواب اور راجا، جو ہماری حکومتوں کی یادگار ہیں، کہتے ہیں کہ ان سے راج پاٹ اور اختیار اس طرح سے چھینا

جا رہا ہے کہ تھوڑے دنوں میں ان میں سے کوئی باقی نہ بچے گا۔ ہمارے سپاہیوں کو ایسے کارتوس دیے گئے ہیں جن میں گائے اور سور اور مردار جانوروں کی چربی لگی ہے اور انھیں بندوقوں میں لگانے کے لیے چربی دانتوں سے چھڑائی جاتی ہے۔ تجارت اب انگریزوں کے ہاتھ میں جا رہی ہے، بازاروں میں بدیسی مال ہی نظر آتا ہے اور ہمارے کاری گر اپنا پیشہ نہیں چھوڑتے ہیں تو فاقے کرتے ہیں۔ تعلیم اب کمپنی کے ہاتھ میں چلی گئی ہے، اور ہم یا تو جاہل رہیں گے یا وہ سب کچھ سیکھیں گے جو انگریز ہمیں سکھانا چاہتے ہیں اور وہ سب کچھ مان لیں گے جو وہ ہم سے منوانا چاہتے ہیں۔ ہر چیز جو ہمیں عزیز ہے وہ خطرے میں پڑ گئی ہے اور جو کچھ اب نہ بچایا گیا وہ بچ نہ سکے گا۔

سلمٰی: یہ سب کہنے کے لیے رات کے تیسرے پہر کو چوروں کی طرح آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

محمد یوسف: میرے دل میں جو خیالات آئے ہیں وہ بھی رات کو چوروں کی طرح آئے ہیں۔ انھوں نے مجھے سوتے سے جگایا ہے، اور اب سونے نہیں دیتے (خاموشی) کوئی سال ڈیڑھ سال سے ہمارے ملک میں چپاتیاں تقسیم ہو رہی ہیں۔ جنھیں وہ دی جاتی تھیں وہ تھوڑی سی کھا کر کسی اور کو دے دیتے تھے۔ مجھے کسی نے بتایا نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے، مگر میں نے یہ سمجھ کر چپاتی کھائی اور آگے پہنچائی کہ یہ ہم میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ تھوڑے دن ہوئے میں نے مولانا احمد اللہ کا وعظ سنا۔ وعظ سننے کے لیے ہزاروں آئے تھے۔ ان میں ہر طرح کے لوگ تھے، امیر، غریب، شریف گھرانوں کی بہو بیٹیاں، دلی کی مشہور گانے والی منی۔ (سلمٰی چونکتی ہے اور زور سے سانس لیتی ہے) میں آپ کے صبر کو اور نہ آزماؤں گا۔ بس آخری بات کہے دیتا ہوں۔ مولانا احمد اللہ کی تقریر سننے کے بعد میرے خیالات بدل گئے، میرے ارادے بدل گئے، میں بدل گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ تقدیر نے میری مشکل آسان کر دی۔ پرسوں میرٹھ میں بغاوت ہوئی۔ وہاں جو آگ بھڑکی تھی وہ پھیل کر دلی پہنچ گئی ہے۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ اپنا کام چھوڑ دوں گا۔ خوشی اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے کا حوصلہ چھوڑ دوں گا، کسی مخلص مجاہد، کسی بہادر اور جاں باز سپاہی کے ساتھ لڑوں گا اور جان دوں گا۔

سلمیٰ: اور کوئی مخلص مجاہد یا جاں باز سپاہی نہ ملا تو پاک باز طوائف یا سرفروش طبلچی کی صحبت کو غنیمت سمجھوں گا۔

محمد یوسف: جس نے یہ سوچ لیا ہو کہ اس کا انجام پھانسی پر لٹکنا ہے وہ اس بات سے کیوں ڈرے کہ اس کے ساتھ کسی پاک باز طوائف یا سرفروش طبلچی کو بھی پھانسی دی جائے گی۔

سلمیٰ: اور وہ یہ بھی کیوں سوچے کہ خود پھانسی پر لٹکنے کے لیے اسے کس کس کی امیدوں کا خون کرنا ہوگا، کس کی آرزوؤں کو خاک میں ملانا ہوگا!

(محمد یوسف سر جھکا لیتا ہے۔ سلمیٰ اسے تھوڑی دیر غور سے دیکھتی ہے، پھر چیخ مار کر زور زور سے رونے لگتی ہے۔ دالان کی طرف سے دو عورتیں دوڑ کر آتی ہیں، ان کے پیچھے احسن اللہ خاں اور رجب علی کوتوال۔ سلمیٰ منہ پھیر کر اکڑوں بیٹھ جاتی ہے اور روتی رہتی ہے)

پہلی عورت: ارے بی بی کیا ہوا؟

دوسری عورت: یہ مرد یہاں کیسے گھس آیا؟ ہائے، اب تو شریفوں کا بھی کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔

پہلی عورت: دیکھو تو کیسا ڈھیٹ ہے۔ اپنی جگہ سے ہٹتا ہی نہیں۔

دوسری عورت: ارے کم بخت، بتا تو کیسے پہنچ گیا یہاں؟

حکیم احسن اللہ: (محمد یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا منہ اپنی طرف موڑتے ہوئے) ارے کون ہے تو؟...... یوسف! تم یہاں؟ (عورتوں سے) جاؤ، تم لوگوں کی یہاں ضرورت نہیں۔ (محمد یوسف سے) مجھے معلوم نہیں تھا کہ آداب کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں تم بھی ہو۔

(یوسف کوئی جواب نہیں دیتا، سر جھکائے کھڑا رہتا ہے)

رجب علی: (یوسف کی طرف غور سے دیکھ کر) کبھی آداب کی خاطر ہی آداب کی خلاف ورزی کرنا ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ جو بات یہ کہنا چاہتے ہیں وہ کسی کے ذریعے نہیں کہی جا سکتی۔

حکیم احسن اللہ: یہ کون سی ایسی نازک پیچیدہ بات ہے جو کسی دوسرے کے ذریعے بیان ہی نہیں ہو سکتی؟

رجب علی: انھوں نے لڑائی میں شریک ہونے کی نیت کی ہے اور چاہتے ہیں کہ انھیں اور ذمے داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے۔ آپ کے یہاں سے ان کا جو رشتہ ہونے والا تھا وہ نہ ہو سکے گا۔

حکیم احسن اللہ: کیوں یوسف، کیا یہی بات ہے؟

محمد یوسف: جی ہاں۔

حکیم احسن اللہ: اور یہ بات تم مجھ سے نہیں کہہ سکتے تھے۔

محمد یوسف: کہہ سکتا تھا۔

حکیم احسن اللہ: پھر تم نے رات کو دیوار پر چڑھنے کا کرتب خواہ مخواہ دکھایا۔ اچھا، جاؤ، ہمارا تم پر کوئی حق نہیں اور تمھارا ہم پر کوئی حق نہیں ہے (سلمیٰ کھڑی ہو جاتی ہے اور دالان کی طرف اس طرح لپک کر جاتی ہے کہ محمد یوسف کے آگے رہے) سلمیٰ، تم کہاں جاتی ہو؟

سلمیٰ: جہاں میرا جانا طے ہوا تھا۔

حکیم احسن اللہ: وہاں جا کر کیا کرو گی، وہاں اب تمھاری ضرورت نہیں ہے۔

سلمیٰ: ہے!

حکیم احسن اللہ: کیوں، میاں یوسف، ان کی ضرورت ہے؟

محمد یوسف: جی ہاں، ہے۔

حکیم احسن اللہ: ارے میاں، کیا بالکل دیوانے ہو گئے ہو؟ ابھی خود ہی قبول کیا ہے کہ رات کو چوروں کی طرح یہ کہنے آئے تھے کہ تمھارا ان کا رشتہ نہیں ہو سکتا۔

محمد یوسف: جی ہاں، وہ بات بھی ٹھیک ہے۔ یہ رشتے کرنے کا وقت نہیں ہے۔

حکیم احسن اللہ: تو کیا مطلب ہے۔ لڑکی کو باغیوں کی چھاؤنی میں لے جا کر چھوڑ دو گے؟

محمد یوسف: لڑکی خود طے کرے گی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

حکیم احسن اللہ: یہ لڑکی۔ سلمیٰ؟

محمد یوسف: جی ہاں۔

حکیم احسن اللہ: سلمٰی سنا یہ کیا کہہ رہے ہیں؟

سلمٰی: جی ہاں۔

حکیم احسن اللہ: تو پھر ان کے ساتھ جاؤ گی؟

سلمٰی: جی ہاں۔

حکیم احسن اللہ: (بہت غصے میں) اچھا، جاؤ، دور ہو یہاں سے!

(اس دوران دالان کی طرف شور ہونے لگتا ہے۔ کچھ سپاہی اندر گھس آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نشے میں معلوم ہوتے ہیں۔ سلمٰی انھیں دیکھ کر پیچھے ہٹتی ہے اور احسن اللہ کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے)

پہلا سپاہی: کون ہے تم میں سے احسن اللہ؟

رجب علی: تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟ تم کو کس نے بھیجا ہے؟

دوسرا سپاہی: تم بتاؤ، تم کون ہو؟

رجب علی: میں شہر کا کوتوال ہوں۔ اگر تم نے یہاں کوئی شرارت کی تو تمھاری اچھی طرح خبر لوں گا۔

دوسرا سپاہی: ہو گے تم کوتوال، اس وقت تو تم نہتے ہو۔

(ایک سپاہی رجب علی کی طرف بڑھتا ہے، ایک احسن اللہ کی طرف۔ باقی کچھ تماشا دیکھنے کھڑے ہو جاتے ہیں، کچھ گھر کی تلاشی لینے لگتے ہیں۔ جو سپاہی احسن اللہ کی طرف بڑھتا ہے اسے سلمٰی لپک کر خنجر مارتی ہے۔ وہ چلا کر الگ ہو جاتا ہے۔ دوسرے سپاہی پر محمد یوسف اور رجب علی بڑھتے ہیں۔ وہ بھاگ کر الگ کھڑا ہوتا ہے)

تیسرا سپاہی: ارے لاؤ بندوقیں کہاں ہیں۔ ان چاروں کو دیوار سے لگا کر کھڑا کرو اور مارو ایک باڑھ۔

چوتھا سپاہی: (دالان کی طرف سے آتے ہوئے) خبردار! یہاں بندوق وندوق نہ چلانا۔ سدھاری سنگھ ایک پلٹن کے ساتھ محلے میں چکر لگا رہا ہے۔ آواز سنتے ہی پہنچ جائے گا۔

تیسرا سپاہی: پہنچ جائے گا تو ہمارا کیا کرلے گا۔

چوتھا سپاہی: جیسے تم ان لوگوں کو کھڑا کرنا چاہتے ہو ویسے ہی وہ تم کو کھڑا کرکے بندوق سے اڑا دے گا۔ اب تم ڈھٹائی نہ کرو۔ جو کچھ ہاتھ لگے چپکے سے لے کر کہیں اور چلو۔

زخمی سپاہی: اور اس کتیا نے میرے جو دانت مارا ہے اس کا کوئی بدلہ نہیں لے گا۔

سلمٰی: (سپاہی کی طرف جھپٹ کر) دانت مارنے کا بدلہ کیا لے گا۔ جان کا لے۔

(زخمی سپاہی گھبرا کر پیچھے ہٹتا ہے۔ محمد یوسف لپک کر اس کے اور سلمٰی کے درمیان آجاتا ہے)

پانچواں سپاہی: (دالان کے اندر سے) ارے اب یہاں سے بھاگ نکلو یا دبک کے بیٹھ جاؤ۔ سدھاری سنگھ آپہنچا ہے۔

تیسرا سپاہی: کم بخت یہ سوچتا ہی نہیں کہ ہم لڑتے ہیں تو ہمیں بھی کچھ ملنا چاہیے۔

پانچواں سپاہی: لو، وہ سیدھا یہیں آ گیا۔

(سپاہی سب پیچھے کی طرف جمع ہوجاتے ہیں، احسن اللہ، رجب علی، محمد یوسف، اور سلمٰی بائیں طرف، آگے۔ سدھاری سنگھ چار مسلح سپاہیوں کے ساتھ اندر آتا ہے)

سدھاری سنگھ: ولی داد، رحیم، سکھدیو، بندوقیں تان کے کھڑے ہوجاؤ۔ ان میں سے کوئی ذرا بھی ہلے تو فوراً گولی مار دینا۔ ہیرا، انھیں ایک ایک کرکے بلاؤ اور ہتھکڑی بیڑی ڈال دو۔ پھر وردیاں اتار لینا۔ جلدی!

(سپاہی حکم کے مطابق کرتے ہیں۔ جب وہ فارغ ہوجاتے ہیں تو اس کی طرف رخ کرکے ایک قطار میں کھڑے ہوجاتے ہیں)

سدھاری سنگھ: ولی داد، سکھدیو، لے جاؤ ان کو، سنتوش پانڈے کے سپرد کردینا۔ کہنا انھیں فوراً پھانسی دیں۔ اور ڈھنڈورا پٹوا دیں کہ لٹیروں کو پھانسی دی جارہی ہے۔ جسے یقین نہ آئے آکر دیکھ لے۔

(ولی داد اور سکھدیو قیدیوں کو لے کر چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد

سدھاری سنگھ آہستہ آہستہ اس طرف آتا ہے جہاں احسن اللہ، رجب علی، محمد یوسف اور سلمیٰ سب کھڑے ہیں۔ رفتار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت تھکا ہے۔ ان لوگوں کو پہچان کر وہ فوجی سلام کرتا ہے)

سدھاری سنگھ: میں بہت معافی چاہتا ہوں کہ ان لٹیروں نے آپ کو اتنی تکلیف پہنچائی۔ دس کے گولی مار چکا ہوں، دو کو بازار میں پھانسی دے چکا ہوں، مگر یہ کم بخت کسی طرح مانتے ہی نہیں۔

حکیم احسن اللہ: ہم لوگوں کو آپ نے بچالیا۔ یہ ایک احسان ہے جو ہم کبھی نہ بھولیں گے۔ آپ یہ یاد رکھیے کہ بغاوت کے ساتھ لوٹ مار لازمی ہے۔ جو لوٹ مار کو پسند کرتا ہوا سے بغاوت نہ کرنا چاہیے۔

سدھاری سنگھ: آج رات تک ہم باغی کہے جا سکتے تھے۔ اب ہم مغل شہنشاہ کے فوجی ہیں۔ اب باغی وہ ہے جو ہم سے لڑے، چاہے وہ ہندوستانی ہو یا انگریز۔ جو ہمارا ساتھ نہ دے وہ غدار ہے۔

محمد یوسف: (آگے بڑھ کر) جرنیل صاحب، آپ بہت تھکے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے پلنگ پر بیٹھ جائیے اور آرام کر لیجیے۔

سدھاری سنگھ: میں بیٹھوں گا تو لیٹ جاؤں گا، اور لیٹا تو سو جاؤں گا۔ پھر معلوم نہیں کب آنکھ کھلے۔ اب اسی وقت آرام کروں گا جب شہر کی حفاظت کا انتظام ہو جائے۔

رجب علی: میں کوتوال ہوں، شہر کی حفاظت کا انتظام کرنا میرا کام ہے۔ اب آپ میرے ساتھ کوتوالی چلیے، مجھے سو دو سو سپاہی بلا دیجیے، میں شہر کی ناکہ بندی کر کے لُوٹ مار بند کرا دوں گا۔

سدھاری سنگھ: اس وقت کوئی کسی کا حکم مان ہی نہیں رہا ہے۔ مجھے بیس پچیس فرماں بردار سپاہی مل گئے تھے، انھیں کو لے کر دورہ کر رہا ہوں۔ اب وہ بھی دو دو چار چار کر کے تقسیم ہو گئے۔ گھروں کے اندر لٹیروں کو گولی نہیں مار سکتا، انھیں حوالات میں پہنچانے کے لیے بھی آدمی چاہیے۔

محمد یوسف: اگر آپ ہتھیار دینے کا انتظام کر سکیں تو میں آدمی فراہم کر سکتا ہوں۔

سدھاری سنگھ: جی ہاں ہتھیار مل سکتے ہیں۔

محمد یوسف: تو پھر آپ کو تو انی چیئے ۔ میں پچاس آدمیوں کو لے کر آتا ہوں۔ یا آپ مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے ہتھیار دے دیں تو میں ایک ساتھ دونوں کام کرلوں۔

سدھاری سنگھ: آپ مناسب سمجھیں تو ہتھیار لے لیجیے۔ آپ کو میں اس کا اختیار دیتا ہوں کہ جس سپاہی کو لوٹ مار کرتے دیکھیں اس کو وہیں گولی مار دیں۔ رحیم، ہیرا، چلو اب چلیں۔

(سلمیٰ لپک کر پلنگ پر سے چادر اٹھاتی ہے اور اسے لپیٹتی ہوئی دالان کی طرف سے چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد محمد یوسف، رجب علی، سدھاری سنگھ اور سپاہی سب اسی طرف سے جاتے ہیں، احسن اللہ اکیلا کھڑا رہ جاتا ہے)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

(ایک بڑادالان جس میں قالین بچھے ہیں اور گاؤ تکیے رکھے ہیں۔ ایک طرف جنرل بخت خاں بہت نیچے تخت پر بیٹھا ہے اور ایک رپورٹ پڑھ رہا ہے۔ پاس ایک واقعہ نویس کھڑا ہے۔ سامنے کرنل گوری شنکر، سدھاری سنگھ، محمد یوسف، راجا نہار سنگھ، رام سہائے مل، رجب علی، چار منشی اور دو واقعہ نویس بے ترتیبی سے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف کچھ سپاہی کھڑے ہیں۔)

بخت خاں: (کاغذات کو ایک طرف پھینک کر) ای پھوج ماں سسر کوئی ہمرا کہا نا ہیں مانت ہے۔ بڑے بہادر بنت ہیں، اکڑ کے چلت ہیں تو مالوم پڑت ہے دنیا فتح کر لے ہیں، پھر سب پیٹ پھِرائے کے بھاگ آوت ہیں۔ گوری شنکر بھیا، ہم کے رہن اِتے ادمی نہ بھیجو۔ تم ہوں ہمری بات نا ہیں سنیو۔

گوری شنکر: جنرل صاحب، میں بالکل مجبور ہوں۔ میں پانچ سپاہی بھیجتا ہوں تو ان کے ساتھ پچاس غازی اور مجاہد اور دھرم دیجے کے آرزو مند لگ جاتے ہیں۔ ان کو ہٹانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ سنگینوں سے وہ ڈرتے نہیں ہیں، اور اتنا گولا بارود ہمارے پاس ہے نہیں کہ

ان پر بھی صرف کریں۔

بخت خاں: یو کا کہیو۔ اپنے بھائی بندن کا کو مارت ہے۔

راجا نہار سنگھ: جنرل صاحب، میں نے عرض کیا تھا کہ مجھے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ان مجاہدوں اور غازیوں کو تھوڑی سی قواعد کرا کے میرے پاس بھیج دیں تو میرے، بہت سے کام نکل جائیں۔

بخت خاں: ہاں بھیا راجا صاحب، تم تو کہے رہو...... پھر بھوا کا؟ بیٹا سدھاری سنگھ، کا ہم تم سے کہے رہن اکی کوائد کا انتجام کراؤ۔

سدھاری سنگھ: جی ہاں، آپ نے فرمایا تھا۔ میں نے اسی روز قریب پانچ سو آدمیوں کو گھیرا۔ جب ان کا ایک ایک کر کے معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کسی کو پیچس ہے، کسی کو تپ دق ہے، کسی کو فصلی بخار رہتا ہے، اور سب فوجی معیار کے مطابق کمزور ہیں، پانچ سو میں سے تین سو کے قریب الگ کر دیے گئے۔ جو دو سو بچے ان میں سے قریب ڈیڑھ سو نے کہا کہ ہم بیوی بچے والے ہیں، ہم چھاؤنی میں نہیں رہ سکتے۔ بعض نے کہا ہم چھاؤنی میں رہ سکتے ہیں اگر ہمارا کھانا ہمارے گھروں سے آیا کرے۔ آخر میں پچاس آدمی ہاتھ لگے۔ ان کو قواعد کرائی جارہی ہے اور یہ اچھے خاصے سپاہی بن گئے ہیں۔ یوسف بھائی ان کے سردار ہیں۔

بخت خاں: بیٹا پانچ سو ماں سے پچاس اچھے سپاہی تم کا مل گئے تو بہت ملے۔ جب ہم پھوج ماں بھرتی بھئے رہن تو کوئی ہجار ادمی چن چن کے پکڑی اوار ہے۔ اوماں سے مسکل سے سو ادمی نکلے رہیں۔ یوسف بھیا، تم ای پچاس کا کیسا پایو۔

محمد یوسف: میں نے تو ان کو بہت اچھا پایا۔ مورچوں پر گولہ باری کے وقت یہ جے رہے، حملے کیے، حملے روکے، جو حکم دیا گیا ویسا کیا۔

گوری شنکر: مگر ان میں سے کتنے غازی اور مجاہد ہیں؟

محمد یوسف: غازی کتنے ہیں یہ میں نہیں جانتا، مجاہد سب ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ کن حالات میں لڑنا ہے، جیتنے کی امید کتنی ہے، ہار گئے تو انجام کیا ہوگا۔ مگر سب خوش رہتے ہیں، جان پر کھیل

کرلڑتے ہیں، اپنے زخموں کو بڑے گھمنڈ کے ساتھ گناتے ہیں، شہریوں کی ہر طرح سے مدد کرنے پر تیار رہتے ہیں، حکم ماننے میں کبھی تامل نہیں کرتے۔ میرے خیال میں شریف سپاہی ایسے ہی ہو سکتے ہیں۔

بخت خاں: بھیا گوری شنکر، ہم کا مالوم پڑت ہے کہ تمرے اپنے دل ماں چور ہے۔ جب تم کہیں لڑے جات ہو تو گاجی مجاہد تمرے ساتھ لگ جات ہیں، سدھاری سنگھ اور یوسف بھیا کبھو ں ہم سے ایکی سکایت ناہیں کہن، اور پھر جہاں تم لڑت ہو ہمرے ادمی بہت جایع جات ہیں۔ سدھاری سنگھ، اب تنیں تم ان کی جگہ کام کری کے دیکھو۔ کاگذ تیار کری دیو تو ہم دسکھت کردین۔

سدھاری سنگھ: (کھڑے ہو کر سلام کرتے ہوئے) حضور، میں اکیلا اس کام کو سنبھال نہ سکوں گا۔ میرے ساتھ کپتان محمد یوسف صاحب کو بھی لگا دیجیے تو ہم آپس میں کام تقسیم کر کے سب آپ کے حسب منشا کرلیں گے۔

بخت خاں: اچھا بیٹا، یہو کر کے دیکھ لیو۔ (سدھاری سنگھ پھر سلام کرتا ہے) راجا صاحب، تمری بات تو رہین گئی۔ تم کا کتنے ادمین کی جرورت ہے؟

راجا نہار سنگھ: جنرل صاحب، مجھے آدمیوں کی ضرورت تو ہے، مگر جاٹوں کو تو آپ جانتے ہیں۔ کسی کو بھی پکڑ کر وردی پہنا دو، سپاہی بن جاتا ہے۔ اصل میں مجھے روپے کی ضرورت ہے۔

بخت خاں: یہ بات ہم سے کاہے کہت ہو، سیٹھ رام سہائے مل تو بیٹھے ہیں۔

رام سہائے مل: (ہاتھ جوڑ کر) جنرل صاحب، اب میں نے کاروبار چھوڑ دیا ہے۔ آپ میرا گھر لے لیجیے، بہی کھاتے لے لیجیے۔ جہاں جو کچھ نکلتا ہو، میری طرف سے دان سمجھیے، میں اب ہار گیا۔ آپ کے یہاں آتا ہوں تو قاعدے سے روپیہ مانگا جاتا ہے، گھر جاتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے لٹیرے آئے تھے، گھر کی دھول تک چھلنی سے چھان گئے۔ میرے حال کا لوگوں کو دور دور تک پتہ ہو گیا ہے۔ میری ساکھ جاتی رہی ہے۔

بخت خاں: سیٹھ صاحب، یو ہم کا سب مالوم ہے۔ تمرے پاس گھر ماں کچھ نا ہوئی ہے، بہی کھاتے تمرن ادمی لکھت ہیں۔ ہم یو ناہیں سمجھت ہیں کہ تمرے ہیاں اسرفین کے توڑے رکھے

ہیں۔ تم کا مال کا لین دین کرنا آوت ہے، ہم کا ناہیں آوت ہے۔ تم جانت ہو کہ کون سی بستی ماں کون سا آدمی بیوپار کے کام کا ہے، کون ناہیں ہے۔ ہم ایک بکھت کی ترکاری بجار ماں لے جان تو نہ مالوم کا اٹھائے لاون۔ یہی مارے تو ہم تمرا سہارا ڈھونڈھت ہن۔ تم کہہ دیو کہ رسد ناہیں آئے سکت ہے تو ایسن ہوئی ہے جیسے ہمرے سدھاری سنگھ کہد یں کہ اب ان سے لڑا ناہیں جات ہے۔ رہا شہرن کا مالمہ، تو ای ماں بھیا گوری شنکر ہم سے بہت جادہ جانت ہیں۔ یہ بات اِن سے کہو۔

گوری شنکر: جنرل صاحب، یہ بہت بھاری الزام ہے (کھڑے ہو کر) اگر آپ کو مجھ پر اس طرح کے شبہے ہیں تو مجھے چلے جانا چاہیے۔

بخت خاں: بھیا الجام تو ہم جانت ناہیں ہیں، ہم تو جانت ہیں کہ سہر ماں لوٹ مار بند ہوئی گئی رہے۔ (گوری شنکر سلام کر کے چلا جاتا ہے) ہاں، تو سیٹھ صاحب پھر بتاؤ راجہ صاحب کا کھرچ کیسے دیں۔ اِن کا آج کل ماں بیس پچیس ہجار تو دے ہیں دیو۔

رام سہائے مل: جنرل صاحب، میں اتنے روپے کہاں سے لاؤں؟

بخت خاں: وہی جو سدھاری سنگھ کا سپاہی بنائس ہے، تم کا سیٹھ بنائس ہے۔ وہی سے پوچھو کہ روپیہ کہاں سے آوے۔ مُل راجا صاحب کا روپے بھئی جرور مل جائیں۔ اِی ہیاں بیٹھے امیدواری کری ہیں تو متھرا کا رستہ بند ہوئی جئی ہے...... راجا صاحب، پھر آپ سام کا سیٹھ صاحب کے ہیاں چلے جائیو۔ ان کا دل بہت بڑا ہے...... اچھا، سیٹھ صاحب، آپ چاہیں تو جائے سکت ہیں۔ راجا صاحب، آپو اب اپنا کام کریں۔

(ایک سپاہی اندر آتا ہے اور بخت خاں کو سلام کرتا ہے۔ راجا نہاؔل ھ اور رام سہائے مل سلام کر کے چلے جاتے ہیں)

سپاہی: حضور، ایک مولوی صاحب ابھی آئے ہیں۔ کہتے ہیں آپ سے فوراً ملنا ہے۔

بخت خاں: ایک اور مولبی صاحب؟ اچھا بھیا، اُنہوں کا بلائی لیو۔ (سپاہی چلا جاتا ہے) یوسف بھیا، کا ہم جھک مارے کے لیے داڑھی بڑھائے رہن۔ ہم کا کبھوں کوئی مولبی نہیں کہس۔

محمد یوسف: جنرل صاحب، میں نے سنا ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کسی سید کو بہادری کا انعام نہیں دیا کرتا تھا۔

سدھاری سنگھ: جنرل صاحب، یہ سوال آپ نے یوسف بھائی سے کیوں کیا، مجھ سے کیوں نہیں کیا۔

بخت خاں: مولبی سے دھوکا مسلمانے کھات ہے۔

(ایک تیس برس کا آدمی جس کی وضع قطع مولویوں کی سی ہے، داخل ہوتا ہے اور زور سے السلام علیکم کہتا ہے۔ بخت خاں جواب دینے سے پہلے تھوڑی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

بخت خاں: بالیکم، بھیا، کہو۔

مولوی: مجھے حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے بھیجا ہے۔

بخت خاں: ہاں بھیا۔

مولوی: حضرت مولانا کا خیال ہے کہ اس قومی جنگ کے جتنے رہنما ہیں انھیں موقع نکال کر ایک جگہ جمع ہونا چاہیے، تاکہ سب ایک طریقے پر لڑ سکیں۔

بخت خاں: اور انگریج چاہیں تو سب سسرن کا ایک ساتھ پکڑ لیں۔

مولوی: اگر ٹھیک انتظام کیا جائے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔

بخت خاں: بھیا ہم ہیاں بیٹھے ہیں۔ یا سے پہاڑی پر انگریجن کی پھوج ہے۔ ہمری سب باتیں ان کا مالوم ہوئی جات ہیں۔ اچھا، اور کا؟

مولوی: حضرت مولانا فرماتے ہیں چار پانچ شہروں میں بند ہو کر انگریزوں سے لڑنا غلط ہے۔ اس طرح سے ہم ان کو موقع دیتے ہیں کہ اپنی فوجیں دور دور سے بلا لیں۔ ہم کو ملک میں پھیل کر لڑنا چاہیے۔

بخت خاں: بھیا ہم ہوں سوچا کرت ہیں کہ سہرن ماں بند ہوئی کے لڑنا ٹھیک نا ہیں ہے۔ اب ہیاں دلی ماں دیکھو۔ پھوج کا پیٹ بھرنا مسکل ہے، اور پھوج کا پیٹ بھر جائے تو ہوئی سکت ہے ای لاکھوں سہر والے بھوکے رہیں۔ مُل تم ہی دیکھو، جو ہم دلی چھوڑ کے چلے

جان تو، تو کا ہوئی ہے۔ سہر انگریجن کا ہوئی جئی ہے، ہم چورن ڈاکون کی تنا جنگل ماں
مارے مارے پھربا...... نا بھیا، ہم کا تو ہمیں رہے دیو۔ جب تلک دم ہے لڑی با،
پھر دیکھا جئی ہے۔

مولوی: تو میں حضرت مولانا سے کیا کہہ دوں؟

بخت خاں: ارے بھیا، کا تم ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوئی کے آئے رہو۔ تنی بیٹھو، آرام کرو، بتاؤ مولانا
صاحب کا مجاج کیسا ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرو۔

مولوی: حضرت مولانا نے فرمایا تھا کہ مشورہ کر کے جلد سے جلد واپس آؤ۔

بخت خاں: بھیا، ہم ہوں مولانا صاحب کی کھدمت ماں رہ چکے ہیں۔ وی ایسے ادمی نہیں ہیں کہ اِتی
سی بات کہے کے لیے کوئی کا دو سو میل دوڑائی دیں۔ تم ہو بھیا پورے مولبی۔ بتاؤ ٹھیک
ٹھیک تم کا کچھ لکھ کے کاہے کا نہیں دہن۔

مولوی: (گھبرا کر) اس کے لیے وقت نہیں تھا۔

(سب ہنستے ہیں)

بخت خاں: امیں جاؤ بھی۔ معلوم ہوت ہے تم کوئی مہاگا جی ہو، اللہ کی راہ ماں گھوڑا سرپٹ دوڑائے
بگیر مجا نا ہیں آوت ہے۔ مولانا صاحب کی کوئی بات سن لیو، کہیو چلو بکھت کھاں سے
مسورہ کر لین۔ اب ہیاں سے بھاگ کے جئی ہو، کہیو حجرت مولانا صاحب، بکھت
کھاں تو یو کہت ہے۔ اب کا کریں (بخت خاں مولوی کی طرف غور سے دیکھتا ہے۔
مولوی کی کیفیت ایسی ہے کہ سب ہنسنے لگتے ہیں) تو کا تم سچ مچ ابھی میں چلے جئی ہو؟

مولوی: جی ہاں، مجھے تو فوراً واپس جانا ہے۔

بخت خاں: تو بھیا یوسف، تنیں مولانا صاحب کا ایک اچھا سا کھت لکھ دیو۔ جی ماں ان کا معلوم ہوئی
جائے کہ دلی ماں اچھے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ان کا سب حوال بتائی دیو، اور لکھ دیو کہ
جیسا آپ پھرمئی ہیں ویسن ہوئی ہے۔ ہمرے دل ماں ان کی بڑی عجت ہے۔

محمد یوسف: بہت اچھا، حضور۔

بخت خاں: (مولوی سے) اوتم بھیا تب تک باہر بیٹھو۔

(مولوی چلا جاتا ہے۔ محمد یوسف ایک واقعہ نویس کو اشارہ کرتا ہے، اور دونوں الگ جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ واقعہ نویس بستے سے ایک کاغذ نکالتا ہے، اور محمد یوسف جو کچھ بولتا ہے اسے وہ لکھتا جاتا ہے۔ اسی دوران اللہ اکبر، نصر من اللہ و فتح قریب کے نعرے سنائی دیتے ہیں، اور پرانے طریقے پر مسلح مردوں عورتوں کی ایک ٹولی اندر آتی ہے۔ بخت خاں کو دیکھ کر سب بہت زور سے 'السلام علیکم' کہتے ہیں۔ بخت خاں انھیں دیکھ کر مایوسی کے انداز میں سر ہلاتا ہے)

بخت خاں: بالیکم، بالیکم، کہو، کون سے ملک سے آئے ہو؟

ایک جہادی: ہم ٹونک سے جہاد کرنے آئے ہیں۔

بخت خاں: ٹونک، ٹونک، وہی ٹونک ناجہاں اِی سسرے انگریج ایک ٹھگ کا نواب بنائی دہن رہیں؟ کا تم کا ؤنی بھے جس ہے۔

جہادی: جی نہیں۔ نواب امیر علی خاں کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہمارا نواب صاحب سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم دین کی خاطر لڑنے اور جان دینے آئے ہیں۔

بخت خاں: تو اِتّی دور کا ہے کا آیو بھیا۔ کاہواں کتل کرے کے لیے تم کا کوؤ ناہیں ملا؟

جہادی: ہم عیسائی حکومت سے اور انگریزوں سے لڑنے آئے ہیں۔

بخت خاں: مُل بھیا، ہمری پھوج ماں ہندو مسلمان سبھے ہیں، یو ناہیں ہوئی سکت ہے کہ لڑے ہندو اور جیتو تم، مرے ہندو اور جنت ماں جاؤ تم۔ جو ہیاں دلی ماں رہنا چاہت ہو تو بھیا اپنے حصے سے جیادہ نہ مانگو۔ ہم نہ کوؤ کے ساتھ رعایت کر بانہ کوؤ کا جنت پہنچا دے کا جتن لیبا۔

جہادی: جی نہیں، ہم کوئی رعایت نہیں چاہتے۔ ہم آخر دم تک لڑنے کی نیت کر کے آئے ہیں۔

بخت خاں: جی تا ہم کہن ویسن لڑی ہو؟

جہادی: جی ہاں۔

بخت خاں: یو سمجھو بھیا کہ اللہ کا نام لینا ہم ہوں کا آوت ہے۔ جو تم کہانہ منی ہو تو ہم اللہ کا نام لے کے

تم کا بندوق سے اڑائی دیا۔

جہادی: جی ہاں، ہمیں منظور ہے۔

بخت خاں: تو بیٹا سدھاری سنگھ، ای ماں سے جو کام کے ہوئیں ان کا چھانٹ لیو۔ جو کام کے نہ ہو ہیں ان کا قلعے میں پہرا دے کے لیے بڈھو کے پاس بھیج دیو۔ (سدھاری سنگھ کھڑے ہو کر سلام کرتا ہے) اور ای مہریاں کا ہے کا آئی ہیں؟

جہادی عورت: ہم بھی مردوں کے ساتھ لڑیں گے اور مریں گے۔

بخت خاں: بٹیا مرے کا ہوئے تو اپنے گھر جاؤ، آرام سے پلنگ پر لیٹ کے مرو۔ ہمرے سامنے مری ہو تو نہ ہمرا کوئی پھائدہ ہوئی ہے نہ تمرا۔ اور یو ہم سے کہو نا کہ تم سپاہن کی طرح لڑ لے ہو۔ یو تمرا کام نہ ہوئے۔

جہادی عورت: آپ ہمیں میدان میں بھیج کر دیکھ لیجیے۔

بخت خاں: میدان ماں ہم تم کا ایس نہ بھیج دیبا۔ پہلے لڑنا سیکھو۔ تب مرنا ای ہے۔ او یو جانو ہمرے پاس مردن کی کوئی کمی ناہیں ہے۔ تو بٹیا پہلے تم کوائد سیکھو۔

جہادی عورت: ہم فوجی قواعد سیکھنے کے لیے تیار ہیں۔

بخت خاں: اچھا بل یو کہے دیت ہن اکی جو مہریا کوائد نہ کری پائی ہے او کا چولھا جھونکے پر لگائی دیبا۔

(منی اندر آتی ہے اور جہادی عورتوں کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ ایک سبز چادر لپیٹے ہے)

جہادی عورت: ہمیں ہر شرط منظور ہے۔

بخت خاں: یوسف بھیا، کا تم ان کا سنبھال لے ہو؟

محمد یوسف: جی ہاں، منی بیگم نے ایک محلے میں سپاہی عورتوں کے لیے انتظام کیا ہے۔ (منی کو دیکھ کر) دیکھیے وہ آ بھی گئی ہیں۔

بخت خاں: یہ منی بیگم کون ہوئے۔

منی: (آگے آ کر فوجی سلام کرتی ہے) حضور، میں تو شروع سے فوجی خدمت کر رہی ہوں۔

بخت خاں: ہم اکووَ ناہیں بتائیں۔

محمد یوسف: حضور، انھوں نے ہم سب سے قسم لے لی تھی کہ آپ کے سامنے ان کا ذکر نہ کریں گے۔

بخت خاں: کا ایسیو مہریاں ہوت ہیں؟

٭ ا: جی ہاں، ایسی بھی ہوتی ہیں۔ ہمارے ساتھ راجا نہار سنگھ صاحب کی رانی کشن کنور بھی لگی رہتی ہیں۔ محمد یوسف صاحب کی منگیتر سلمٰی بیگم کل میرے ساتھ کشمیری دروازے کے مورچے پر تھیں۔ پہلی مرتبہ زخمی ہوئیں۔ بہت خوش تھیں۔

بخت خاں: (منی کو غور سے دیکھ کر) سنو ہو، کا نج پوس تم ہیں کہلاوت ہو؟

منی: جی نہیں، وہ تو ستر برس کی بڑھیا ہے۔

بخت خاں: او تم ای بکھت جوان ہو...... اچھا بٹیا، اپنی بہنن کا لیے جاؤ۔

(سب عورتیں باہر چلی جاتی ہیں)

محمد یوسف: (جہادیوں سے) آپ لوگ بھی باہر جا کر انتظار کیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ (پھر خط لکھوانے لگتا ہے۔ جہادی باہر چلے جاتے ہیں)

بخت خاں: بھائی رجب علی، یہ کھتا معاف نہ ہوئی ہے۔

رجب علی: کون سی خطا؟

بخت خاں: اینہیں دیکھے رہو۔ ای جہادی، ای مہریاں۔ کووَ کا یو ناہیں معلوم ہے کہ لڑائی کیسے لڑی جات ہے۔ مُل جان دے پر سب تیار ہیں۔ او ہم ہیاں بیس پچیس ہجار سپاہی لیے بیٹھے ہن۔ اور انگریج پہاڑی سے ہٹائے ناہیں جات ہیں۔ جو ہم ماں کووَ کابلیت ہوئے تی۔

رجب علی: جنرل صاحب، آپ میں قابلیت کی کمی نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ بندھے ہیں۔ سرکار عالم بوڑھے اور کمزور ہیں۔ شہزادے سب نکمے ہیں، اور مرزا الٰہی بخش تو کھلے بندوں ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کی طرف سے ہم کو نقصان پہنچانے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ پھر شہر میں غنڈے اور لٹیرے اتنے ہیں کہ کسی بات کا انتظام کرنا، دو چار دن اطمینان سے جنگ کی طرف توجہ کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ آپ کریں تو کیا کریں۔

بخت خاں: ناہیں، رجب علی بھائی، یہ سب ہمت اور کابلیت کی کمی ہے۔ ہم ہیں سے کچھ ناہیں بنت ہے۔

(ہرکارہ اندر آ کر سلام کرتا ہے)

ہرکارہ: سرکار عالم نے سپہ سالار اعظم صاحب کو یاد فرمایا ہے۔

بخت خاں: لیو، ہم کا بڑھوؤ بلائے کھچن ہیں۔ (ہرکارہ سے) اچھا بھیا، اچھا۔ کہہ دیو، ابہن آوت ہیں۔ (ہرکارہ چلا جاتا ہے) بھائی رجب علی، تیئں گوری شنکر کا نجر ماں رکھیو۔ بہت نکسان پہنچائی رہا ہے۔

رجب علی: جنرل صاحب، وہ شہزادہ الٰہی بخش کی طرح ہمارے بیچ میں ایسے قدم جمائے ہے کہ ہمارے ہٹائے نہیں ہٹ سکتا۔ اس کے خلاف آپ نے کچھ کیا تو دلی کے سیٹھ سب بگڑ جائیں گے۔

بخت خاں: ہاں، یو تو ہے۔ (کھڑے ہوکر) اچھا رجب علی بھائی، اب تیئں بڑھوؤ کے پاس ہوئی آون (کچھ سوچ کر) ارے ہاں، بیٹا سدھاری، تیئں پاس آئی جاؤ۔ اور یوسفو۔ بھیا کا بلائی لیو۔ (دونوں اس کے پاس آجاتے ہیں) دیکھو، اب رسد کی بڑی مسکل ہوت جات ہے۔ اب تم ایسا کرو رسد کے لیے ایک ایک دوئی دوئی پلٹنیں ادھر ادھر بھیجو۔ مگر ای تنا کہ گوری شنکر کا پتہ نہ چلے۔ نہیں تو سب پکڑے جئیں ہیں۔ راجا صاحب سے پوچھ لیو کہ کہاں کہاں پلٹنیں بھیجی جائیں۔ گلہ لادے کے لیے پورا سامان کر لی ہو۔

رجب علی: کچھ باتیں میں بھی بتا سکتا ہوں۔ مجھ سے بھی مشورہ کر لیجیے گا۔

بخت خاں اچھا، تو تم تینوں بیٹھ کے طے کر لیو۔ پھر ہم کا بتائی دیہو۔ پلٹنیں نئے رنگروٹن کی بنائیو۔

محمد یوسف اور سدھاری سنگھ: (ایک ساتھ) بہت مناسب ہے۔

(بخت خاں اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ دو سپاہی اس کے ساتھ جاتے ہیں)

رجب علی: اب حالت بہت نازک ہوگئی ہے۔

سدھاری سنگھ: حالت اچھی کب تھی؟

رجب علی: پہلے جنرل صاحب بدانتظامی پر الجھتے تھے، اب مایوس معلوم ہوتے ہیں۔

سدھاری سنگھ: یہ وہ کبھی نہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم لڑائی میں جیت جائیں گے۔ وہ بڑی عمر کے اور تجربے کار آدمی ہیں۔ یہ تو میرے جیسے جوشیلے اور ناتجربہ کار آدمی بھی نہیں سمجھتے تھے کہ ہمیں کامیابی ہوگی۔

رجب علی: ہوں، شاید اس وقت انھیں اس بات کا خاص طور پر افسوس ہے کہ جو روشنی انھیں ان جہادیوں کی آنکھوں میں نظر آئی تھی وہ بجھ جائے گی۔

(پردہ)

چوتھا ایکٹ

دہلی کے محاصرے کے آخری دن ہیں۔ فوج اور حکومت کا جو بھی نظام تھا، درہم برہم ہوگیا ہے۔ صبح تڑکے سدھاری سنگھ اور محمد یوسف شہر کے شمالی اور شمال مغربی حصے کا دورہ کر رہے ہیں، جگہ جگہ جاتے ہیں، اور جیسا مناسب معلوم ہوتا ہے حکم دیتے ہیں۔ دونوں وردیاں پہنے ہیں اور مسلح ہیں۔

پہلا سین

(چوراہا: سدھاری سنگھ اور محمد یوسف ایک طرف کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر میں چند برقع پوش سامنے سے گزرتے ہیں۔ ان کے بھاری بھرکم جسموں اور چال ڈھال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرد ہوں گے۔)

محمد یوسف: (آگے بڑھ کر اور انھیں سامنے کی طرف سے روکتے ہوئے) ٹھہرو، کہاں جاتے ہو!

(سدھاری سنگھ برقع پوش کو پیچھے سے گھیر لیتا ہے)

پہلا برقع پوش: (زنانی آواز میں) بھیا میں غریب بڑھیا ہوں......

محمد یوسف: اچھا، نانی اماں، ذرا شکل تو دکھاؤ!

(محمد یوسف برقع نوچ لینا چاہتا ہے، مگر وہ اترتا نہیں۔ وہ برقع پوش کے سر پر پستول کا دستہ مارتا ہے، اور جب وہ گر پڑتا ہے تو پیروں کی طرف سے برقع اٹھاتا ہے۔ باقی برقع پوش سہمے کھڑے رہتے ہیں)

ارے یہ تو سپاہی ہے! اچھا، اب اس کی نوبت آگئی کہ عورتوں کا بھیس بنا کر بھاگ رہے ہو!

دوسرا برقع پوش: (برقع اُتار کر پھینکتے ہوئے) جی ہاں، اس کی نوبت آگئی ہے۔ کھانے کو آپ نہیں

دیتے، ہتھیار آپ نہیں دیتے، ہمیں لڑنے کا حکم دیتے ہیں، خود انگریزوں کو چھپا چھپا کے خط لکھتے ہیں۔ ہم یہاں ڈٹے رہیں تو انگریز آ کر ہمیں پھانسی دے دے گا، ہم بھاگیں تو آپ پیچھے سے گولی ماردیں گے۔ کل آپ ہی نے تین آدمیوں کو گولی ماری اور دو کو پھانسی دے دی۔ ہم برقع پہن کر نہ بھاگیں تو اور کیا کریں۔

محمد یوسف: تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک ہے۔ تم بھاگ سکتے ہو تو بھاگو، میں پیچھے سے گولی ماروں گا۔ جو مر گیا وہ یہیں پڑا رہے گا، جو زخمی ہوا اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ تمھارا جی چاہے اس طرح بھگوڑوں کی موت مرو، جی چاہے میدان میں مَردوں کی طرح جان دو۔ ہتھیار چاہتے ہو تو کشمیری دروازے کے پاس چھوٹا سا اسلحہ خانہ ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔ وہاں نہ ملیں تو ٹولی بنا کر خود تلاش کرو۔

(برقع پوش سب آہستہ آہستہ برقعے اتارتے ہیں، اور فوجی طریقے پر قطاریں بناتے ہیں۔ پہلا برقع پوش بھی سر سہلاتا ہوا ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر ان میں سے ایک 'مارچ!' کہتا ہے اور سب دائیں طرف سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اسی دوران 'بول کہاروں کی جے!' کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں دس پندرہ کہار لاٹھیاں باندھے تیز تیز چلتے ہوئے بائیں طرف سے داخل ہوتے ہیں۔ محمد یوسف ہاتھ اٹھا کر انھیں روکتا ہے۔ کہار کھڑے ہو جاتے ہیں، اور ذرا تامل کے بعد زور زور سے سلام کرتے ہیں)

محمد یوسف: کہیے، بھئی، آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟

پہلا کہار: جی مورچے پر جا رہے تھے۔

محمد یوسف: کون سے مورچے پر؟

پہلا کہار: اجی یہیں کہیں کسمیری دروازے کی طرف۔

سدھاری سنگھ: یا موری دروازے یا لاہوری دروازے کی طرف۔ آپ سے آخر کہا کس نے ہے کہ

مورچے پر جایئے؟

دوسرا کہار: اجی کہا تو کسی نے نہیں۔ آج کل کام وام تو ہے نہیں۔ ہم کل سام کو بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرر ہے تھے۔ اِتنے میں سلطان نے کہا کہ جی چاہے ہے کسی انگریج کے لاٹھی ماروں، تس پر منگو نے کہا، اجی جاؤ بھی، تم میں اِتنا دل گردہ کہاں ہے کہ انگریج کے سامنے کھڑے ہوکر اس سے آنکھ ملاؤ، تس پر سلطان نے کہا کہ لاؤ کھڑا کردو کسی انگریج کو میرے سامنے، سالے کو ایسا گھور کے دیکھوں گا کہ چکر کھا کے گر پڑے، تس پر ہم سب نے کہا کہ انگریج اس طرح تو ملے گا نہیں، چلو ان کی پلٹن سے کسی کو پکڑ لائیں، تس پر گھسیٹا نے کہا کہ یارو، بڑی سرم کی بات ہے کہ اِتنی بڑی لڑائی ہو گئی اور ہم گھر بیٹھے کھیالی ہاتھ چلاتے رہے، تس پر بدھا نے کہا کہ یارو میں نے سنا ہے کسمیری دروازے کے پاس ایک مورچہ ہے، دس کو اپنی فوج خالی کر کے بھاگ گئی ہے، کل انگریج جرور بالجرور ادھر سے گھسنا چاہیں گے، تس پر منگو نے سلطان سے کہا کہ لو بیٹا سلطان، اب تو نجر کے ساتھ ہاتھ کی طاکت دکھانے کا موکا ہے۔ تس پر ہم سب نے کہا کہ ہاتھ تو ہم بھی دکھا سکتے ہیں، چلو ساتھ کیوں نہ چلیں۔

محمد یوسف: اس لیے آپ سب لڑنے جارہے ہیں۔ ماشاءاللہ۔ آپ کے پاس ہتھیار کیا ہیں؟

دوسرا کہار: اجی ہتھیار ہمارے پاس کیا ہوتے۔ بس یہی لاٹھیاں ہیں۔

سدھاری سنگھ: اور ان سے آپ توپ بندوق کا مقابلہ کریں گے؟

پہلا کہار: ہاں جی کریں گے تو۔ آپ کا جی چاہے چل کے تماسا دیکھ لیجیے۔

دوسرا کہار: اجی اکیلے ہتھیار سے کیا ہوئے ہے۔ ہم تو اپنی پھرتی اور ہسیاری کے بل پے لڑیں گے۔

محمد یوسف: ارے بھئی، کیوں اپنے سر مصیبت لاتے ہو۔ انگریز کا تمھاری لاٹھیوں سے کچھ بگڑے گا نہیں، اور تمھارا شمار باغیوں میں ہو جائے گا۔ انگریز جیت گیا تو سب پھانسی پر لٹکا دیے جاؤ گے۔

چوتھا کہار: اجی اس بکھت جو ہوگا سو ہوگا۔ ابھی تو ہم سب لڑنے جاتے ہیں۔

باقی کہار: 'ٹھیک کہا' 'چلو بھئی بڑھو' 'اجی میرے تو ہاتھ پاؤں چلبلا رہے ہیں' (وغیرہ کہہ کر پھر قطاریں بنالیتے ہیں۔ محمد یوسف ہاتھ کے اشارے سے انھیں جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ کہار جے پکارتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔)

محمد یوسف: کیا حشر ہوگا ان سب کا؟

سدھاری سنگھ: کیا ہوگا؟ یا تو جب گولیاں چلنے لگیں گی تو سب بھاگ کھڑے ہوں گے یا مارے جائیں گے۔

(خاموشی)

محمد یوسف: معلوم نہیں یہ کس مورچے کا ذکر کر رہے تھے۔

سدھاری سنگھ: کہیں یہ برقع پوش سب اسی مورچے کے سپاہی نہ ہوں۔

محمد یوسف: کوئی تعجب نہیں۔

(ایک آدمی دائیں طرف سے داخل ہوتا ہے۔ صورت سے کسی عربی مدرسے کا طالب علم معلوم ہوتا ہے، کمر سے تلوار بندھی ہے۔ محمد یوسف اور سدھاری سنگھ کو دیکھ کر ان کی طرف بڑھتا ہے)

نوجوان: حضرت، آپ صورت سے سپاہی معلوم ہوتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آج کس مورچے پر لڑائی ہوگی؟

محمد یوسف: یہ تو راز کی بات ہے۔

نوجوان: جی..... تو کیا پہلے سے معلوم نہیں ہوتا کہ لڑائی کہاں ہوگی؟

محمد یوسف: جی نہیں۔

نوجوان: جی...... (محمد یوسف اور سدھاری سنگھ دونوں کی طرف شبہے کی نظروں سے دیکھ کر) آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔

سدھاری سنگھ: جی، ہم کبھی کبھی مذاق بھی کرتے ہیں۔

نوجوان: مگر یہ لڑائی تو ایسا معاملہ نہیں ہے جس کے بارے میں مذاق کیا جائے۔

سدھاری سنگھ: کیوں؟

نوجوان: یہ تو دین ایمان، ملک اور قوم کے لیے لڑی جا رہی ہے۔

سدھاری سنگھ: اس لڑائی میں بھی لوگ مرتے ہیں اور زخمی ہوتے ہیں۔ اس میں بھی سپاہیوں کو اگر مذاق کرنے کا موقع ملے تو وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

محمد یوسف: مولانا، آپ خواہ مخواہ سوال کیوں کر رہے ہیں۔ جو کہنا چاہتے ہوں وہ کہیے۔

نوجوان: میں نے رات کو خبریں سنی تھیں کہ سپاہی مورچوں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ رات بھر میں سوچتا رہا کہ مجھے اب تک کچھ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی ہے۔ قیامت کے دن پوچھا گیا کہ تو نے اس جہاد میں حصہ کیوں نہیں لیا تو کیا جواب دوں گا۔

محمد یوسف: اس لیے آپ اٹھے، کوٹھری سے پرانی، زنگ آلود تلوار نکالی، اور جہاد کے لیے نکل پڑے۔

نوجوان: جی ہاں، میں نے تلوار اب تک چلائی نہیں ہے، لیکن سوچتا ہوں کہ دشمن سامنے ہوگا تو جوش میں کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گا۔

محمد یوسف: مولانا، اگر صرف شہادت کا شوق ہے تو یہ زحمت کیوں اٹھایئے۔ انگریزوں نے شہر فتح کر لیا تو وہ خود ہی آپ کی داڑھی دیکھ کر آپ کو پھانسی پر چڑھا دیں گے۔

نوجوان: اچھا، تو کیا جان کا خطرہ بہر حال ہے۔

محمد یوسف: جی ہاں۔

نوجوان: اس صورت میں تو شرح کے مطابق دہلی میں رہنے کے لیے بھی ماں باپ کی اجازت ضروری ہے۔

محمد یوسف: جی ہاں، میں تو آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اپنے وطن جا کر جلد سے جلد دہلی میں رہنے کی اجازت حاصل کر لیجیے۔

(بائیں طرف سے بچوں کے پکار پکار کر بات کرنے کی آواز آتی ہے۔ 'ارے ادھر نہیں، ادھر' 'چلو جلدی چلو' 'جلدی کیا ہے' وغیرہ۔ دس بارہ بچے، جن کی عمر بارہ چودہ برس کی ہے، بائیں طرف سے داخل ہوتے ہیں۔ وہ بچھڑا پلٹن کی وردیاں پہنے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی محمد یوسف اور سدھاری

سنگھ لپک کران کا راستہ روکتے ہیں۔)

محمد یوسف: بچو، تم کہاں جا رہے ہو، کس کی اجازت سے جا رہے ہو؟

ایک بچہ: (بھاگتے ہوئے) ہم کو ہمارے کمانڈر نے موری گیٹ کے پاس حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔
ہمیں جانے دیجیے۔

(اور بچے سب کھڑے ہو جاتے ہیں)

سدھاری سنگھ: وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں لڑائی ہونے والی ہے۔

دوسرا بچہ: اجی آپ کیا جانیں۔ ہم لڑنے ہی تو جا رہے ہیں۔

محمد یوسف: (ڈانٹ کر) تم سے کس نے کہا ہے کہ لڑنے کے لیے جاؤ؟

پہلا بچہ: ہمارے کمانڈر نے۔

محمد یوسف: کون ہے تمھارا کمانڈر؟ اسے ایسا حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے!

دوسرا بچہ: اختیار کیسے نہیں ہے؟ آپ کو ہمیں روکنے کا اختیار کیسے ہے؟

محمد یوسف و سدھاری سنگھ: (ایک ساتھ) ہم تم کو نہیں جانے دیں گے۔

(بچے یہ دیکھ کران کا راستہ روکا جا رہا ہے ایک ساتھ یورش کرتے ہیں۔ اس ترکیب سے کہ دو تین رہ جاتے ہیں، باقی سب نکل جاتے ہیں۔ جو دو تین رہ جاتے ہیں وہ پیچھے کی طرف بھاگتے ہیں، اور پھر چکما دے کر دائیں طرف نکل بھاگتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد نوجوان بھی آہستہ آہستہ اسی طرف چلا جاتا ہے)

سدھاری سنگھ: یوسف بھائی، جس قوم کے بچے اس شوق سے جان دینے کے لیے جائیں......

محمد یوسف: وہ لاکھوں جانیں ضائع جانے پر زندہ رہے گی!

(دونوں تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، پھر دوڑ کر لپٹ جاتے ہیں)

(پردہ)

دوسرا اسین

(وہی جگہ، کوئی دو گھنٹے بعد۔ پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج خالی ہے۔ چاروں طرف سے بندوقیں چلنے کی اور سپاہیوں اور شہریوں کی چیخ پکار کی آوازیں آتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد محمد یوسف بائیں طرف سے آتا ہے، اور آہستہ آہستہ چل کر اسٹیج کے دائیں طرف آجاتا ہے، ادھر ادھر دیکھتا ہے، اور پھر زمین پر بیٹھتا ہے۔ 'بول کہاروں کی جے' کا نعرہ سنائی دیتا ہے تو وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد چھ کہار دائیں طرف سے داخل ہوتے ہیں۔ ایک کہار دو آدمیوں کی مدد سے لکایا جا رہا ہے، سب کے کپڑوں پر خون کے دھبے ہیں، مگر سب بہت خوش ہیں۔ محمد یوسف کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور سلام کرتے ہیں۔ زخمی کہار کانگھ کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔)

محمد یوسف: کہو بھئی، کیا کر آئے۔

پہلا کہار: جی بس آج تو جندگی وصول ہو گئی۔

محمد یوسف: اچھا!

دوسرا کہار: جی بس وہ ہاتھ دکھائے ہیں کہ طبیعت کھس ہوگئی۔

تیسرا کہار: جی ہم مور چہ پر پہنچے ہیں تو ہم نے دیکھا کہ کوئی بیس آدمی فصیل کے اندر گھس آئے ہیں۔

دوسرا کہار: ہم دبک کر آدھے سڑک کی ایک اور، آدھے دوسری اور کھڑے ہوگئے۔ جیسے وہ پاس پہنچے، سلطان نے جھپٹ کر ایک کے منہ پہ ایسی لاٹھی ماری کہ سب اندر بیٹھ گیا۔ سلطان کے ایک نے سنگین ماری، بدھوا نے اسے اپنی لاٹھی پر لے لیا۔ پھر بھیا کیا تھا، ہم بھی کود پڑے۔ گھسیٹا نے تو کمال ہی کر دیا۔ ایک چھلانگ مار کے ایک پیر ایک انگریج کے کندھے پر رکھا، اور وہاں سے اچھل کر دشمن کے پیچھے پہنچ گیا۔ پھر ایک ایسی لاٹھی چلائی کہ دو ایک ساتھ گر گئے۔

پہلا کہار: ہاں جی، ہماری لاٹھیوں کی مار کھا کے ایسی سٹی گم ہوئی کہ سب فصیل کے باہر بھاگ گئے۔ اور وہاں سے گولی چلانا سروع کر دی۔

محمد یوسف: اچھا، اسی وجہ سے اتنے کم واپس آئے ہو۔

تیسرا کہار: ہاں جی، ہم کچھ لوہے کے بنے ہیں کہ گولی لگے تو ٹھپ سے وہیں رہ جائے۔ مگر ہماری لاٹھیوں کے ہاتھ یاد رہیں گے۔

محمد یوسف: اچھا بھئی، جو بچ گئے ہیں وہ دلی چھوڑ کر نکل جائیں۔ نہیں تو اس کارنامے کی داستان سنانے والا کوئی نہ رہ جائے گا۔

دوسرا کہار: جی اب تو چلے ہی جائیں گے۔

(سب جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ زخمی کہار کو اٹھانا چاہتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ مر گیا ہے۔ تین کہار خاموشی سے اس کی لاش کو اٹھاتے ہیں اور اسی خاموشی سے لے کر چلے جاتے ہیں۔ محمد یوسف انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ تھوڑی دیر میں سدھاری سنگھ دائیں طرف سے داخل ہوتا ہے)

سدھاری سنگھ: کیا دیکھ رہے ہو، یوسف بھائی؟

محمد یوسف: وہ کہار جو مورچے پر لڑنے کے لیے گئے تھے، ابھی واپس آئے ہیں۔ ان کا بانکپن غضب

کا ہے۔ آدھے سے زیادہ مارے گئے، مگر بیان یہی کر رہے تھے کہ دشمن کی پلٹن کو کس طرح فصیل کے باہر بھگا دیا۔

سدھاری سنگھ: انھوں نے ایک پلٹن کو بھگا دیا ہوگا، مگر انگریزی فوج کشمیری دروازے کی طرف سے اندر گھس آئی ہے۔ اسے باہر نہ نکالا جا سکے گا۔

محمد یوسف: خیر، یہ آخری وقت بھی گزر جائے گا۔

(بچھڑا پلٹن کے کچھ بچے چپکے چپکے دائیں طرف سے داخل ہوتے ہیں۔ ایک زخمی بچہ دو بچوں کے گلوں میں ہاتھ ڈالے ہے۔ سب کے کپڑوں پر خون کے دھبے ہیں)

زخمی بچہ: (روہانسی آواز میں) بھئی چھوڑ دو مجھے، اب مجھ سے چلا نہیں جاتا۔

دوسرا بچہ: ارے گھبراؤ نہیں، اب قلعہ قریب آ گیا ہے۔ وہاں تمھاری مرہم پٹی ہو جائے گی اور نرم بستر پر لٹا دیا جائے گا۔

زخمی بچہ: ہائے۔

تیسرا بچہ: کہو تو ہم تین چار مل کر تمھیں اٹھا لیں۔

زخمی بچہ: نہیں اس سے اور تکلیف ہوتی ہے۔

(بچے بائیں طرف باہر نکل جاتے ہیں)

محمد یوسف: بس اتنے ہی واپس آئے۔

سدھاری سنگھ: واپس بھی آئے تو کیا۔

(خاموشی۔ دائیں طرف سے ایک سبز پوش عورت لڑکھڑاتی ہوئی اندر آتی ہے۔ محمد یوسف اور سدھاری سنگھ اسے دیکھ کر ایسے بھوچکے رہ جاتے ہیں کہ جگہ سے نہیں ہل پاتے۔ سبز پوش بیچ اسٹیج پر آ کر کھڑی ہو جاتی ہے، مگر معلوم ہوتا ہے وہ دیر تک کھڑی نہ رہ سکے گی۔ محمد یوسف اور سدھاری سنگھ سہارا دینے کے لیے اس کی طرف لپکتے ہیں۔ وہ ہاتھ سے اشارہ کرتی ہے کہ الگ رہیں۔ پھر کانپتے ہاتھوں سے چادر ہٹاتی ہے۔ چہرہ کھلتا ہے تو پتہ چلتا

ہے کہ یہ منی ہے۔ اس کے سینے پر دو بڑے بڑے خون کے دھبے ہیں)

منی: (مسکرا کر) یوسف میاں، اب میرا کام ختم ہوگیا نا؟...... میں نے زخموں کو دیکھنے کے لیے بھی سر نہیں جھکایا۔

(منی کے چہرے پر مسرت کی ایک عجیب کیفیت، آنکھوں میں بجلی کی سی چمک نظر آتی ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے محمد یوسف کا ایک ہاتھ، دوسرے سے سدھاری سنگھ کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے، اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، اور وہ آہستہ آہستہ، بڑے حسین انداز سے زمین پر گر جاتی ہے۔ محمد یوسف اور سدھاری سنگھ اسے ٹھیک سے لٹا کر سبز چادر اڑھا دیتے ہیں، پھر اس کے پیروں کی طرف کھڑے ہو کر فوجی سلام کرتے ہیں۔ وہ اسی طرح خاموش کھڑے ہوتے ہیں جب بخت خاں تین سپاہیوں کے ساتھ دائیں طرف سے اندر آتا ہے۔ اس منظر کو دیکھتے ہی وہ تینوں سپاہیوں کو چپکے سے کچھ حکم دے کر روانہ کر دیتا ہے، اور خود دائیں طرف کھڑا ہو کر فوجی سلام کرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ محمد یوسف اور سدھاری سنگھ کی طرف آتا ہے اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔)

بخت خاں: ہمری آنکھیں یہو دیکھن۔ جی کا یہ دولت مل گئی او کا انگریج کچھ چھین سکت ہیں۔

(دو سپاہی ایک چار پائی لے کر آتے ہیں۔ تیسرا دو برقع پوش عورتوں کو ساتھ لاتا ہے۔ وہ منی کی لاش کو اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیتی ہیں، اور پھر پورے پلنگ کو سبز چادر سے ڈھک دیتی ہیں۔ دو سپاہی پلنگ کو اٹھا کر بائیں طرف لے جاتے ہیں۔ ایک سپاہی پلنگ کے برابر چلتا ہے)

بخت خاں: ہاں بھیا، تم تینوں چلو، ہم ابہن آوت ہیں...... (محمد یوسف اور سدھاری سنگھ سے) ہم تم دونوں کا ڈھونڈھت رہن۔ تم کا حال تو معلوم ہوئی گوا ہوئی ہے۔ بڑھؤ سہر چھوڑ کے بھاگ گئے ہیں۔ ان کی مہریا اور ان کے حکیم صاحب ان کے ساتھ ہیں۔ ہمایوں کے مکبرے ماں جائی کے پڑاؤ ڈالن ہے۔ نہ معلوم کا مجھت ہین کہ ہواں ان کا کو بچائی لے

ہے...... ہمراجی تو یو چاہت ہے کہ اب کوئی طر پھ نکل جان۔ بریلی، ساہ جہاں پور، گوالیر ماں ابہن مکابلہ کرے کا موکع ہے، سائد بڑھوؤ ساتھ چلے پر راجی ہوئی جائیں۔ کہو، تمری کا رائے ہے؟

محمد یوسف: جنرل صاحب، میں تو یہیں رہوں گا۔ ڈر لگتا ہے کہ دہلی چھوڑا تو ممکن ہے جان بچ جائے، اور اب جان کے ساتھ اتنی تکلیفیں ہوں گی کہ برابر موت کی آرزو کرتا رہوں گا۔

بخت خاں: بھیا، ای تو کھود کسی ہوئے۔ ای کی ہمرے مجہب ماں اجاجت نہیں ہے۔ پھی یہو بتاؤ، تمری لڑائی انگریج سے رہے کہ اپنی جان سے۔

محمد یوسف: میری لڑائی انگریز سے تھی، اور اب جیتنے کی یہی صورت باقی ہے کہ میں اپنی جان دے دوں۔

بخت خاں: بھیا، یہ تو تم بہت گہری بات کہہ گئے ہو۔ ای کا ہمرے پاس کوؤ جباب ناہیں ہے۔ مُل یہو سوچو، دلی کے باہر لڑی ہو جیہوں انگریج سے لڑی ہو۔ جان دے کا تو ہوؤں موکع رہی ہے۔

محمد یوسف: (سوچ کر) جی ہاں، جنرل صاحب، یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر میری طبیعت نہیں مانتی۔

بخت خاں: تیئں اپنی طبیعت کا اور سمجھاؤ...... اور تم بیٹا سدھاری۔

سدھاری سنگھ: میں آپ کا ماتحت ہوں، جو آپ کا حکم ہوگا کروں گا۔

بخت خاں: مل جی یہی چاہت ہے کہ یوسف بھائی کے ساتھ رہو؟

سدھاری سنگھ: جی ہاں۔

بخت خاں: (سر ہلا کر) یہو عجیب بات ہے۔ دوئی ادمین کے ملے سے دوئی عکلیں ناہیں ہوئی جات ہیں۔

محمد یوسف: جنرل صاحب، عقل سے جو کچھ کرنا تھا وہ ہم کر چکے۔ ہماری عقل ہار گئی، انگریز دلی فتح کر رہے ہیں۔ اب تو یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا دل کیا کر سکتا ہے۔

بخت خاں: بھیا سچ سچ بتاؤ، کا تمری اَکل کبھوں تم کا یو بتائس رہے کہ انگریج دلی فتح نہ کر سکی ہیں؟

محمد یوسف: (سوچ کر) جی نہیں۔

بخت خاں: وہودل کی بات رہے۔ہم جو کہت ہن یہودل کی بات ہوئے۔
محمد یوسف: جنرل صاحب، آپ دہلی کے نہیں ہیں، آپ دہلی کو چھوڑ سکتے ہیں۔
بخت خاں: تو کا تم ای سہر کے لیے، ای بڑھوا کے لیے لڑت رہو؟
محمد یوسف: (سوچ کر) جی نہیں۔
بخت خاں: تو پھر بھیا؟

(محمد یوسف کوئی جواب نہیں دیتا۔ بخت خاں کبھی اس کی، کبھی سدھاری سنگھ کی طرف دیکھتا ہے۔ ایک سپاہی بائیں طرف سے اندر آتا ہے اور بخت خاں کو دیکھ کر سلام کرتا ہے)

سپاہی: حضور، ہمایوں کے مقبرے جانے کے لیے سواری تیار ہے۔
بخت خاں: اچھا بھیا۔

(وہ پھر محمد یوسف اور سدھاری سنگھ کی طرف دیکھتا ہے۔ ان کے چہرے کاٹھ کے معلوم ہوتے ہیں۔ بخت خاں اٹنشن کھڑا ہو جاتا ہے۔ محمد یوسف اور سدھاری سنگھ دونوں تن کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سلام کرتے ہیں۔ بخت خاں سلام لیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بائیں طرف جاتا ہے۔ نظروں سے اوجھل ہونے سے پہلے وہ پھر مڑ کر بڑی محبت کی نظروں سے محمد یوسف اور سدھاری سنگھ کو دیکھتا ہے۔ یہ ویسے ہی تنے کھڑے رہتے ہیں۔)

(پردہ)

پانچواں ایکٹ

(رام سہائے مل کے مکان میں ایک چھوٹا سا دالان۔ رات ہو گئی ہے۔
ڈیوٹ پر ایک دیا جل رہا ہے، رام سہائے مل اس کی روشنی میں کھانا کھا رہا
ہے۔ بھاگوتی، اس کی بیوی، آنچل سے منہ بند کیے کھڑی ہے، اس کے
پنکھا جھل رہی ہے اور چپکے چپکے رو رہی ہے۔ رام سہائے مل کو اس کے
رونے کا احساس نہیں ہے، اور وہ کھانا کھاتا رہتا ہے۔)

رام سہائے مل: کہو، آج پانی کافی مل گیا؟

بھاگوتی: (روہانسی آواز میں) ہاں، ابھی شام کو رام پرشاد لے آیا۔ بہت دور جانا پڑا، آس پاس کے کنوؤں میں لاشیں پڑی ہیں۔

رام سہائے مل: رام رام، رام رام...... (اس کی طرف دیکھ کر) مگر تم رو کیوں رہی ہو؟

بھاگوتی: میرا بھی مر جانے کو جی چاہتا ہے۔

رام سہائے مل: کیوں، تم کیوں بیٹھے بیٹھے جان سے بیزار ہو گئی ہو؟

بھاگوتی: کیا بتاؤں۔

رام سہائے مل: پرماتما کا شکر کرو۔ اتنی بڑی مصیبت آئی اور گزر گئی۔

بھاگوتی: ہاں۔

رام سہائے مل: مگر ابھی بہت چوکس رہنا ہے۔ دیکھتی رہنا، دروازے سے پہرے والے نہ ہٹیں۔

بھاگوتی: نہیں، میں تو برابر چکر لگاتی رہتی ہوں۔

رام سہائے مل: اور کوئی اندر نہ آنے پائے، مرد، عورت، بچہ۔

بھاگوتی: یہ نہیں ہوسکتا۔

رام سہائے مل: کیوں؟ کیا مجھے پھانسی پر لٹکوانا چاہتی ہو؟

بھاگوتی: نہیں، قصور ہوگا تو میرا ہوگا، میں کہہ دوں گی کہ میں نے آپ کو بتائے بغیر کیا ہے۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ جان پہچان کی کوئی عورت یا بچہ پناہ مانگے اور میں اسے پناہ نہ دوں۔

رام سہائے مل: (بھاگوتی کو دیر تک غور سے دیکھ کر) معلوم ہوتا ہے تم نے مجھے بتائے بغیر کسی کو گھر میں چھپا لیا ہے۔ اب تو ہماری جان پرماتما کی دیا سے ہی بچ سکتی ہے...... تمھارا دل اتنا کمزور ہے تو تم مجھے کیوں نہیں بلا لیتی ہو؟

بھاگوتی: میں چاہتی ہوں کہ آپ کو معلوم ہی نہ ہو۔

رام سہائے مل: یہ کون مانے گا کہ میرے گھر میں آدمی چھپے ہیں اور مجھے معلوم نہیں؟

بھاگوتی: آدمی نہیں، لاوارث عورتیں، بھوکے، پیاسے بچے!

رام سہائے مل: کس کی عورتیں؟ کس کے بچے؟

بھاگوتی: یہ میں پوچھتی ہی نہیں ہوں۔

رام سہائے مل: یا پوچھا ہے اور مجھے بتانا نہیں چاہتی ہو۔ ہمارے محلے میں ایسے لوگ ہیں ہی نہیں جنھوں نے بغاوت میں حصہ لیا ہو۔ یہ عورتیں اور بچے تو باہر سے آئے ہوں گے۔ (بھاگوتی زمین پر بیٹھ کر اور اپنا منہ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) بتاؤ تو یہ ہیں کون؟ کبھی پوچھ تاچھ ہو تو میں جواب تو دے سکوں۔ (بھاگوتی سر ہلاتی ہے) اچھا، نہ بتاؤ۔ (خاموشی) جب لڑائی ہو رہی تھی تو تمھاری زبان پر تین چار نام رہا کرتے تھے...... بخت خاں کی آل اولاد یہاں تھی ہی نہیں، سدھاری سنگھ بھی باہر کا آدمی ہے...... کیا کسی

مسلمان عورت کو پناہ دی ہے؟ ...... ہندو عورتوں میں تو تمھارے رانی کشن کنور سے تعلقات تھے۔ نہار سنگھ روپیہ وصول کرنے آنا چاہتا تو زمین تیار کرنے سے پہلے اسی کو بھیجتا تھا...... مگر کیا معلوم رانی بلبھ گڑھ میں ہے یا یہاں۔ بہر حال، جہاں بھی ہو، کوئی نہ کوئی اس کا پتہ دے گا ضرور...... اگر نہار سنگھ کو پکڑ لیا ہے تو شاید اس کو تلاش نہ کریں۔

بھاگوتی: پکڑ لیا ہے! (پھر زور سے روتی ہے)

رام سہائے مل: پکڑ لیا ہے، اب کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے برابر سونا دے کر اسے مول لینا چاہتا ہو تو نہ دیں گے...... تو رانی کشن کنور نے تمھارے یہاں پناہ لی ہے...... بے چاری! (رام سہائے سے اب اور کھایا نہیں جاتا۔ برتن سامنے سے کھسکا دیتا ہے۔ پانی پینا چاہتا ہے مگر پیالہ دیر تک ہاتھ میں لیے رہتا ہے اور پی نہیں پاتا) کیا بہت رو رہی ہے؟

بھاگوتی: (سر ہلا کر) نہیں۔ اس کا افسوس کر رہی ہے کہ جہادی عورتوں کے ساتھ میدان میں نہیں گئی اور ماری نہیں گئی۔

رام سہائے مل: رام رام۔ کیا ہمت ہے! اس کو اچھی طرح رکھنا۔ میں بھی کبھی اس کے درشن کروں گا...... اس کا ہمارے گھر میں رہنا کچھ ایسا خطرناک نہیں ہے۔ مسلمان عورت کی بات اور ہے۔

بھاگوتی: ایک مسلمان، بہن بھی ہے۔

رام سہائے مل: ہائے! کون؟

بھاگوتی: سلمیٰ۔

رام سہائے مل: ارے وہی یوسف میاں کی منگیتر؟ وہ تو مورچوں پر لڑی بھی تھی۔

بھاگوتی: ہاں وہ اس نے گھروں کی چھتوں پر سے بھی گولی چلائی۔ رانی کشن کنور بھی اس کے ساتھ بندوق چلا رہی تھیں۔ پھر وہ زخمی ہو گئی۔ رانی کشن کنور نے نہ جانے کس طرح اس کو یہاں پہنچایا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ مر جائے گی، مگر اب بھلی چنگی ہے۔ سوچ رہی ہے کہ کسی طرح دلی سے نکل جائے اور بخت خاں کی فوج سے مل جائے۔ رانی کشن کنور کہتی ہیں کہ وہ بھی ساتھ جائیں گی۔

رام سہائے مل: دیکھو، یہ نہیں ہوسکتا۔ میں اس پر تیار ہوں کہ وہ یہاں چھپی رہیں، اور جب خطرہ نہ رہے تو چپکے سے چلی جائیں۔ یہاں وہ سال بھر تک رہیں، مگر باہر جا کر پھر کہیں لڑائی میں شریک ہوئیں تو تم پکڑی جاؤ گی، اور مجھے تو ضرور پھانسی ہو جائے گی......اور یوسف میاں کو کیا ہوا؟

بھاگوتی: سلمٰی کو کچھ معلوم نہیں۔

رام سہائے مل: اور تم کو معلوم ہوگا تو بتاؤ گی نہیں۔

بھاگوتی: سنا ہے وہ آخر وقت تک لڑتے رہے۔ اردو بازار میں کسی گورے نے ایک عورت کے ساتھ بدتمیزی کی تھی تو اسے جان سے مار دیا۔ اس میں نہ معلوم کتنے پکڑے گئے، مگر وہ نہیں تھے۔ کہتے ہیں اب اردو بازار پر گولہ باری ہوگی۔ ایک مکان بھی کھڑا نہ چھوڑا جائے گا۔

رام سہائے مل: اب پرماتما بچائے ہم سب کو۔

(ایک عورت گھبرائی ہوئی اندر آتی ہے۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی، پھر ایک ملازم آتا ہے)

ملازم: سرکار، دروازے پر چار سپاہی آئے ہیں۔ کہتے ہیں دروازہ کھولو، ہم تلاشی لیں گے۔

رام سہائے مل: میرے گھر میں نہیں آسکتے۔ میرے پاس امان کا پروانہ ہے۔

ملازم: سرکار وہ ہماری بات نہیں مانیں گے۔

بھاگوتی: پروانہ میرے پاس ہے۔ چلو میں دکھادوں گی۔

رام سہائے مل: تم کہاں جاؤ گی؟

بھاگوتی: میں نہیں جاؤں گی تو اور کون جائے گا؟ میں نے مشہور کر دیا ہے کہ آپ انگریز کمانڈروں سے بات چیت کر رہے ہیں، گھر پر نہیں ہیں۔

رام سہائے مل: نہیں، تم بیٹھو، میں جاتا ہوں۔

(بھاگوتی جلدی سے دیا بجھا کر باہر بھاگ جاتی ہے۔ رام سہائے مل اندھیرے میں بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد دائیں طرف سے بھاگوتی الٹے پاؤں چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چار سپاہی اسے سنگینوں سے دھکار رہے ہیں۔)

پہلا سپاہی ان کا سردار معلوم ہوتا ہے)

پہلا سپاہی: بتا کہاں ہیں وہ دونوں!

بھاگوتی: (سہمی ہوئی، روہانسی، مگر بہت دبی آواز میں) یہاں کوئی نہیں چھپا ہے۔

پہلا سپاہی: یہاں دو عورتیں چھپی ہیں۔ ہمارے آدمیوں نے ان کو گولی چلاتے دیکھا، پھر وہ بھاگ کر اس گھر میں آتے ہوئے دیکھی گئیں۔ رام سرن، اس عورت کو لے جا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کرو۔ باقی تین آدمی فیر کرو۔

(رام سرن بھاگوتی کی طرف بڑھتا ہے)

رام سہائے مل: ارے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی؟ ایک بے قصور عورت کو اس طرح مار رہے ہو!

پہلا سپاہی: اچھا، لالا جی چھپے بیٹھے تھے، سوچا تھا للائن ہم کو بہلا پھسلا کر رخصت کر دے گی! رام سرن، کھڑا کرو انھیں للائن کے ساتھ!

بھاگوتی: (چلا کر) ارے مجھے مار ڈالو، انھیں چھوڑ دو! یہ بالکل کچھ نہیں جانتے! ارے یہ بالکل بے قصور ہیں!

پہلا سپاہی: اچھا، یہ بے قصور ہیں تو تمھیں تو معلوم ہے کہ دونوں عورتیں کہاں چھپی ہیں۔

بھاگوتی: (ویسے ہی چلا کر) ارے انھیں چھوڑ دو! ہائے میری قسمت! یہ بالکل کچھ نہیں جانتے! ہائے! ہائے!

(اسٹیج کے دائیں طرف کے کونے سے سلمٰی اور کشن کنور اندر آتے ہیں)

سلمٰی: ان دونوں کا پیچھا چھوڑ دو۔ ہم آگئے ہیں۔ ہمیں جو سزا چاہو دے دو۔ سیٹھ صاحب اور ان کی بیوی بالکل بے قصور ہیں۔

پہلا سپاہی: (سلمٰی اور کشن کنور کو غور سے دیکھنے کے بعد) مجھے تو تم اسی گھرانے کی عورتیں معلوم ہوتی ہو۔

کشن کنور: ان دونوں کو چھوڑ دو۔ ہم تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ شہر میں ہزاروں آدمی ہم کو پہچان لیں گے۔

پہلا سپاہی: ہاں، میں تم کو لے کر باہر چلا جاؤں، اور اس دوران اصلی مجرم نکل جائیں۔

سلمٰی: تمھاری مرضی۔ بے گناہوں کا خون کرنا تو تمھارا کام ہی ہے۔

پہلا سپاہی: اچھا تو بتاؤ، کیا نام ہیں تمھارے؟

سلمٰی: سلمٰی۔

کشن کنور: کشن کنور۔

پہلا سپاہی: تم اپنے جرم کا اقبال کرتی ہو۔

سلمٰی: ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم اپنے ملک کے لیے، اپنے بادشاہ کی طرف سے لڑے ہیں۔

پہلا سپاہی: تم لڑائی میں شریک ہوئی ہو؟

سلمٰی: دل و جان سے۔ ہم شریک ہوئے، ہم نے دوسروں کو لڑنے پر آمادہ کیا، ہم مورچوں پر لڑے، ہم نے دشمنوں کو مارا۔

کشن کنور: ہمیں افسوس اس کا ہے کہ اس سے زیادہ نہ کر سکے۔

پہلا سپاہی: تو جاؤ کھڑی ہو جاؤ دیوار سے لگ کے۔

سلمٰی: ہم دیوار سے لگ کے کیوں کھڑے ہوں؟ ہم بیچ صحن میں کھڑے ہوں گے۔ اور تمھاری بندوقوں پر ہنسیں گے۔

پہلا سپاہی: چلو، تو کھڑی ہو جاؤ اسی بات پر۔

(سلمٰی اور کشن کنور بیچ صحن میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ پہلے سپاہی کے اشارے پر تین سپاہی ان سے تین چار قدم ہٹ کر اور ایک گھٹنے کو زمین پر ٹیک کر بندوقیں تانتے ہیں۔ بھاگوتی چیخ مار کر سپاہیوں اور دونوں عورتوں کے بیچ میں آ جاتی ہے، مگر غش کھا کر گر پڑتی ہے۔ سپاہی بندوقیں تانے رہتے ہیں، مگر انھیں فائر کرنے کا حکم نہیں ملتا۔ سلمٰی کے چہرے پر مسکراہٹ ہے، اور وہ بندوقوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ کشن کنور کی نظر آسمان کی طرف ہے، اس کے چہرے پر وجد کی کیفیت ہے۔ سپاہی فائر نہیں کرتے۔ ایک بارگی پہلا سپاہی گھٹنوں پر گر جاتا ہے۔)

پہلا سپاہی: (ہاتھ جوڑ کر) ہماری خطا معاف کیجیے۔ ہم صرف اس کا یقین کرنا چاہتے تھے کہ آپ وہی ہیں جنھیں ڈھونڈھ کر لانے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا۔

(تقدیر کے اس انقلاب کو برداشت کرنا سلمیٰ اور کشن کنور کے بس میں نہیں۔
کشن کنور چیخ مار کر گر پڑتی ہے، سلمیٰ کی آنکھیں چڑھ جاتی ہیں، ہاتھ پاؤں
جواب دے دیتے ہیں اور وہ زمین پر ڈھیر ہو جاتی ہے)

رام سہائے مل: ظالمو، اب کب تک ان بے چاریوں کو ستاؤ گے؟ ارے مارنا ہے تو ایک دفعہ مار دو!

پہلا سپاہی: (انتہائی ندامت کے انداز میں) ہم انھیں تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے، ان کے دل کی آرزو پوری کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں جنرل بخت خاں نے انگریزی فوج کی وردیاں پہنا کر بھجوایا ہے کہ انھیں جلد سے جلد تلاش کر کے ان کے پاس پہنچا دیں۔ ہم نے ان کو صحیح سلامت نہ پہنچایا تو ہمارے گولی ماردی جائے گی۔ یا انگریز ہمیں پکڑ کر پھانسی دے دیں گے۔

(بھاگوتی اس دوران اٹھ کھڑی ہوتی ہے، اور کشن کنور اور سلمیٰ کے منہ پر پانی
کے چھینٹے دیتی ہے اور ان کے سر سہلاتی ہے)

بھاگوتی: اٹھو پیاری، تمھارے بخت خاں نے تمھیں بلایا ہے۔ اپنے پیاروں کا بدلہ لو، اپنے ملک کی آبرو بڑھاؤ!

(آہستہ آہستہ سلمیٰ اور کشن کنور کو ہوش آتا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھتی ہیں بھاگوتی
انھیں پانی پلاتی ہے)

پہلا سپاہی: آپ سے پھر آپ کے قدموں پر گر کر معافی مانگتا ہوں (سلمیٰ اور کشن کنور مسکرا دیتی ہیں) مگر ابھی ایک اور گستاخی کرنا ہے۔ ہم آپ کو شہر کے باہر صرف قیدی بنا کر لے جا سکتے ہیں۔ ہمیں آپ کی مشکیں کسنا ہوں گی اور گلے میں رسیاں باندھنا۔

(سلمیٰ اور کشن کنور ایک دوسرے کی طرف دیکھتی ہیں، پھر دونوں کھڑی ہو جاتی
ہیں۔ سپاہی جلدی جلدی ان کی مشکیں کستے ہیں، اور گلے میں پھندا ڈالتے
ہیں۔ پھر ایک سپاہی آگے، دو پیچھے اٹنشن ہو جاتے ہیں۔ پہلا سپاہی روانگی کا
حکم دیتا ہے۔ کہیں دور سے 'جن گن من' کا ترانہ سنائی دیتا ہے۔)

(پردہ)

پروفیسر محمد مجیب کی شناخت ایک مورخ، معلم اور دانشور کی حیثیت سے ہے۔ تاریخ ان کا خاص موضوع ہے مگر اردو ادبیات کے باب میں بھی ان کی خدمات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ انھوں نے ادب وثقافت پر مضامین کے علاوہ افسانے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ تراجم اور اصطلاحات سازی میں بھی ان کا اہم رول رہا ہے۔ انگریزی، روسی، فرانسیسی اور جرمن جیسی زبانوں سے واقف پروفیسر محمد مجیب نے نہ صرف ان زبانوں کے ڈراموں کا مطالعہ کیا ان سے متاثر بھی ہوئے۔ اردو میں ڈرامہ پر تنقید لکھی اور طبعزاد ڈرامے بھی تحریر کیے جن میں 'حبہ خاتون'، اور 'خانہ جنگی' کو خاصی شہرت ومقبولیت ملی۔
پروفیسر محمد مجیب کی وابستگی جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے ادارے سے تھی جہاں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین اور سید عابد حسین کے ساتھ مل کر جامعہ کی نہ صرف خدمت کی بلکہ اسے سنوارا بھی۔ وہ 25 سال تک جامعہ ملیہ میں وائس جانسلرشپ کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ حکومت ہند نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''پدم بھوشن'' سے سرفراز کیا تھا۔

اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد کاظم شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ڈراما اور تھیٹر ان کی تحقیق وتنقید کا نہ صرف خاص میدان ہے بلکہ اس سے ان کی عملی وابستگی بھی ہے۔ انھوں نے اردو ڈرامے اور اسٹیج کو خاص طور سے اپنے مطالعے کا موضوع بنایا۔ ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی میں بھی ڈرامے پر ہی کام کیا۔ ڈاکٹر کاظم کی کئی تحریریں، مقالات اور کتابوں کی صورت میں اس سے قبل بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کتابوں میں ''آجکل کے ڈرامے، ہندوستانی نکڑ ناٹک اور اس کی سماجی معنویت، بنگال میں اردو نکڑ ناٹک'' کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

IBN 978-93-5160-089-3
9 789351 600893

NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی-110025

قیمت -/197 روپے